حصہ دوم
الف اللہ
WWW.PDFBOOKSFREE.PK
اور
انسان
قیصرہ حیات

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

حصہ دوم

(۱۳)

روشنی چار سال بعد ملک واپس لوٹی تھی...... اس نے پیرس میں اپنے بڑے بھائی اور باپ کے پاس قیام کر کے آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی...... وہاں وہ ایک یونیورسٹی میں لیکچر بھی دیتی تھی...... جاب کے علاوہ اس کا ذاتی اسٹوڈیو بھی تھا...... اس کی پینٹنگز اچھا بزنس کرتی تھیں...... مگر اس کا دل ہر وقت مضطرب رہتا...... اس کی دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اس کی ماں ہر وقت اس کے بارے میں پریشان رہتی...... انہوں نے روشنی کے باپ اور بھائی کو اصرار کر کے روشنی کو ملک واپس بھیجنے کو کہا...... تاکہ وہ اس کی شادی کر سکیں...... ملک واپس لوٹتے ہی ماضی کا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی مانند نظروں کے سامنے گھومنے لگا...... شہیر...... اور شہیر سے وابستہ یادیں...... اور باتیں...... وہ تو کسی بھی بات کو وہاں رہ کر نہیں بھول پائی تھی۔ شہیر تو ہر لمحہ...... ہر پل اس کے اندر اس کے خون کے ساتھ گردش کرتا تھا...... شہیر کو بھلانا اس کے بس سے باہر تھا۔ ہر صبح کا آغاز ہوتے ہی وہ یاد آتا تھا اور رات کو نیند کی وادی میں جانے سے پہلے وہ اس کی آنکھوں میں خواب کی صورت سماجاتا...... مگر...... وہ اسے کبھی نہیں مل پائے گا...... اس کا اسے یقین تھا...... اور اس سے کبھی ملاقات ہو پائے گی...... اس کی اسے امید نہیں تھی...... وہ اپنی یادوں کے ساتھ پیرس میں شب و روز گزار رہی تھی...... شہیر سے یکطرفہ محبت کے سنگ...... اس کا زندگی سے اعتبار اٹھ چکا تھا...... اور اس سے بڑھ کر محبت پر سے...... اسے ہمیشہ یہ یقین رہا تھا...... کہ جذبوں کی شدت اور سچائی قدرت کے فیصلوں کو بھی بدل سکتی ہے مگر قدرت نے اس کے جذبوں کی سچائی کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے لئے کچھ بھی نہ بدلا...... نہ اس کی قسمت...... نہ اس کی زندگی...... وہ کس طرح کسی پر اعتبار کرتی...... اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

وہ کتنا روئی تھی...... رات رات بھر...... مگر کسی کو اس کے آنسوؤں پر رحم نہ آیا تھا...... وہ بے سود بہتے رہے اور وہ بے کار انہیں بہاتی رہی۔

وہ رات رات بھر خدا سے فریاد کرتی رہی...... گڑگڑاتی رہی...... مگر کسی نے پلٹ کر اسے کوئی جواب نہ دیا...... اس کی محبت اتنی کمزور نکلی کہ وہ کسی کے دل میں نہ اپنی جگہ بنا سکی...... نہ کسی کے دل کو اپنی طرف مائل کر سکی...... وہ اس قدر بے وقعت ثابت ہوئی کہ شہیر نے نظر بھر کر بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا اور اس کی محبت کو روند کر چلا گیا...... مگر وہ پھر بھی ایک انمٹ نقش اس کے اندر چھوڑ گیا...... وہ اس کی یاد کو اپنے نگار دل کے خانوں میں محفوظ کرتی رہی...... شب تنہائی میں اپنی آہوں اور سسکیوں سے اس کو تازہ کرتی رہتی...... مگر اتنے شکوے اور شکایتیں کرنے کے باوجود بھی محبت اس کے دل سے نہ تو مر سکی اور نہ ہی مٹ سکی......

روشنی کے گھر آتے ہی اس کی ماں کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی...... مگر روشنی کسی بھی رشتے کے لئے راضی نہیں تھی...... اس کی ماں اور اس کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔

''میں وجہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم شادی سے کیوں انکار کر رہی ہو؟'' اس کی ماں نے ایک روز تنگ آ کر پوچھا۔

''میں شادی کی ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتی'' اس نے بات ٹالنا چاہی۔

''کیا تمہیں قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں سے اختلاف ہے'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... شاید قدرت بھی یہی چاہتی ہے'' اس نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''قدرت کبھی ایسا نہیں چاہ سکتی...... تم اپنی بے معنی اور بے سروپا باتوں کو قدرت کے کھاتے میں مت ڈالو'' اس کی ماں خفگی سے بولیں۔

''دلوں میں محبت اور نفرت کون ڈالتا ہے؟'' اس نے پوچھا تو اس کی ماں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو......؟'' اس کی ماں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

روشنی نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی مگر وہ زباں سے کچھ نہ بولی۔

''اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو...... تو اس سے بات کرو...... میں تمہاری شادی اس سے کروں گی'' ماں نے کہا جوابا وہ پھر خاموش رہی۔

''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتی......؟'' ماں غصے سے بولی۔

''کسی کے دل کو محبت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''روشنی...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو......؟ کسی سے محبت بھی کرتی ہو اور اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی'' ماں نے زچ ہو کر کہا۔

''کیا بات کروں؟ کیا اس سے یہ کہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرے اور جواب میں وہ یہ کہے کہ نہیں...... میں تمہاری عزت تو کر سکتا ہوں...... مگر...... محبت نہیں...... پھر میرے پاس کہنے کو کیا رہ جائے گا...... میرا بھرم ٹوٹ جائے گا...... میری عزت نفس اور میری انا سب کچھ ختم ہو جائے گی'' روشنی سسکیاں بھرنے لگی۔

''اگر تم یہ سب کچھ نہیں کر سکتی...... تو پھر مجھے کچھ کرنے دو...... میں اپنی مرضی سے جہاں چاہوں تمہاری شادی کر دوں'' اس کی ماں نے قطعیت سے کہا۔

''یہ...... بھی ناممکن ہے...... میرا دل اس کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گا'' وہ بے بسی سے بولی۔

''یہ وقتی باتیں ہیں...... جب انسان کسی رشتے بندھن میں بندھ جاتا ہے تو پھر اسے بہت سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں...... رشتے نبھانے کے لئے وہ خود بخود ناممکن کو ممکن بنا لیتا ہے'' اس کی ماں نے اس کو سمجھایا۔

''میں کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی اور پلیز آپ مجھے اس کے لئے مجبور مت کریں...... میں آپ کو کبھی بھی کسی بھی بات کے لئے الزام نہیں دوں گی...... میں نے ایک یونیورسٹی میں جاب کے لئے اپلائی کیا تھا...... مجھے جاب مل رہی ہے، ایک ہفتے تک میں یہاں سے چلی جاؤں گی......'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کہاں......؟'' اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''دوسرے شہر میں......'' ''آپ سے دور...... مگر اسی ملک میں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا...... تو اس کی ماں بے بسی اور خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆

حرا اور شہیر کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے......مگر دونوں کا رشتہ ایک انچ آگے نہیں بڑھ پایا تھا......وہ حرا سے نہ نفرت کرتا تھا......اور نہ ہی محبت......اور......حرا بھی اس سے نہ محبت کر پائی تھی اور نہ نفرت......کیونکہ حرا اور شہیر کے درمیان "سمیر" حائل تھا جبکہ شہیر اور حرا کے درمیان "زل" ہر لحہ......ہر وقت موجود رہتی تھی......دونوں کے درمیان کوئی بھی شبیہ ایک انچ پیچھے نہ ہٹی تھی......اور نہ ہی شاید وہ خود انہیں ہٹانا چاہتے تھے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے لئے کسی نہ کسی شبیہ کو اپنے درمیان سے ہٹانا پڑتا تھا......مگر دونوں کے تعلقات ان ہیولوں سے اتنے گہرے اور مضبوط تھے کہ ان کا رشتہ کمزور ہو گیا تھا......

سمیر نے حرا کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی......وہ شادی کر کے حرا کو مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حرا کی آنکھوں میں یہ شکوہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے جہنم میں ڈال کر وہ خود خوشحال زندگی گزار رہا ہے......ممی......اسے کئی بار مجبور کرتیں مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا......ممی نے ایک دو بار حرا سے کہا کہ وہ اسے شادی کے لئے کہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا......کہ وہ کسی کو......کسی بھی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتی......ہر ایک کی اپنی زندگی ہے......اور جیسے وہ چاہتا ہے......اپنی زندگی گزارے......ممی اس کی بات سن کر خاموش ہو جاتیں......مگر حرا کا دل اندر سے مطمئن تھا......اور وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ سمیر شادی کیوں نہیں کر رہا......وہ شادی کر کے حرا کو ذہنی اذیت نہیں دینا چاہتا......اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے' وہ مطمئن ہو کر سوچتی......اسے شہیر سے دو باتوں کا شکوہ تھا......ایک اس کی شراب نوشی اور دوسری......اس کی ذات کی نفی کا......اس نے جب حرا کو قبول ہی نہیں کیا تھا تو وہ اس سے کیا شکوہ کرتی......شکوہ کرنے کے لئے بھی اپنی اپنائیت اور دوسرے کی چاہت کو دیکھنا پڑتا ہے......اور جہاں نہ اپنائیت ہو......نہ چاہت نہ محبت......نہ کوئی وابستگی تو وہاں شکوہ کرنا بے معنی ہے......سوائے الفاظ کے زیاں کے......اور......کچھ نہیں......اس لئے وہ نہ تو اس سے کوئی شکوہ کرتی......نہ کوئی اظہار......نہ کوئی اقرار......بس خاموش رہتی۔

شہیر کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا......کہ اس کے اور زل کے درمیان ارسلان حائل ہے......اگر ارسلان نہ ہوتا تو زل اس سے ضرور شادی کرتی......وہ ارسلان سے شدید نفرت کرنے لگا تھا......زل کا کسی بھی بات میں کوئی قصور نہیں......اب بھی اگر ارسلان ان دونوں کے درمیان سے ہٹ جائے تو زل اس کی ہو گی......زل کی محبت کو وہ کسی بھی پل اپنے دل سے فراموش نہیں کر پایا تھا......وہ ہمیشہ کی طرح اس کے اندر ہر لحہ ہر پل موجود رہتی......وہ تنہائی میں اس سے سرگوشیاں کرتا......اپنے دل کی ہر بات اس سے کہتا اور حرا کو زل سمجھ کر مدہوشی کے عالم میں اس سے جی بھر کر پیار کرتا......حرا کو محبت کسی اور کی وساطت سے......کسی اور کے صدقے میں مل رہی تھی......اور شہیر کو تسکین کہ زل اب بھی اس کے پاس ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے......اور یہ دوری ختم نہیں ہو رہی تھی......کیونکہ دونوں کے درمیان ان کے دل حائل تھے مگر دلوں میں یادیں کسی اور کی تھیں......ان یادوں میں اتنی طاقت تھی اور انہوں نے ان کے دل کی دیواروں کو اتنا سخت اور مضبوط بنا دیا تھا کہ وہ ان دیواروں کو توڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھیں......اور وہ خود اتنے طاقتور نہیں تھے کہ ان دیواروں کو توڑ کر ان یادوں کو خود وہاں سے ہٹا دیتے......اس لئے ان کا رشتہ ایسی سرد مہری کا شکار تھا......جس میں حرارت یا تپش کے کہیں سے داخل ہونے کے کوئی امکانات نہ تھے......جو ان کی سرد مہری کو ختم کر سکتے......

زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی......

شب و روز کا معمول جاری تھا......

مگر وہ اپنی اپنی ذات میں......

اتنے ہی تنہا اور بے خبر تھے......

جتنی سیاہ راتوں میں تاریک راہیں......

☆

روشنی یونیورسٹی جانے سے پہلے شاپنگ کے لئے ایک قریبی ڈیپارٹمنٹل سٹور میں گئی...... شاپنگ کے دوران اس کی ملاقات اسامہ سے ہو گئی...... دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے...... روشنی سب کلاس فیلوز کے بارے میں باری باری پوچھتی رہی۔

''زل...... کیسی ہے...... اور...... ارسلان؟'' روشنی نے پوچھا۔

''دونوں نے شادی کر لی ہے...... خوب مزے میں ہیں...... آج کل ایک آرٹ اکیڈمی چلا رہے ہیں'' اسامہ نے بتایا۔

''اور عمر...... مریم...... وغیرہ......'' روشنی نے پوچھا۔

''عمر انگلینڈ میں ہے...... مریم ایک کالج میں لیکچرار ہے اور باقی سب لوگ بھی اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں'' اسامہ نے بتایا۔

''کیا مطلب......؟'' روشنی نے چونک کر پوچھا۔

''شہیر نے بھی شادی کر لی ہے...... اس کی بیوی ڈاکٹر ہے...... اور میں بھی شادی کا سوچ ہی رہا تھا...... کہ تم مل گئیں'' اسامہ نے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا مگر روشنی شہیر کی شادی کا سن کر ایک دم خاموش ہوگئی۔ کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ گئی۔

''تم کیا کر رہی ہو......؟'' اسامہ نے اچانک پوچھا۔

''ایک یونیورسٹی جوائن کی ہے...... اگلے ہفتے یہاں سے جا رہی ہوں'' روشنی نے جلدی جلدی بتایا وہ جلد از جلد وہاں سے جانا چاہتی تھی۔

''مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دو...... کسی روز پلان کر کے زل اور ارسلان کی اکیڈمی چلتے ہیں'' اسامہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے......'' روشنی نے اسے اپنا نمبر دیا اور وہاں سے چلی گئی......

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کا دل اس قدر بے چین ہو رہا تھا کہ نادانستہ وہ ایک جگہ گاڑی روک کر شدت سے رونے لگی...... ہچکیاں بھر کر روتے ہوئے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات پر رو رہی ہے......

کیا شہیر کی شادی کا سن کر......؟

یا پھر...... یہ جان کر کہ شہیر خوش گوار زندگی گزار رہا ہے۔

انسان اندر سے کس قدر کمزور مخلوق ہے...... بلند و بانگ دعوے کرنے والا...... پہاڑوں سے مضبوط اور آسمان جیسا بلند حوصلہ رکھنے

والا...... کیسے لحموں میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے...... اس قدر کمزور اور شکستہ ہو جاتا ہے کہ ریت کے ذروں سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے...... جب اس کو محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا......

جب اس کی چاہت کو جھٹلایا جاتا ہے......

جب اس کی ذات کی نفی کی جاتی ہے......

جب اس کے جذبوں کو روندا جاتا ہے......

تب اس کی سوچیں اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں......

تمام احساسات، جذبات اور محسوسات کہیں کھو جاتے ہیں...... وہ ایک دم کمزور ہو کر مٹی کا بے وقعت اور حقیر ذرہ بن جاتا ہے۔

روشنی لمحہ لمحہ بکھر رہی تھی...... ٹوٹ رہی تھی...... اور اس کی روشنی دم توڑ رہی تھی...... اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی...... اس کا دل تمام مثبت سوچوں اور جذبوں سے خالی ہو رہا تھا اور اس کی جگہ منفی خیالات اور سوچیں اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھیں...... انسان کس قدر کمزور ہے...... جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سب کچھ کھونے پر تیار ہو جاتا ہے...... اور دل اسے مجبور بھی کرتا ہے اور بے قصور بھی۔

☆

زل...... روشنی کو زبردستی اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی...... اسامہ اور ارسلان اکیڈمی میں ہی رک گئے...... روشنی زل کا گھر دیکھ کر حیران رہ گئی...... دو بیڈ روم اور ایک نارمل سائز کا ڈرائنگ روم اور چھوٹے سے لاؤنج پر محیط گھر زل کا کیسے ہو سکتا ہے...... روشنی کو یقین نہیں آ رہا تھا...... وہ زل کے والدین کا گھر دیکھ چکی تھی...... جس کا لان ہی زل کے اس پورے گھر سے بڑا تھا...... زل کی ساس ایک بوڑھی عورت تھی...... ایک چھوٹا دیور اور سسر مل کر ایک سٹور چلاتے تھے روشنی کی آنکھیں اس کے گھر کو دیکھ کر حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''تم حیران کیوں ہو رہی ہو؟ کیا میرا گھر دیکھ کر......؟'' زل نے روشنی کے چہرے پر حیرانگی کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم یہاں ایڈجسٹ ہو گئی ہو......؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''جب دلوں میں محبت ہو تو چھوٹا سا آشیانہ بھی محل لگتا ہے اور اگر دل نفرتوں اور کدورتوں سے بھرے ہوں تو شیش محل بھی تنگ و تاریک سرنگیں نظر آتی ہیں...... جہاں ہر وقت دم گھٹتا رہتا ہے'' زل نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا تم ارسلان سے بہت محبت کرتی ہو......'' روشنی نے پوچھا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش ہیں'' زل مسکرائی۔

''اس لئے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اور...... اس لئے بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت اور احساسات کا بہت خیال رکھتے ہیں...... روشنی اگر محبت کے ساتھ عزت نہ ہو...... تو وہ محبت بے معنی اور بے اثر ہو جاتی ہے اور جہاں صرف عزت ہو...... اور...... محبت نہ ہو...... تو وہ عزت بھی بہت بدمزہ اور پھیکی محسوس

ہوتی ہے......شروع شروع میں، میں کچھ دیر اپ سیٹ رہی......پھر بہت ساری باتوں پر کمپرومائز کرلیا تو دل مطمئن ہونے لگا......اب ایڈجسٹمنٹ پرابلم نہیں......بہت جلد ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں جو میں نے اور ارسلان نے مل کر بنایا ہے"زل نے خوش ہوکر بتایا۔

"ریئلی......اٹس گڈ" روشنی بھی خوش ہوگئی۔

"تم شادی کیوں نہیں کر رہیں؟" زل نے اچانک اس سے پوچھا۔

"بس......یونہی" روشنی نے ٹالنا چاہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی......کوئی وجہ تو ہوگی" زل نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں......جیسے ہی کوئی دل کو بھا گیا تو شادی بھی کرلوں گی" اس نے بے دلی سے جواب دیا......وہ زل کے اس سوال سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

"زل......ایک بات پوچھوں" روشنی نے اپنا حوصلہ یکجا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں......پوچھو......" زل نے پھل کاٹتے ہوئے کہا۔

"زل......ارسلان کی تمہیں کیا بات پسند آئی......کہ تم نے اس سے شادی کرلی......شہیر......شہیر بھی تو تم سے محبت کرتا تھا اور ارسلان کے مقابلے میں ساؤنڈ بھی تھا" روشنی کو ایک سوال ہمیشہ سے کھٹکتا تھا......اور آج اس نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔

"کیا یہ محبت کی بات تمہیں شہیر نے بتائی تھی؟" زل نے چونک کر پوچھا۔

"جس نے بھی بتائی ہو......کیا اس میں حقیقت نہیں" روشنی نے پوچھا۔

"ہاں......اس نے مجھ سے اظہار محبت ضرور کیا تھا......مگر میں جواب میں اقرار محبت نہ کرسکی" زل نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں......؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنے دل کو کسی کی محبت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا......محبت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں......محبت کا پودا اسی زمین میں نشوونما پاتا ہے جو زرخیز ہو......بنجر زمین پر محبت کا پھول کبھی نہیں کھلتا......دل بھی محبت کرنے کے لئے بہت کچھ مانگتا ہے......" زل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"دل بہت زیادہ ڈیمانڈنگ ہوتا ہے......اسے ایسے شخص کی محبت چاہیے ہوتی ہے جو محبت کے ساتھ ساتھ اظہار کا فن بھی جانتا ہو......دل میں چھپی محبت......خاموش زبان، خشک لب اور روکھے لہجے......دل ایسی محبت کو کبھی قبول نہیں کرتا انسان ایسی محبت کو پاکر ہمیشہ تشنہ رہتا ہے......شہیر کی محبت بھی ایسی ہی تھی......وہ بہت خاموش، سنجیدہ اور unpredictable پرسنالٹی تھا......اس کی محبت کا اپنا انداز تھا مگر میں نہ تو ایسی محبت کی قائل ہوں اور نہ ہی میرا دل ایسے شخص کو قبول کرسکتا ہے......میں نے شہیر کے بارے میں بہت سوچا مگر میرے دل نے ہر بار "نفی" میں ہی جواب دیا......میں اپنے دل کو اس کی محبت کے لئے مجبور نہیں کرسکتی تھی......کوئی کسی کے درد کا علاج نہ کرے تو کیا صرف لفظوں سے شفا مل سکتی ہے......جبکہ

ارسلان اس کے مقابلے میں مجھے بہت پازیٹو لگا...... وہ جسمانی اور مالی طور پر اس سے بہت کم ہے.... مگر اس نے میرے ٹوٹے دل کو سنبھالا...... میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا..... روشنی میں اپنے خالہ زاد کے ساتھ منسوب تھی..... ہم دونوں کا نکاح ہو گیا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے...... وہ کینیڈا چلا گیا مگر وہاں سیٹلڈ ہونے کے لئے اسے ایک کینیڈین لڑکی سے شادی کرنا پڑی..... اس بات پر فیملی میں clashes بڑھنے لگے اور اس نے مجھے ڈائیورس بھیج دی...... میرے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا...... کیونکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے میرے سارے خواب بکھر گئے ایک روز میں شہیر کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ میرا پورٹریٹ بنا رہا تھا..... اس روز نجانے کہاں سے آنسو میری آنکھوں میں امڈ امڈ کر آ رہے تھے..... شہیر میری طرف دیکھتا اور خاموشی سے پورٹریٹ بنانے لگتا..... اس نے ایک بار بھی مجھ سے میرے آنسوؤں کے بارے میں نہ پوچھا..... میں بے بس ہو کر کیفے ٹیریا میں چلی گئی..... وہاں ارسلان تھا..... جانتی ہو ارسلان نے کیا کہا.....؟'' زل نے رک کر روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس نے مجھے بہت تسلی دی اور کہنے لگا..... میں تم سے شادی کروں گا..... اگر تمہیں پسند ہو تو..... روشنی وہ لمحہ بہت مختصر مگر بہت ڈیمانڈنگ ہوتا ہے..... جب آپ بری طرح ٹوٹ رہے ہوتے ہیں اور کوئی آگے بڑھ کر آپ کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا ہے..... مجھے ارسلان سے ایسی توقع نہیں تھی..... وہ اگر عام حالات میں مجھے یہ بات کہتا تو شاید میں اس پر سیریس نہ ہوتی..... لیکن اس وقت وہ میرے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا..... میرا گھر ٹوٹا تھا اور وہ مجھ کو اپنی صورت میں سائبان دے رہا تھا..... اس وقت اس کے ذہن میں میری دولت، میرا اسٹیٹس نہیں تھا..... اس وقت صرف ''میں'' اور ''میرا دکھ'' اور ''میرا ٹوٹا دل'' تھا اور اس نے مجھے وہی کچھ دینے کی کوشش کی تھی جو مجھے چاہیے تھا..... وہ میرا وہی نقصان پورا کرنا چاہتا تھا..... جس کے دکھ میں میں رو رہی تھی..... روشنی تم ہی بتاؤ..... میں کس کو اہمیت دیتی..... شہیر کو..... یا..... ارسلان کو.....؟ جانتی ہو..... شہیر تھوڑی دیر بعد کیفے ٹیریا میں ہمارے پاس آیا مگر اس نے پھر بھی نہ مجھ سے کچھ پوچھا..... کوئی تسلی نہ دی..... پھر میں کیسے اس کو اپنا ٹوٹا دل دے دیتی..... جس پر مرہم تو کوئی اور رکھ رہا تھا..... جسے تسلی تو کوئی اور دے رہا تھا..... مجھے 'مسیحا' کی ضرورت تھی..... نام نہاد محبوب کی نہیں اس لئے میں اس کی محبت کو قبول نہ کر سکی'' زل قدرے جذباتی لہجے میں بولتی رہی پھر خاموش ہو گئی۔

''مگر..... تم نے اپنی ڈائیورس اور نکاح کا کبھی ذکر نہیں کیا؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اپنی پرسنل باتیں دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا پسند نہیں کرتی..... صرف ارسلان کے ساتھ کیں..... اور وہی میرا نصیب بن گیا'' زل نے آہ بھر کر کہا اور پھر مسکرانے لگی۔

روشنی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی......

''میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں'' زل اٹھتے ہوئے بولی۔

روشنی گہری سوچ میں ڈوب گئی..... زل کے دل نے شہیر کو قبول نہیں کیا..... اس کے نزدیک وہ کوئی قابل قدر شخصیت نہیں تھا..... مگر روشنی کا دل بہت مختلف تھا..... وہ زل سے اتنا کچھ سننے کے باوجود بھی شہیر سے نفرت نہ کر سکا..... وہ اپنی محبت میں ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا..... اس کی

وجہ کیا تھی؟ کیا روشنی کا دل کسی اور شے سے بنا تھا...... یا پھر زمل کے مطابق اس کے دل کی ڈیمانڈز اور تھیں...... اس کا دل تو کچھ بھی مطالبہ نہیں کرتا تھا...... اس نے تو شہیر سے کچھ بھی نہیں طلب کیا تھا...... وہ تو بس محبت کرنے پر مجبور تھا جیسے کوئی بن دیکھے...... بن سنے...... کسی پر یقین کامل کر لیتا ہے...... اپنی چاہتوں اور محبتوں میں اسے سرفہرست رکھتا ہے...... بدلے میں اس سے کچھ بھی نہیں مانگتا...... محبت کے دو بول بھی نہیں...... پسندیدگی بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... اور اسکی خوشی پر اپنی ساری خوشیاں، اس کی محبت پر اپنی ساری محبتیں...... اور چاہتیں قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے...... کیا اس دل میں زیادہ زرخیزی ہوتی ہے؟ یا وہ زیادہ حساس نہیں ہوتا...... یا پھر اس میں جذبات کی کمی ہوتی ہے یا پھر اس کی شکل یا ساخت دوسروں سے مختلف ہوتی ہے......

یہ کیسا معمہ ہے...... جو سمجھ میں نہیں آتا......

دل محبت کرتا ہے...... پھر خود فریبی کے جال بنتا ہے......

سارے جذبوں کو جال میں جکڑ کر خود متنفر ہو جاتا ہے......

انسان کی روح کو بے قرار اور بے چین کر دیتا ہے...... اور پھر بھی بری الذمہ رہتا ہے۔

''میں شہیر سے نفرت نہیں کر سکتی...... جیسے زمل اس سے محبت نہیں کر سکی...... اور...... شہیر مجھ سے محبت نہیں کر پایا جس طرح وہ زمل سے کر پایا ہے......'' روشنی نے آہ بھری اور چائے کا کپ بے دلی سے رکھ کر لوٹ آئی۔

☆

''شہیر جانتے ہو...... پچھلے دنوں روشنی پیرس سے آئی تھی'' اسامہ نے شہیر کو فون پر بتایا۔

''کیا مطلب...... کیا وہ آئی تھی؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اور اب وہ دوسرے شہر شفٹ ہو چکی ہے...... اس نے کوئی یونیورسٹی جوائن کر لی ہے......'' اسامہ نے بتایا۔

''کیا اس کی شادی ہو گئی؟'' شہیر نے لاپروائی سے پوچھا۔

''نہیں...... اور...... شاید کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی...... اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا'' اسامہ نے بتایا۔

''کیوں......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......''

''اچھا سوچتی ہے...... شادی کرنے سے ملتا بھی کیا ہے...... انسان اور الجھ کر رہ جاتا ہے'' شہیر مایوسی سے بولا۔

''ایسی بھی بات نہیں...... زمل اور ارسلان بہت خوش ہیں بلکہ ایسے کپل کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ دنیا میں اتنے خوش نصیب میاں بیوی بھی ہو سکتے ہیں...... دونوں میں بہت محبت اور انڈر سٹینڈنگ ہے'' اسامہ خوشی سے بتانے لگا...... تو...... شہیر کا دل ایک دم گھٹن کا شکار ہونے لگا...... اسے یہ باتیں سن کر نجانے کیوں افسوس سا ہونے لگا...... اس کے دل میں نفرت، کینہ اور حسد کے جذبے زور پکڑنے لگے۔

''وہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟'' شہیر نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''زل اور ارسلان ایک آرٹ اکیڈمی چلا رہے ہیں...... اس کے علاوہ انٹیریئر کرتے ہیں...... ارسلان اکثر اپنی پینٹنگز کی ایگزبشنز لگاتا ہے۔ سچ ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے...... دونوں نے مل کر خوبصورت سا گھر بھی بنایا ہے...... میں تمہیں کسی روز ان کی اکیڈمی لے کر چلوں گا'' اسامہ نے مسکرا کر کہا تو شہیر انکار نہ کر سکا۔

وہ کئی سالوں کے بعد اس زل کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے دل میں رہتی تھی...... وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی ان میں محبت ابھی باقی تھی اور یہ کہ دنیا میں کوئی اندر سے بھی خوش ہے وہ ان کے چہروں پر خوشی کے رنگ دیکھنا چاہتا تھا...... اس لئے کچھ سوچتے ہوئے اس نے اسامہ کے سامنے مثبت میں سر ہلایا......

☆

زل اور ارسلان، شہیر کو اسامہ کے ہمراہ اپنے آفس میں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے...... زل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی...... شہیر کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

''وعدہ کرو...... زندگی میں میرے سامنے کبھی مت آنا''

اور اب وہ خود ہی اس کے آفس میں، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ زل پلکیں جھپکائے بغیر شہیر کو حیرانگی سے دیکھتی رہی...... وہ پہلے سے بے حد کمزور ہو چکا تھا اور شکل سے بیمار اور کملایا ہوا لگ رہا تھا...... کنپٹیوں اور سر کے بال کافی زیادہ سفید ہو چکے تھے...... آنکھیں گہری نیند کے خمار سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''آؤ...... بھئی...... آج تو...... شہیر نے یہاں آ کر ہمیں زبردست سرپرائز دیا ہے...... تم سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے...... اسامہ ایسے ہی امیزنگ کام کرتا ہے۔ پچھلے ہفتے روشنی کو لایا...... اور آج شہیر کو......'' ارسلان بہت تپاک سے اسے گلے لگاتے ہوئے بولا۔

''اسامہ نے بتایا...... کہ آپ لوگوں نے بہت پراگریس کی ہے...... آرٹ اکیڈمی کھولی ہے اور یہ کہ بہت خوش ہیں......'' خوش پر زور دے کر شہیر نے معنی خیز انداز میں زل کی طرف بغور دیکھ کر کہا...... تو زل نے بھی اس کی طرف بغور دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

''میں نے سوچا...... آپ سے مل کر آپ کی خوشیوں کا راز پوچھنا چاہیے'' شہیر نے پھر معنی خیز انداز میں زل کی طرف دیکھ کر کہا...... زل کا چہرہ خون کی تیز گردش سے تمتمانے لگا...... وہ اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ارے...... اسامہ تو ایسے ہی مذاق کرتا رہتا ہے'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب...... تم لوگ خوش نہیں ہو...... کیا میرے سامنے خوش ہونے کا ڈرامہ کرتے ہو'' اسامہ نے منہ بنا کر کہا۔

''نہیں...... نہیں...... شکر ہے...... ہم واقعی بہت خوش ہیں...... لیکن اتنا ہی...... جتنا کہ ایک نارمل میریڈ کپل کو ہونا چاہیے...... اسامہ کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زمل......آپ ......بھی...... خوش ہیں نا......؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں زمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''اور......ہاں'' اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''زمل یار......چائے وغیرہ منگواؤ......پرانے یار دوست آئے ہیں......'' ارسلان نے زمل سے کہا......تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی......وہ عجیب مخمصے کا شکار ہوگئی تھی......شہیر کا اسے دیکھنے کا انداز اور اس کی معنی خیز باتیں......اسے عجیب سی کوفت محسوس ہو رہی تھی......شہیر بار بار ان کے خوش ہونے کا تذکرہ کیوں کر رہا ہے......؟ کیا وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن نہیں......؟ وہ ارسلان کو بھی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا......یہ میرا وہم ہے......یا......پھر شہیر کا لوگوں کو دیکھنے کا اندازہ بدل گیا ہے......اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت، بے چینی، اداسی اور بے بسی ہے......'' زمل ٹی روم میں چائے کی ٹرے تیار کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی تھی......سب کو روم میں چائے پیش کی گئی......چائے پینے کے دوران......اور باتیں کرتے ہوئے شہیر زمل کو یوں دیکھتا جیسے برسوں کے بعد کوئی پیاسا، پانی کے کنویں کو حسرت اور بے بسی سے دیکھتا ہے مگر کنویں تک پہنچ نہیں پاتا......زمل اس کی نظروں سے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی......باتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا......کالج کی باتیں......کلاس فیلوز اور اساتذہ کی باتیں......بیتے دنوں کی خوبصورت باتیں......باتوں کا رخ گھوم پھر کر......کالج لائف کی طرف مڑ جاتا اور کالج لائف میں شہیر کی برتھ ڈے......کو سب یاد کرتے......اور ایک ایک واقعے کو یاد کر کے خوب ہنستے رہے......مگر اس دن ایک اور اہم واقعہ بھی ہوا تھا......جس کا علم صرف شہیر اور زمل کو تھا......اس لئے شہیر بار بار سب کو ڈراپ کرنے کا ذکر کرتا......تاکہ زمل کو اظہار محبت یاد آئے......وہ جب بھی ایسی بات کا ذکر کرتا......زمل نظریں چرانے لگتی......

''آج کا دن بھی......اس شام کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا'' شہیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یار......تم آج کل کیا کر رہے ہو؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں......کبھی کبھار ڈیڈی کی فیکٹری چلا جاتا ہوں......لیکن بزنس میرا ٹیسٹ نہیں......'' شہیر اکتاہٹ سے بولا۔

''یار......تم جیسا ٹیلنٹڈ شخص اپنا ٹیلنٹ یوں ضائع کر رہا ہے یہ افسوس کی بات ہے......تم ہماری اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتے'' ارسلان نے اچانک کہا تو زمل انتہائی حیرت سے ارسلان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں......شہیر......یہ اچھی آفر ہے......تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور کام کرنے کا موقع بھی ملے گا'' اسامہ نے کہا تو شہیر نے مسکرا کر زمل کی طرف دیکھا۔

''ہاں......بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو......میں اس پر ضرور سوچتا ہوں'' شہیر نے زمل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یار سوچنے کی کیا بات ہے......بس تم کل سے ہی جوائن کرو'' ارسلان نے کہا تو شہیر زمل کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''تھینکس......تم لوگوں کو جوائن کر کے مجھے بھی خوشی ہوگی'' شہیر ارسلان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا اور اسامہ کے ساتھ خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''ارسلان......یہ تم نے کیا کیا؟ ہمارے پاس کوئی ایکسٹرا ویکنسی نہیں......'' زمل نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''زِل......شہیر بہت ڈسٹرب ہے......اسامہ نے مجھے بتایا تھا......اس کے اپنی بیوی کے ساتھ ٹرم اچھے نہیں......اسے ہماری مدد اور سپورٹ کی ضرورت ہے......اسامہ اس کو اسی لئے یہاں لایا تھا......ہم دونوں نے پہلے ہی پلان کر لیا تھا۔ زِل دوست واحباب پریشان ہوں تو ان کی پریشانی دور کرنا......ان کے دکھ شیئر کرنا ہمارا فرض ہے''ارسلان نے نرم لہجے میں کہا تو زِل خاموش ہو گئی۔

''کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''ارسلان نے پوچھا۔

''نہیں......میں تو یونہی......''زِل کے پاس بات کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''زِل انسان کو اپنا دل ہر ایک کے لئے کھلا......اور......ظرف بڑا رکھنا چاہیے......اتنا بڑا کہ اس میں ہر ایک کا دکھ درد سما سکے......اور زِل......جانتی ہو......ان لوگوں پر قدرت بہت مہربان ہوتی ہے......جنہیں ایسے ظرف سے نوازتی ہے''ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح جانتی ہوں......تم قدرت کے خاص الخاص بندوں میں سے ایک ہو......جس کے دل کے چار نہیں......بارہ خانے ہیں کیونکہ ان خانوں میں سارے جہان کا درد چھپا ہوا ہے''زِل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا......تو......ارسلان بھی اس تعریف پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☆

حرا ہاسپٹل سے گھر لوٹی تو ہر طرف گہرا سکوت تھا......گھر پر کوئی بھی نہیں تھا......شہیر نے جب سے اکیڈمی جوائن کی تھی وہ بہت لیٹ گھر آتا تھا......وہ گھر میں ہونے کے باوجود بھی نہیں ہوتا تھا......اس نے کبھی حرا کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا......ممی اور ڈیڈی کی اپنی اپنی سرگرمیاں تھیں......ہر کوئی دوسرے سے الگ تھلگ اور متنفر تھا......حرا اس تنہائی اور وحشت ناک سناٹے سے تنگ آ گئی تھی......یہاں سب کچھ اس کے مزاج کے برعکس تھا......وہ اپنے والدین کے گھر جتنی خوش اور آزاد تھی......یہاں آ کر وہ اتنی ہی سنجیدہ اور آزمائشوں میں جکڑی ہوئی تھی......اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس گھر سے اور شہیر سے کہیں دور چلی جائے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے......صبح ہوتے ہی ہاسپٹل چلے جانا اور شام کو دیر سے لوٹنا......اکثر نائٹ ڈیوٹی کر کے صبح کو لوٹنا......شہیر کو نہ اس کے دن کی کوئی فکر تھی......نہ رات کی......اور جب سے اس نے خود آرٹ اکیڈمی جوائن کی تھی......اس کو ایسی مصروفیت مل گئی تھی......جس میں حرا کی گنجائش بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی......حرا بھی مشین کا ایسا پرزہ بن گئی تھی جو ہر وقت متحرک رہتا ہے۔

آج وہ ہاسپٹل سے جلدی لوٹ آئی تھی......صبح سے شدید ڈپریشن میں مبتلا تھی......ایک آپریشن کے دوران ماں اور بچے کی موت ہو گئی تھی......اور اس صدمے کا اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں بھی بیٹھ کر روتی رہی......ایسے کیسز نجانے کتنے اس نے زندگی میں دیکھے تھے مگر اس کیس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لڑکی اس کی ہم عمر تھی اور خود بھی ڈاکٹر تھی......اور یہ اس کا پہلا بچہ تھا......اس کے شوہر نے بیوی اور بچے کی موت کا اتنا صدمہ لیا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا اور سکتے میں چلا گیا تھا۔

حرا کو یہ سب کچھ دیکھ کر شدید ڈپریشن ہوا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جائے......تو شہیر کو ذرا سا بھی فرق نہیں پڑے گا......اس کی زندگی میں حرا کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی یاد میں چند آنسو بھی بہائے گا......وہ کیسی بے وقعت زندگی گزار رہی تھی......جس شخص کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کیا تھا......اس سے اسے دو آنسوؤں کی بھی امید نہ تھی۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز لیٹی یہی باتیں سوچنے میں مصروف تھی جب ٹیلیفون کی بیل نے اسے اٹھنے پر مجبور کیا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا دوسری جانب ''سمیر'' تھا...... بہت ماہ بعد اس سے بات ہو رہی تھی''۔

''کون......؟'' حرا نے چونک کر پوچھا۔

''تمہارا گنہگار......'' سمیر نے اس کی آواز پہچانتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

''اوہ...... تم......'' حرا نے بے دلی سے جواب دیا۔

''کیسی ہو......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''تم کیا سننا چاہتے ہو؟'' حرا نے بھی آہ بھر کر کہا۔

''کچھ اچھا ہی سننا چاہتا ہوں'' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... ان لوگوں کی زندگی میں ہوتا ہے...... جو اچھی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں...... اور جنہیں زندگی گھسیٹ رہی ہوتی ہے...... وہ نہ تو زندہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مردہ...... وہ کیا اچھا سنائیں گے؟'' حرا نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''کیا بات ہے......؟ کیا کوئی ڈپریشن ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس...... یونہی......'' حرا نے کپکپاتی آواز کے ساتھ جواب دیا۔

''حرا...... پلیز...... کچھ تو کہو...... کچھ تو بتاؤ۔ کوئی شکوہ ہی کرو۔'' سمیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ پوچھوں کہ جس قید بامشقت کی سزا کا طوق تم نے میرے گلے میں ڈالا ہے...... اس کی مدت کیا ہے؟ کیا یہ سزا ختم ہوگی کہ نہیں...... یا...... پھر مجھے اپنی موت تک اسی سزا کو بھگتنا ہوگا......'' حرا بات کرتے ہوئے رونے لگی۔

''حرا...... پلیز...... پلیز...... مت رو...... میں بھی تو تمہارے ساتھ وہی سزا بھگت رہا ہوں...... کیا میں خوش ہوں...... تم ہر پل...... ہر لمحہ...... ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہو...... میرے دل و دماغ میں اور میری روح میں تم سمائی ہو......'' سمیر نے کہا۔

''کیا فائدہ...... ایسی محبت کا......'' حرا سسکی لیتے ہوئے بولی۔

''حرا اگر محبت صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو جائے...... تو وہ انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے...... اور...... جب دل میں سب کے لیے محبت اور ان کا دکھ درد شامل ہوتا ہے...... تو...... وہ محبت ''مسیحائی'' کا روپ دھار لیتی ہے...... اور...... حرا...... قدرت نے تمہیں مسیحا بنایا ہے...... پلیز اپنے آپ کو کمپوز کرو۔'' سمیر نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

''ٹوٹ...... تو...... چکی ہوں...... اب...... بکھر بھی جانے دو'' حرا نے روتے ہوئے کہا۔

''اگر تم بکھر گئی...... تو...... پھر...... مجھے کون سمیٹے گا'' سمیر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''مت کرو...... ایسی...... باتیں...... تم...... ہمیشہ اپنی باتوں سے مجھے فریب دیتے آئے ہو'' حرا غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔

''فریب تو وہ دیتے ہیں...... جو اپنا آپ چھپاتے ہیں...... اور...... میں نے تو...... تم...... سے کچھ بھی نہیں چھپایا...... نہ اپنا دل...... نہ اپنا آپ......'' سمیر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

حرا جواب میں اونچی آواز میں سسکیاں بھرتی رہی۔

''سمیر...... اب میں...... میرا...... حوصلہ ٹوٹ رہا ہے...... اب...... مزید...... نہیں......'' حرا روتے ہوئے بے ربط انداز میں بولی۔

''پلیز...... حرا...... شہیر...... زندہ ہے...... اس لئے کہ تم اس کے پاس ہو...... اگر تم نہ ہوتی تو وہ زندہ نہ رہتا......'' سمیر نے کہا۔

''سمیر...... تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں...... اس کے پاس کبھی بھی نہیں رہی...... وہ زندہ ہے کیونکہ زل اس کے دل کے اندر موجود ہے اور اب اس نے زل کی اکیڈمی جوائن کر لی ہے'' حرا نے اسے بتایا۔

''ک...... کک...... کیا؟'' سمیر بے یقینی سے بولا۔

''کبھی کبھی ہم چیزوں کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھ کر ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہونے کی بجائے اور بگڑ گئی ہیں...... یہی تم نے میرے ساتھ کیا ہے...... تم نے میرے ذریعے شہیر کی زندگی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی...... مگر تم نے میری بھی زندگی بگاڑ دی'' حرا آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''مجھے...... اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا......'' سمیر مایوسی سے بولا۔

''مگر...... تم یہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ میں اس کی زندگی میں کہیں بھی فٹ نہیں بیٹھوں گی...... پھر بھی تم نے اپنا مفروضہ مجھ پر آزمایا......'' حرا غصے سے بولی اور فون بند کر دیا...... روتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا...... تو...... شہیر اس کے پیچھے کھڑا سب باتیں سن رہا تھا...... حرا اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

''ک...... کک...... آپ کب...... آئے؟'' حرا بمشکل بول پائی۔

''ابھی...... چند لمحے پہلے...... فکر نہیں کرو...... میں نے تمہاری ساری باتیں نہیں سنیں...... مگر جتنی سنی ہیں...... وہ سن کر مجھے افسوس نہیں ہوا...... کیونکہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا...... کہ تم اور سمیر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو'' شہیر نے کہا۔

''اگر جانتے تھے...... تو پھر...... ہم دونوں کو کیوں آزمایا...... کیا تم جانتے ہو...... کہ اس نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی اور ابھی تک دے رہا ہے...... وہ شادی نہیں کر رہا...... کیونکہ میں...... اس کی وجہ سے اس اذیت میں ہوں'' حرا غصے سے بولی۔

''ٹھیک ہے...... تم...... مجھے...... چھوڑ کر اس سے شادی کر لو'' شہیر نے آہستگی سے جواب دیا۔

''یہ...... یہ...... تم...... کہہ رہے ہو...... مجھ سے...... اپنی بیوی سے...... تم یہ کہہ رہے ہو...... کس قدر گھٹیا سوچ رکھتے ہو...... تمہاری کوئی ویلیوز ہیں بھی کہ نہیں...... جب انکار کرنے کا وقت تھا...... تب تم نے مجھے...... اس...... سے چھین لیا...... اور اب مجھے اس کی طرف دھکیل رہے ہو...... جبکہ تم نے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح کو بھی مسخ کر دیا ہے...... تم بہت......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے غصے سے گھورتی ہوئی اپنے

کمرے میں چلی گئی......

یہ پہلا جھگڑا تھا جو پانچ سالوں میں ان کے درمیان ہوا تھا...... رینگتا ہوا رشتہ اب اچانک سانپ کی طرح پھنکارنے لگا تھا......شہیر اس کی باتیں سن کر تلملانے لگا...... اسے سمیرا اور حرا سے نفرت محسوس ہونے لگی...... اسے دونوں کی قربانیاں یکسر بھول گئی تھیں...... یاد رہی...... تو صرف ان کی محبت...... دونوں نے اس کے ساتھ ڈرامہ کیا ہے...... اسے بیوقوف بنا کر اس کا تماشا دیکھا ہے...... اس کا خون غصے سے کھولنے لگا...... حرا...... جو پہلے ہی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی...... اب بالکل ہی دل سے خارج ہو گئی تھی۔

☆

ارسلان اور زمل چھٹی کا دن اپنے نئے گھر میں گزارتے...... اس کے در و دیوار کو اپنے ہاتھوں سے سجانے میں مصروف رہتے وہ اپنے گھر کو ایسے آرٹسٹک انداز میں سجانا چاہتے تھے کہ ہر دیکھنے والی نظر ان کے فن کی معترف ہو جائے...... وہ اس گھر کا چپہ چپہ اس قدر خوبصورت انداز میں سجا رہے تھے کہ اسے دیکھتے ہی ان کے ذہن اور ذوق کو داد دینے کو جی چاہتا۔

''ارسلان...... میرا خیال ہے...... ایک ماہ میں ہم یہاں شفٹ ہو جائیں گے...... بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے'' زمل نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی بلائنڈز پر پینٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اتنا ٹائم تو لگ ہی جائے گا......'' ارسلان ڈرائنگ روم کی بڑی سی دیوار کے لئے ایک زبردست سی abstract پینٹنگ بنا رہا تھا۔

''ارسلان...... مجھے تو اس دن کا شدت سے انتظار ہے جب ہم اپنے اس خوبصورت گھر میں...... شفٹ ہوں گے......'' زمل پر امید لہجے میں بولی۔

''تھینک یو...... تم نے میرے ساتھ بہت لف ٹائم گزارا ہے...... ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا ہے...... زمل...... مجھے بہت خوف تھا کہ تم کس طرح محل سے جھونپڑی میں رہ سکو گی...... مگر تم نے مجھے کسی بھی لمحہ یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تم جھونپڑی میں رہ رہی ہو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں جھونپڑی میں نہیں...... میں تو تمہارے محبت کے سنگ تمہارے دل میں رہ رہی ہوں......'' زمل نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارسلان کا موبائل بجنے لگا...... اس نے موبائل دیکھا...... ''شہیر کا فون تھا......

''ہائے...... شہیر...... کیسے ہو؟ ہاں...... ہاں...... ادھر ہی آ جاؤ...... ہمارے نئے گھر میں'' ارسلان اسے ایڈریس سمجھانے لگا اور زمل کا موڈ آف ہونے لگا۔

''شہیر آ رہا ہے......'' ارسلان نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

''اُفوہ...... اس کو ادھر بلانے کی کیا ضرورت تھی...... ایک چھٹی کا دن ہوتا ہے وہ...... اکیڈمی...... میں بھی سر پر سوار رہتا ہے اور اب یہاں بھی'' زمل بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''زل...... پلیز...... ایسے ری ایکٹ مت کیا کرو...... نجانے کیوں تم اس سے خائف رہتی ہو؟'' ارسلان نے ملائمت سے زل کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد شہیر آ گیا...... ان کے گھر...... اس کی درودیوار کو دیکھ کر ان کے ذوق کی تعریفیں کرتا رہا۔

''تم لوگ باتیں کرو...... آج میں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں'' ارسلان کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا...... تو...... شہیر مسکرانے لگا۔ زل کو ارسلان پر غصہ آنے لگا کہ وہ اسے کیوں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہے۔

''آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے...... اور...... پرسکون بھی...... یہاں آ کر خوشی کا احساس ہوتا ہے...... جیسے آپ کے قریب آ کر'' شہیر زل کے قریب آ کر بولا۔

زل نے خفگی سے اس کی جانب دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''آپ کو میرا خیال کبھی نہیں آیا؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور زل کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''نہیں......'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لئے...... کہ مجھے جس کا خیال رکھنا ہوتا ہے...... وہ میرے پاس ہوتا ہے......'' زل ٹھوس لہجے میں بولی۔

''کون...... ارسلان؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

''آپ کو...... اس سے کیسے اتنی محبت ہوگئی؟'' شہیر نے پوچھا۔

''جیسے...... آپ سے نہیں ہو پائی'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولی۔

''اور...... اگر...... ارسلان ہمارے درمیان نہ ہوتا...... تو کیا آپ تب بھی مجھ سے محبت نہ کرتیں'' شہیر نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

ارسلان ٹرے میں چائے کے کپ اور بسکٹ رکھ کر لایا...... شہیر جلدی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑی۔

''ارے بھئی...... یہ کیا کر رہے ہو؟ تم ہمارے مہمان ہو'' ارسلان نے شائستگی سے کہا۔

''دوستوں میں تکلف نہیں ہوتا'' شہیر نے جواب دیا اور ٹرے زل کے آگے کی۔ اس نے کپ پکڑا اور خاموشی سے چائے پینے لگی۔ وہ اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی...... اس لئے بلائنڈز کی طرف منہ کر کے یوں کھڑی ہوگئی...... جیسے اپنی پینٹنگ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہی ہو۔

''کیا تم لوگ چھٹی کا دن یہاں گزارتے ہو؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ہاں......'' ارسلان نے جواب دیا۔

''مگر......اگلی بار نہیں'' زمل نے مڑ کر جلدی سے جواب دیا۔

''کیوں......زمل؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھئی......آپ اپنا پروگرام کینسل مت کریں......میں اگلے ہفتے نہیں آؤں گا......'' شہیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے......نہیں......نہیں......زمل تمہاری وجہ سے نہیں کہہ رہی......ضرور ہماری کوئی کمٹمنٹ ہوگی'' ارسلان نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو زمل خاموش ہوگئی۔

شہیر تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر چلا گیا۔

''ارسلان......پلیز آئندہ اسے یہاں مت بلانا......سارا موڈ آف کر کے رکھ دیا ہے'' زمل خفگی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''بس......یونہی......ڈپریشن کی باتیں کرتا ہے......اس کے آنے سے پہلے ہم لوگ کتنے خوش تھے اور میں بہت جلدی کام کر رہی تھی۔ اب میرا کام کرنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا......چلو......واپس چلتے ہیں'' زمل نے برتن ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا تو ارسلان خاموش ہوگیا۔

☆

شہیر اور حرا کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی تھی......وہ دیر سے گھر آتا......کھانا کھائے بغیر......ڈرنک کرنا شروع کر دیتا......پہلے بھی وہ حرا سے زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا مگر اس کی طرف دیکھتا ضرور تھا......ڈرنک کرنے کے بعد اس کے پاس ضرور جاتا تھا مگر اب وہ نہ تو اس کی طرف دیکھتا تھا......نہ اس کے پاس جاتا تھا......صرف ڈرنک کرتا تھا......اور گہری سوچوں میں گم رہتا تھا......اس کے چہرے سے یوں لگتا جیسے وہ کسی شدید الجھن کا شکار ہو......اور حرا سمجھتی کہ وہ سمیر اور حرا کی باتیں سن کر دلبرداشتہ ہو کر پہلے سے زیادہ ڈرنک کر رہا ہے......وہ کبھی اپنے آپ کو قصوروار سمجھتی......تو کبھی اسے......کبھی اسے ظالم کہتی......تو کبھی اسے......اس پر رحم آتا......جب وہ اس کے پاس آتا تھا تو اسے اس سے نفرت اور کراہت محسوس ہوتی تھی......اب وہ اس کے پاس نہیں آتا تھا تو اسے تشنگی کا احساس ہوتا تھا......دونوں کے درمیان بہت ہی عجیب رشتہ تھا......محسوسات پر مبنی......مگر جذبات سے عاری......حرا اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہتی......اور اس کی نظریں تخیل میں کسی اور کی جانب مرکوز رہتیں......وہ تنگ آ کر سو جاتی......اور شہیر کسی اور کو سوچتے ہوئے جاگتا رہتا......اور اس وقت تک ڈرنک کرتا رہتا جب تک اس کی آنکھیں بند نہ ہونے لگتیں......اور اس لمحے اسے محسوس ہوتا کہ زمل اس کے پاس موجود ہے......اور اس کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی ہے......وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہتا......اور اسی حالت میں سو جاتا......

☆

ارسلان اور زِل اپنے آفس میں کسی بات پر قہقہہ لگا رہے تھے جب شہیر ان کے آفس میں داخل ہوا...... ان کو ہنستے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا اور حیرت وحسرت کے ملے جلے تاثرات سے انہیں عجیب انداز میں گھورنے لگا...... زِل اس کی نظروں سے خائف ہونے لگی۔

''آؤ شہیر...... کیسے ہو...... اکیڈمی میں تمہارا دل لگ گیا ہے نا'' ارسلان نے شہیر کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہاں آ کر بہت اچھا محسوس کرتا ہوں'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں نے کچھ اسٹوڈنٹس کے پراجیکٹس دیکھنے ہیں......'' زِل نے آفس سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

شہیر ارسلان کے سامنے بیٹھ گیا...... اور ایک پراجیکٹ ڈسکس کرنے لگا۔

''ارسلان...... کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو؟'' باتیں کرتے ہوئے شہیر نے اچانک پوچھا۔

''ہاں...... بالکل...... زِل میری زندگی میں ایسی بہار لے کر آئی ہے...... کہ...... میں اپنے سارے کومپلیکسز بھول گیا ہوں...... اس نے مجھے ہر خوشی دی ہے...... بہت اعتماد...... بہت سکون...... اور بہت محبت...... زِل سے ملنے سے پہلے میں زندگی میں بہت تشنگی محسوس کرتا تھا...... تم میرا فیملی بیک گراؤنڈ تو جانتے تھے میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا...... آرٹ کی تعلیم حاصل کرنا میرا شوق تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میں کالج کے بعد رات گئے تک ٹیوشنز کرتا تھا...... میری زندگی بہت محدود اور قدرے بے رنگ تھی...... زِل نے اپنی محبت، اعتماد اور چاہت سے میری زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بھر دیئے ہیں...... زِل بہت اچھی ہے اور میں بہت خوش قسمت ہوں جسے زِل ملی'' ارسلان محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''کیا تم زِل کو ڈیزرو کرتے تھے؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور ارسلان کی طرف دیکھنے لگا۔

''سچ بتاؤں...... بالکل بھی نہیں' وہ ہر ہر بات میں مجھ سے بہت بہتر ہے حسن وخوبصورتی، اچھائی، امارت، نفاست اور اچھے ذوق میں اس کا کوئی ثانی نہیں' ارسلان نے بتایا۔

''مجھے...... تم دونوں پر بہت رشک آتا ہے'' شہیر نے کہا۔

''رشک ضرور کرنا یار...... مگر حسد نہ کرنا'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''حسد سے خوشیوں کو نظر لگ جاتی ہے'' ارسلان نے جواب دیا تو شہیر مسکرانے لگا۔

''تم نے کبھی اپنی بیوی اور میریڈ لائف کے بارے میں نہیں بتایا...... کبھی اپنی بیوی سے تو ملاؤ'' ارسلان نے کہا۔

''جب ایک کو دوسرے سے ملوایا جاتا ہے...... تو اس کی ذات کا حوالہ دینا پڑتا ہے...... اور میں اپنی بیوی کو کس طرح تعارف کراؤں...... اس کا تو کوئی حوالہ ہی نہیں' شہیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''وہ نہ میرے لئے اہم ہے...... اور نہ ہی میں اس کے لئے...... ہم اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں...... اور...... بس'' شہیر اداس لہجے میں بولا۔

''وری سیڈ......پھر ایسے رشتے کا کیا فائدہ......؟تم نے اس سے شادی کیوں کی......''ارسلان نے کہا۔

''ہاں......یہی میں بھی سوچتا ہوں''شہیر نے جواب دیا۔

''تم نے کسی ایسی لڑکی سے شادی کیوں نہ کی جسے تم محبت کرتے''ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے کرتا......وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی......اور اس نے اس سے شادی کر لی''شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اوہ......وری سیڈ......پھر تم نے اس سے کیوں نا شادی کی......جو تم سے محبت کرتی''ارسلان نے کہا۔

''میں نے اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں......مجھے کیسے علم ہوتا کہ کوئی اور بھی مجھ سے محبت کر سکتی ہے......''شہیر نے جواب دیا۔

''اور......تمہاری بیوی......؟کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتی؟''

''نہیں......وہ......بھی کسی اور سے محبت کرتی ہے''شہیر نے جواب دیا۔

''اوہ گاڈ......اٹس وری ٹریجک......لیکن یار کب تک زندگی ایسے گزرے گی......تمہیں اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے اپنے دل کو سمجھانا پڑے گا......تم اپنی پرانی سوچوں میں سے نکل آؤ......اور......اس کو دیکھو جو تمہارے سامنے ہے......''ارسلان نے دوستانہ انداز میں سمجھایا۔

''میں کیا کروں......مجھے اس کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا......مجھے اپنی بیوی کے چہرے میں بھی وہ ہی دکھائی دیتی ہے......میرے دل کے ہر خانے میں وہ سمائی ہے......میں جس لڑکی کو بھی دیکھتا ہوں مجھے وہی دکھائی دیتی ہے''شہیر نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تم......اس سے محبت نہیں......دیوانگی کی حد تک عشق کرتے ہو......اور عشق میں انسان ایسے ہی بے بس ہو جاتا ہے۔عشق بہت جان لیوا ہوتا ہے''ارسلان نے جواب دیا۔

''ارسلان......اس عشق نے مجھے بہت بے چین اور مضطرب کر دیا ہے......میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا......تم ہی بتاؤ......میں کیا کروں......؟وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہے۔میں کیا کروں......کہ......وہ مجھ سے محبت کرنے لگے''شہیر نے اس سے مشورہ چاہا۔

''یار......تم اس کے دل کو کیسے بدل سکتے ہو......اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے تو تم کیسے اسے مجبور کر سکتے ہو......کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ جائے......اور......تم سے محبت کرنے لگے......بہتر یہی ہے کہ تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو......اور اپنی بیوی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو''ارسلان نے سمجھایا۔

''میں......نہیں......کر سکتا......مجھے اس کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں اتا......تو کچھ اور کیسے سوچوں......وہ میری محبت اور عشق کی انتہا ہے......اس کے بعد کوئی اور نہیں......کوئی بھی نہیں......کبھی بھی نہیں......''وہ جذباتی انداز میں بولا۔

اسی لمحے زمل آفس میں داخل ہوئی......شہیر نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

''اسے کیا ہوا......؟''زمل نے حیرت سے پوچھا۔

''بیچارے کے ساتھ بہت برا ہوا ہے......اپنی محبت کی کہانی سنا رہا تھا......'' ارسلان نے جواب دیا۔

''ک......کک......کیا......کیا بتایا......؟'' زمل نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ یہ جس سے محبت کرتا تھا......اس کی شادی کہیں اور ہو گئی......مگر یہ بے وقوف شخص ابھی تک اس کے سحر میں مبتلا ہے......زمل......شہیر......اس لڑکی سے عشق کرتا ہے......اور وہ بھی دیوانگی کی حد تک......مجھے تو ڈر ہے......یہ واقعی اس کے عشق میں دیوانہ نہ ہو جائے......'' ارسلان نے تاسف سے کہا۔

''کون ہے......وہ......لڑکی......؟'' زمل نے نادانستہ پوچھا۔

''معلوم نہیں......نہ ہی میں نے پوچھا......اور نہ ہی اس نے بتایا'' ارسلان نے آہ بھر کر کہا۔

''گھر چلیں......کافی ٹائم ہو رہا ہے'' زمل نے آفس کی دیوار پر لگے کلاک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......'' ارسلان چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا اور اس کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

زمل کا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی ارسلان کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

''شہیر اس لڑکی سے عشق کرتا ہے......اور وہ بھی دیوانگی کی حد تک عشق کرتا ہے......دیوانگی کی حد تک......دیوانگی کی حد تک'' ان الفاظ کی بازگشت سے وہ فرار چاہتی تھی مگر شاید اب فرار ممکن نہیں تھا۔

☆

کرشن چندر کے بہترین افسانے

کرشن چندر کے بہترین افسانے، مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں اُن کے افسانے، برے بھنے، زندہ نوادر، نیوٹرل زون، ٹمپریچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جامن کا پیڑ، بھیا جی، ساجھے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جولی لیکساں، شنو، خوشی، بینگ بینگ فنگ، آؤ مر جائیں، ٹیکسی ڈرائیور، کچرا بابا، تنہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے بمبئی فلم انڈسٹری کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول ''چاند کا گھاؤ'' لکھا جو کہ بمبئی فلم انڈسٹری کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔ **کرشن چند کے بہترین افسانے** کتاب گھر کے **افسانے** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

مسز فاخر پچھلے کئی ماہ سے اپنی پبلک لائف میں بہت مصروف تھیں گھر اور گھر کے معاملات سے وہ بالکل ہی بے خبر ہوگئی تھیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے......؟ گھر میں کون آتا ہے......کون جاتا ہے انہیں قطعی اس کا علم نہیں تھا......شہیر اور حرا جس طرح کی زندگی گزار رہے تھے انہیں علم تو تھا مگر اب دونوں کس حد تک ایک دوسرے سے متنفر ہو چکے تھے اور بالکل ہی ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے تھے۔ انہیں اس کی بالکل بھی خبر نہیں تھی۔

کئی ماہ بعد انہوں نے گھر میں ایک دن گزارا تو وہ شہیر اور حرا کی روٹین دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ فاخر حسین بھی اس روز گھر پر موجود تھے۔ مسز فاخر نے حرا اور شہیر کو بلایا تاکہ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ ڈنر کریں......ملازمہ گئی اور واپس آ گئی۔

''میڈم......دروازے پر کئی بار دستک دی ہے مگر کوئی دروازہ ہی نہیں کھولتا......'' ملازمہ نے پریشانی سے جواب دیا۔

''فاخر......میرا خیال ہے آپ بلا لائیے'' مسز تہمینہ نے کہا۔

''آپ خود کیوں نہیں چلی جاتیں...... مجھے بہو کے کمرے پر دستک دینا پسند نہیں......آپ ساس کی حیثیت سے جا سکتی ہیں'' فاخر حسین نے قدرے منہ بنا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

تہمینہ نے شوہر کی طرف قدرے خفگی سے دیکھا اور اوپر چلی گئیں۔ کافی بار دستک دی......مگر جواب نہ ملا۔ انہوں نے اپنے موبائل سے اندر شہیر اور حرا کے موبائلز پر کال کی۔ شہیر کا موبائل بند تھا حرا نے بمشکل ہیلو کہا۔

''حرا بیٹے......دروازہ کھولو......کیا بات ہے......؟ کیا تم سو رہی ہو؟'' مسز تہمینہ نے پریشانی سے کہا۔

حرا نے بمشکل دروازہ کھولا......اور دروازہ کھولتے ہی گر پڑی۔ مسز فاخر پریشان ہو کر اسے اٹھانے لگیں۔

''حرا بیٹے ہوش کرو......یہ......تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مسز فاخر پریشانی سے بولیں اور اسے بمشکل سہارا دے کر بستر پر لٹایا۔ حرا کو شدید بخار تھا......اور بخار کی شدت اور جسمانی نقاہت سے وہ گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

شہیر صوفے پر نشے میں دھت بے ہوش پڑا تھا اسے کچھ خبر نہ تھی......کمرے میں کیا ہو رہا ہے......کون کمرے میں آیا ہے اور حرا کی کیا حالت ہے......اس کے پاس ٹیبل پر وہسکی اور بیئر کی بوتلیں رکھی تھیں......ہر بوتل میں سے اس نے شراب پی ہوئی تھی وہ اس قدر کثرت سے شراب نوشی کرنے لگا تھا......انہیں جان کر شدید صدمہ ہوا، مسز فاخر نے فاخر حسین کو موبائل پر فون کر کے اوپر بلایا۔ وہ بھی شہیر کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ ان سے دس گنا زیادہ شراب نوشی کرنے لگا تھا۔

''فاخر......یہ......کب تک ایسے چلے گا......شہیر کا علاج بہت ضروری ہے......ورنہ......یہ......؟'' وہ رونے لگیں۔

فاخر حسین نے ہاسپٹل میں فون کر کے ایمبولینس بلائی اور شہیر کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا۔ وہ خود اس کے ساتھ ہاسپٹل چلے گئے۔

مسز فاخر حرا کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئیں......دو دن کی بے ہوشی کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی......شہیر کے بارے میں جان کر وہ خاموش ہو گئی......

''حرا......یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ ایک دوسرے سے اتنے دور ہو گئے ہو......کہ......ایک دوسرے کی کوئی خبر ہی نہیں'' مسز فاخر نے

حیرت سے پوچھا۔

''آنٹی...... ہم ایک دوسرے کے پاس ہی کب تھے...... جواب دور ہوگئے'' حرا نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''پلیز...... شہیر کو سمجھنے کی کوشش کرو...... وہ بہت تکلیف میں ہے......'' مسز فاخر نے کہا۔

''اور...... میں؟ کیا میں خوش ہوں؟'' حرا نے آہ بھر کر پوچھا۔

''میں سب جانتی ہوں...... مگر...... شہیر کی زندگی کی خاطر...... پلیز...... اس کا ساتھ دو'' مسز فاخر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کیسے ساتھ دوں......؟ وہ میرا ساتھ چاہتا ہی نہیں...... مجھے قبول کرتا ہی نہیں...... تو...... پھر کیسے......؟'' حرا نے کہا۔

''تم جانتی ہو اس کی بلڈ رپورٹس ٹھیک نہیں آئیں......'' مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

''ک...... کیا...... ہوا؟'' حرا نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بہت زیادہ ڈرنک کرنے سے اس کے گردے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں اور گردے ٹھیک طرح سے خون فلٹر (صاف) نہیں کر رہے جس کی وجہ سے خون میں یوریا کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے...... جو دل کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے'' مسز تہمینہ نے پریشانی سے بتایا۔

''حرا کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات نمایاں ہوئے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔

''بیٹا...... میں جانتی ہوں...... شہیر تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہے مگر اس کی زندگی کی خاطر کیا تم دونوں آپس میں اختلافات ختم نہیں کر سکتے'' مسز تہمینہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''آنٹی اختلافات تب ہوتے ہیں جب آپس میں کوئی بات چیت یا کوئی تعلقات ہوں...... اور ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں'' حرا نے آہ بھر کر صاف گوئی سے بتایا۔

''حرا...... تم آگے بڑھ کر اس دوری کو ختم کرو'' مسز تہمینہ نے کہا۔

''آنٹی...... میں آپ کو کیسے سمجھاؤں...... وہ میری ذات سے...... میرے وجود سے بالکل بے خبر ہے...... میں اس کے سامنے ہوتی ہوں مگر وہ کسی اور کو دیکھ رہا ہوتا ہے...... اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو اس کے نام سے...... اور...... اگر میرے پاس آتا ہے تو اس کو سمجھ کر...... میں اس کو نہ تو دکھائی دیتی ہوں...... اور نہ ہی وہ مجھے محسوس کرتا ہے...... وہ اس لڑکی سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا ہے'' حرا نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اوہ...... تو......'' مسز فاخر پریشانی سے ہونٹ کاٹنے لگیں۔

حرا کو مزید کچھ کہنا بے کار تھا...... اس لئے وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

☆

شہیر کچھ روز ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہنے کے بعد گھر شفٹ ہو گیا..... حرا اس کے رویے اور اس کی باتوں کو بھول کر اس کی خدمت میں لگ گئی..... اس نے چندروز کے لئے ہاسپٹل سے چھٹی لی تھی اور وقت پر اس کو خوراک اور دوائیں دیتی..... مسز فاخر نے زبردستی اس کے کمرے سے ساری شراب کی بوتلیں ہٹادی تھیں..... ڈیڈی گاہے بگاہے آ کر اسے سمجھاتے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہتا..... ممی آتیں تو اسے ہدایات دیتیں..... وہ ان کی باتیں سنتا رہتا..... حرا کچھ نہ کہتی..... مگر وہ اس کو بھی سمجھتا مگر زبان سے کچھ نہ کہتا..... بس ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا..... جیسے کسی شدید الجھن کا شکار ہو..... جیسے اس کے اندر کوئی جنگ جاری ہو۔

''بہتر یہی ہے..... کہ..... تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو..... اور اپنی بیوی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو'' ارسلان کے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے..... وہ..... حرا کی طرف دیکھتا..... اپنے ذہن میں وہ نازک خیالات اور جذبات لانے کی کوشش کرتا..... جیسے وہ زل کو دیکھتے ہوئے محسوس کرتا..... انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کے اندر وہ احساسات پیدا نہیں ہو رہے تھے..... زل کے قریب جانے سے اس کے دل کی دھڑکنیں جس طرح بے ترتیب ہوتی تھیں..... حرا کے قریب جا کر بھی دل ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا تھا..... زل کو دیکھ کر اس کی آنکھیں جس طرح چمکتی تھیں..... حرا کو دیکھ کر ہمیشہ سونی ہی رہتی تھیں..... زل دور سے ہی اس کی رگ رگ میں ایسی سرشاری بھر دیتی تھی..... جو..... حرا کے بہت قریب جانے پر بھی وہ کبھی محسوس نہیں کرتا تھا۔

''شہیر..... پلیز..... اپنی زندگی کو یوں تباہ مت کرو..... اپنے آپ میں جینے کا حوصلہ پیدا کرو'' حرا اپنے آپ کو بہت سمجھا کر اس کے قریب آئی اور اس کے یخ ہاتھ کو اپنے نرم و گرم ہاتھوں میں مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔ شہیر نے اس کی جانب دیکھا..... اور دیکھتا ہی رہ گیا.....

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' حرا نے چہرے پر مسکراہٹ لا کر پوچھا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ رفتہ رفتہ زل کے سحر سے نکل کر اس کی جانب آ رہا ہو..... اس کا دیکھنا اسے خوش آئین لگا۔

''شہیر..... ہمیں اگر قسمت نے ایک دوسرے سے ملایا ہے..... تو ہمیں قسمت کے فیصلے کو قبول کر کے ایک دوسرے کو قبول کر لینا چاہیے.....'' حرا نے قدرے ملائمت سے کہا۔

شہیر توجہ سے اس کی باتیں یوں سننے لگا..... جیسے ایک ایک لفظ کو اپنی حافظے میں محفوظ کر رہا ہو..... وہ حیرت سے حرا کی جانب یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اسے بولتے ہوئے سن کر حیران ہو رہا ہو..... اور اس حیرانگی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں حرا کی باتوں کے لئے پسندیدگی بھی نمایاں ہو رہی تھی..... حرا کو اپنی باتوں کا ردعمل دیکھ کر کچھ اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔

''پلیز اپنی زندگی کو یوں ضائع مت کرو..... تم بہت ٹیلنٹڈ انسان ہو..... تم زندگی میں بہت کچھ کر سکتے ہو..... جانتے ہو تمہیں قدرت نے جتنا ٹیلنٹ دیا ہے..... وہ بہت کم لوگوں کو ملتا ہے..... یو..... آر..... اے جینئس..... تم اپنی فیلڈ میں بہت نام پیدا کر سکتے ہو..... پلیز اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو.....'' حرا نے اس کے ردعمل سے حوصلہ پا کر قدرے جذباتی انداز میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنے لب اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے..... شہیر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا..... مگر..... اس کے وجود میں کوئی حرکت اور حرارت پیدا نہ ہوئی۔

''شہیر...... پلیز...... کچھ تو کہو...... میں تمہارے دل کی آواز سننا چاہتی ہوں...... تمہاری باتیں سننے کو میرا دل چاہتا ہے...... تم میرے بارے میں کیا محسوس کرتے ہو...... میں سب جاننا چاہتی ہوں......'' حرا رفتہ رفتہ جذباتی ہو کر اس کے قریب آ رہی تھی...... شہیر نے حیرت سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے استفہامیہ انداز میں پوچھ رہا ہو۔ ''کیوں؟'' حرا نے اس کی آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔

''اس لئے...... شہیر...... کہ...... میں تمہاری بیوی ہوں...... اور تم سے محبت کرتی ہوں'' حرا نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''محبت'' کا لفظ اس کے منہ سے سن کر شہیر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے یوں نکالا جیسے کوئی بے رخی سے کسی کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے...... اور اس نے کروٹ بدل لی۔ حرا کا دل اس کے اس رویے پر دل برداشتہ ہو گیا...... اسے اپنی توہین اور ذلت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ واش روم میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ شخص اپنی محبت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے جو ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہیں...... تمہاری محبت، چاہت، خدمت، خلوص، پیار، ایثار، کچھ بھی اس کوریت کی دیوار نہیں ہٹا سکتی...... اور ایسی دیوار سے سر پھوڑ پھوڑ کر تم خود لہولہان ہو جاؤ گی...... مگر یہ تمہیں اپنے دل میں کبھی جگہ نہیں دے گا......'' حرا نے روتے ہوئے سوچا اور واش روم سے باہر نکل کر کمرے میں آ گئی...... وہ کمرے میں موجود نہیں تھا...... اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور کہیں نہ پا کر گھبرا گئی...... وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو وہ کہیں نہیں تھا...... اس نے گھبرا کر ملازمہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گاڑی لے کر باہر چلا گیا ہے مگر کہاں؟ اس کی تو حالت بہت خراب تھی...... وہ کیوں باہر گیا اور کس لیے......؟ کیا اہم کام ہو سکتا ہے؟ اس نے پریشان ہو کر اس کے موبائل پر کال کی مگر دو بیلز کے بعد اس نے حرا کی کال ریجیکٹ کر دی...... اس نے دوبارہ نمبر ٹرائی کیا تو اس نے موبائل ہی آف کر دیا...... حرا بے چین ہونے لگی اور اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے گھبرا کر فاخر حسین اور مسز فاخر کو فون کر کے بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''ڈاکٹروں نے اسے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے...... اور...... وہ کیوں باہر چلا گیا......؟'' مسز فاخر گھر آ کر پریشانی سے بولیں۔

''حرا بیٹے...... آپ کہاں تھیں؟ آپ کو تو سب معلوم تھا...... پھر آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟'' فاخر حسین نے حرا سے کہا۔

''انکل میں واش روم میں تھی اور جب میں کمرے میں آئی تو وہ جا چکے تھے......'' حرا نے آہستہ سے جواب دیا۔

مسز فاخر اور فاخر حسین اپنے اپنے موبائلز پر مختلف لوگوں سے رابطہ کر رہے تھے وہ کسی کو شہیر کے بارے میں بتا رہے تھے اور کسی کو پوچھ رہے تھے۔

اچانک شہیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا...... سب گھبرا کر باہر گیٹ کی جانب لپکے...... شہیر گاڑی سے اترا تو مسز فاخر گھبرا کر اس سے پوچھنے لگیں۔

''شہیر...... تم کہاں گئے تھے......؟ جانتے ہو ہم سب تمہارے لئے کتنے پریشان ہو رہے تھے...... اور...... تم کیوں گئے؟ ڈاکٹر نے تمہیں بیڈ ریسٹ کا کہا ہے......'' مسز فاخر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''ایک ضروری کام تھا......'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''کونسا ایسا کام تھا کہ تمہیں خود جانا پڑا...... تم ہمیں بتا دیتے...... ہم کر دیتے...... میرا پی اے ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے......'' مسز فاخر نے کہا۔

''وہ کام مجھے ہی کرنا تھا'' وہ پراطمینان لہجے میں بولا اور کہہ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سب لوگ حیرانگی سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆

ارسلان اور زل چھٹی کا دن اپنے نئے گھر میں گزارنے آئے تھے۔ گھر کا کام کافی حد تک مکمل ہو چکا تھا نیا فرنیچر بھی آ گیا تھا...... نئے پردے بھی لگ گئے تھے۔ ہر کمرے میں میچنگ کارپٹ بھی بچھ گئے تھے۔ ڈرائنگ روم اس قدر خوبصورت لگ رہا تھا کہ قدم رکھتے ہی ان کے ذوق اور فن کو خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا۔ کلر سکیم اور ڈیزائننگ میں ہر چیز منفرد اور جاذب نظر تھی...... انہوں نے زیادہ تر نیچرل چیزوں پر پینٹنگز کیں تھیں...... پام کے بڑے بڑے چوڑے پتوں پر، لکڑی کی logs پر...... فیبرک پر...... پردوں پر...... ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان گلاس وال پر...... ہر چیز بہت خوبصورت انداز میں اپنی جانب متوجہ کرتی تھی۔

''ارسلان...... ہمارا گھر کتنا خوبصورت لگ رہا ہے...... اتنا خوبصورت گھر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا......'' زل نے ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑے ہو کر گول چکر میں گھومتے ہوئے قدرے پرجوش انداز میں کہا۔

''اس لئے کہ اسے ہم نے خود خوبصورت بنایا ہے، ورنہ تمہارے پیرنٹس کا گھر اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور بڑا تھا'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... میرا گھر زیادہ خوبصورت ہے......'' زل پراصرار لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے بھئی...... تم کہتی ہو...... تو مان لیتے ہیں'' ارسلان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''جانتے ہو...... یہ کیوں خوبصورت ہے......'' زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''کیوں......؟'' ارسلان نے مسکرا کر پوچھا۔

''اس لئے...... کہ...... یہ تمہاری اور میری چاہتوں کا ''محبت کدہ'' ہے...... اور محبت تو ہمیشہ خوبصورت ہی ہوتی ہے نا......'' زل نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''مگر میں تو خوبصورت نہیں......'' ارسلان نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''کبھی میری نظر سے اپنے آپ کو دیکھو...... پھر تمہیں معلوم ہوگا...... تم کتنے خوبصورت ہو'' زل اس کے قریب آ کر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں ورنہ سامنے دیوار پر لگا آئینہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے'' ارسلان نے اسے اپنے ساتھ لگا کر دیوار پر لگے قد آدم آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''حور کے پہلو میں...... ڈیش لگ رہا ہوں نا'' ارسلان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ زل بھی ہنسنے لگی۔

''بہت بری بات...... میرے شوہر کے بارے میں ایسا کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں...... آئندہ محتاط رہنا'' زمل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''او کے...... بیگم صاحبہ...... محتاط رہوں گا'' اور دونوں ہنسنے لگے۔

اچانک گیٹ بیل بجی...... دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہاں کون آ گیا ہے......؟'' زمل نے حیرت سے پوچھا۔

''شہیر ہوگا......؟'' وہ پھر منہ بناتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ارے نہیں...... وہ تو بیچارا بیمار ہے...... اور ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ کہا ہے...... ٹھہرو...... میں دیکھتا ہوں'' ارسلان کہہ کر باہر چلا گیا اور زمل ایک پینٹنگ کو مختلف دیواروں پر لگا کر دیکھنے لگی۔ اچانک اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا کر باہر گئی۔ گیٹ کھلا تھا...... اور...... اور...... وہ...... دیکھتی ہی رہ گئی...... پھٹی پھٹی نگاہوں سے...... اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑنے لگا...... اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی...... ارسلان کی لاش آدھی گیٹ کے اندر تھی آدھی باہر...... کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔

زمل اونچی آواز سے چلانے لگی...... گھر کے در و دیوار اس کی چیخوں اور رونے کی آواز سے بری طرح لرزنے لگے اور لوگ جمع ہونے لگے۔

سپر ایجنٹ صفدر

سپر ایجنٹ صفدر، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور ناول ہے۔ مظہر کلیم کے اس ناول کا تھیم سیکریٹ سروس کے ایجنٹوں کی انفرادی کارکردگی اور صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ مظہر کلیم اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی ناول لکھ چکے ہیں جیسے ''ڈیشنگ ایجنٹ'' اور ''جولیانا مشن'' وغیرہ۔ اس بار پاکیشیا سیکریٹ سروس کے چیف ایکس ٹو نے صفدر کو ایک انتہائی خطرناک مشن سپرد کیا ہے اور وہ مشن ہے دشمن ملک کی فوجی لیبارٹری سے ایک اہم فارمولا کی چوری۔ یہ لیبارٹری بہت خطرناک صحرا کے وسط میں واقع ہے جہاں ہر وقت طوفانی ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور ان ہواؤں کو پار کر کے اس لیبارٹری تک پہنچنا ناممکن۔ صفدر کو اکیلے اس ناممکن مشن کو ممکن بنانا ہے اور خود کو سپر ایجنٹ ثابت کرنا ہے۔ کیا صفدر اپنے اس مشن میں کامیاب ہوگیا؟ کیا باقی سیکریٹ سروس محض تماشائی بنی رہی؟ کیا عمران موت سے پنجہ آزمائی کر کے صفدر کی مدد کو پہنچا؟ ان سب سوالوں کے جواب جاننے کے لئے پڑھیئے ناول ''سپر ایجنٹ صفدر''۔

''**سپر ایجنٹ صفدر**'' کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۴)

ڈاکٹر محسن زیدی نے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ڈاکٹر دانش کے اعزاز میں پر تکلف عشائیے کا اہتمام کیا تھا۔عشائیے سے قبل ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس بھی کی گئی تھی جس میں ڈاکٹر محسن زیدی کے علاوہ ملک کے نامور سرجن ڈاکٹروں نے ڈاکٹر دانش کی خدمات کو بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔کئی وزراء کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ڈاکٹر دانش اسٹیج پر بیٹھے تھے اور اپنے بارے میں بھرپور تعریفی کلمات سن کر ان کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہیں تھیں اور ان کا سر فخر سے تن رہا تھا۔ان کے اندر شدید احساس برتری کے جذبات جنم لے رہے تھے۔اس وقت انہیں اپنے جیسا پوری دنیا میں کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اپنے بارے میں اتنی بڑائی اور اتنی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔میڈیا سے وابستہ لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ہر کیمرہ مین نے ڈاکٹر دانش کے چہرے پر کیمرہ فوکس کر رکھا تھا اور وہ مختلف زاویوں سے ان کی تصاویر لے رہے تھے۔مگر کسی بھی صحافی کو ڈاکٹر دانش سے کسی بھی قسم کا سوال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی تاکہ کوئی سوال انہیں ذاتی طور پر پریشان نہ کر دے اور ڈاکٹر زیدی ان کی ذہنی صحت کے بارے میں بہت کو نشنس تھے۔ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر رمیض اور ڈاکٹر دریہ رمیض اس پریس کانفرنس میں صحافیوں کے مختلف سوالات کے جوابات دے رہے تھے اور سب کو یہی بتایا گیا کہ ڈاکٹر دانش اتنا عرصہ انگلینڈ میں ایک ریسرچ کے سلسلے میں مصروف رہے۔صحافی اس ریسرچ کے بارے میں جاننا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر زیدی نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ وہ کسی اور وقت اسپیشل کانفرنس میں اس ریسرچ کے بارے میں بتائیں گے۔ابھی کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر دانش کو بھرپور پروٹوکول دیا گیا۔ان کی بہت عزت افزائی کی گئی اور کھانے کے دوران سب ان کو ان کی کامیابیوں پر بھرپور مبارکباد دیتے رہے۔ڈاکٹر دانش بہت خوش تھے اور ان کو خوش دیکھ کر ڈاکٹر رمیض اور ڈاکٹر زیدی بہت خوش ہو رہے تھے کہ ان کی اتنی جدوجہد رنگ لا رہی تھی۔وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ایک مایوس شخص کو زندگی کی طرف واپس لائے تھے۔

ٹی وی نیوز میں اس پریس کانفرنس کی کوریج دکھائی جا رہی تھی۔اچانک فریحہ نے ٹی وی آن کیا تو ڈاکٹر دانش کے بارے میں نیوز رپورٹ بتائی جا رہی تھی۔فریحہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔وہ ڈاکٹر دانش کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی جو خوشی سے چمک رہا تھا ان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ان کی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔

''مکار شخص......''فریحہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ٹی وی آف کر کے ریموٹ غصے سے صوفے پر پھینکا۔

''کیا ہوا بی بی......تم نے ٹی وی کیوں بند کر دیا......کون آ رہا ہے ٹی وی پر...... جسے دیکھ کر تم غصے میں آ گئی ہو''اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی نہیں......''اور فریحہ نے دوبارہ ٹی وی آن کر دیا، نیوز ابھی تک جاری تھی۔

''ملک کے تمام نامور ڈاکٹروں نے ڈاکٹر دانش کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا اور ان کی ملک واپسی کو خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ ملک وقوم کو ان جیسے قابل فخر ڈاکٹر اور سائنسدان کی بہت ضرورت ہے۔ان کی خدمات انسانیت کے لئے نا قابل فراموش ہیں'' فریحہ کا خون غصے سے کھولنے لگا اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کاش کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ انسان کس قدر کریہہ اور مکار ہے......جس کے سینے میں دل نہیں......پتھر ہے......جو اپنے بیٹے کو انسان نہیں سمجھتا وہ دوسروں کو کیا سمجھے گا......جس کو لالچ، ہوس اور حسد نے اندھا کر دیا ہو......وہ انسانیت کی کیا خدمت کرے گا، کیسے ان کے درد کو محسوس کرے گا۔

''کاش......کوئی تو اس کے بدصورت چہرے سے نقاب ہٹائے'' فریحہ سوچتی رہی اور اندر ہی اندر کرب سے بلبلاتی رہی......اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بری طرح سسکنے لگی۔

☆

ڈاکٹر دانش پر اچانک قسمت مہربان ہوئی تھی۔ان کے حالات ایک دم بدل گئے تھے۔ملک میں واپس آتے ہی انہیں اتنی پذیرائی ملی تھی کہ ڈاکٹر دانش کو اس کی بالکل ہی توقع نہ تھی۔وہ انگلینڈ میں جتنا عرصہ مقیم رہے تھے انتہائی ڈپریشن اور ذہنی اذیت نے ان کو بہت مایوس اور بددل کر دیا تھا۔زندگی میں انتہائی جدوجہد سے حاصل کی گئی کامیابیاں انہیں انتہائی ارزاں محسوس ہونے لگی تھیں۔اپنی ہر خوبی اور صلاحیت بے وقعت لگتی تھی۔ہر چیز بے معنی ہوگئی تھی۔انہیں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ زندگی کے آخری ایام انتہائی بے بسی سے گزارنے پر مجبور تھے۔انہیں نہ زندگی میں دلچسپی رہی تھی اور نہ ہی اس کی سرگرمیوں سے......مگر......ملک واپس آتے ہی ان کے حالات ایسے بدلے تھے کہ وہ ایک بار پھر ایک ہی جست میں بہت اوپر بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔میڈیا نے ان کو ایسی زبردست کوریج دی تھی کہ وہ خود بھی بوکھلا گئے تھے۔انہوں نے بڑی محنت اور جدوجہد سے ایک مایہ ناز سرجن کی حیثیت سے نام بنانے کی کوشش کی تھی اور اب قدرت نے ان کی سوچوں سے بھی زیادہ ان کو وہ مقام عطا کر دیا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا......انہیں ایک ہیرو کی طرح خوش آمدید کہا گیا تھا۔ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ کی کوششوں نے ان کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے اور ڈاکٹر محسن زیدی و ڈاکٹر رمیض نے ان کے لئے ایسی ہموار زمین تیار کی تھی جس پر اب وہ سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ڈاکٹر محسن زیدی نے انہیں اپنے ہاسپٹل میں اعزازی جاب دی تھی اور ڈاکٹر رمیض کے گھر وہ زبردست پروٹوکول کے ساتھ ایک مہمان کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔وہ بہت خوش تھے۔سارا دن ہاسپٹل میں لوگ ان سے ملنے آتے۔ان کی کامیابیوں کی تعریفیں کرتے۔دوبارہ ریسرچ شروع کرنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔وہ سارا وقت اپنے بارے میں تعریفیں سن سن کر پھولے نہ سماتے۔خوبصورت پھولوں کے گلدستے، مٹھائیاں، کیک اور کارڈز سے ان کا کمرہ بھرا رہتا اور وہ سب کچھ دیکھ کر مسکراتے رہتے۔

''میں یہ سب کچھ ڈیزرو کرتا تھا مگر ان لوگوں کو بہت دیر سے احساس ہوا ہے......انہیں مجھ جیسا اور کوئی ٹیلنٹڈ انسان بھلا کہاں سے مل سکتا تھا'' ڈاکٹر دانش کے ذہن میں اپنے بارے میں ایسی ایسی باتیں آتیں جن کو سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دیتے......

ڈاکٹر محسن زیدی، ڈاکٹر رمیض اور چند دوسرے نیورو سرجنز ڈاکٹر دانش کے کمرے میں موجود تھے اور ان سے ان کے فیوچر پلانز کے بارے میں ڈسکشن کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر دانش...... سنا ہے انگلینڈ میں آپ ایک ریسرچ کے سلسلے میں بہت مصروف تھے...... اور ڈاکٹر زیدی نے ایک خاص پریس کانفرنس میں اس ریسرچ کے بارے میں انکشاف کرنے کو کہا ہے...... کیا وہ بہت خاص قسم کی ریسرچ ہے؟'' ایک سینئر ڈاکٹر مجتبیٰ نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ...... ہے...... میں...... میں...... جلد ہی'' ڈاکٹر دانش ایک دم بوکھلا گئے۔

''یہ ایک سیکرٹ ہے...... ابھی آپ اس کے بارے میں ڈسکس نہ کریں تو بہتر ہے'' ڈاکٹر زیدی نے ڈاکٹر دانش کی بوکھلاہٹ بھانپتے ہوئے کہا۔

''آئی...... سی...... لیکن آپ نے کس کو فوکس کیا ہے؟'' ڈاکٹر مجتبیٰ نے پھر پوچھا۔

''برین کے ابنارمل پارٹس کو...... جو کسی نہ کسی وجہ سے damage ہو جاتے ہیں اور انسان میں ابنارملٹی کا باعث بنتے ہیں'' ڈاکٹر رمیض نے جلدی سے اپنی ریسرچ کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رمیض کو غصے سے دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

''وری گڈ...... یہ تو بہت زبردست ریسرچ ہوگی اگر آپ نے کچھ ایسا کر دیا تو آپ انسانیت کی بہت بڑی خدمت کریں گے...... روز بروز ابنارمل بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے...... اٹ ول بی اے ونڈر فل اچیومنٹ (یہ ایک زبردست کامیابی ہوگی) ڈاکٹر مجتبیٰ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے...... کافی ٹائم ہو گیا ہے'' ڈاکٹر مجتبیٰ نے اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

''آپ لوگ مجھے دوسروں کے سامنے کیوں بے عزت کرنا چاہتے ہیں...... مجھے شک ہونے لگا ہے کہ آپ لوگوں نے میرے بارے میں کوئی خاص سازش کی ہے...... میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے...... ضرور اس کے پیچھے آپ لوگوں کا کوئی فائدہ ہے...... ورنہ یونہی تو کوئی کسی کے لئے اتنا کچھ نہیں کرتا...... ہر انسان مفاد پرست ہے'' ڈاکٹر دانش نے غصے سے ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا تو وہ دونوں چونک گئے اور حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

''ڈاکٹر دانش...... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں...... ہمیں بھلا آپ سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے...... ہم تو...... آپ کو......'' ڈاکٹر زیدی نے حیرت سے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں...... زیدی تم کیا تھے اور اب کہاں کھڑے ہو......؟ یہ سب کچھ تم نے یونہی تو حاصل نہیں کر لیا......'' ڈاکٹر دانش نے خفگی سے کہا تو ڈاکٹر زیدی کے چہرے پر ایک دم پسینہ آ گیا اور شرمندگی سے اُن کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''سر...... پلیز...... ڈاکٹر زیدی بہت مخلص انسان ہیں اور آپ ان کی نیت پر شک نہ کریں'' ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر زیدی کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے سمجھانے والے......اور......تمہاری اوقات ہی کیا ہے......میرے سامنے......جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ڈاکٹری سیکھے ہوئے اور اپنی بے کار ریسرچ کا کریڈٹ مجھے دے رہے ہو......ڈاکٹر دانش کا یہ calibre نہیں کہ وہ تمہاری معمولی ریسرچ کا سہارا لے کر دنیا میں اپنا نام پیدا کرے......ڈاکٹر دانش کو کسی معمولی نام اور سہارے کی ضرورت نہیں......تم لوگ میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا چاہتے ہو......مگر......میں......میں......'' ڈاکٹر دانش غصے سے ہانپر ہو کر ایک دم کرسی پر گر گئے۔ ان کے منہ سے رال بہنے لگی، کندھے اور جسم اکڑنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگے۔

''اوہ......مائی گاڈ......ڈاکٹر رمیض ان کا کوٹ اتاریں اور انجکشن لے کر آئیں......جلدی جائیں'' ڈاکٹر زیدی نے جلدی سے ڈاکٹر دانش کی نبض چیک کی اور ان کا بلڈ پریشر چیک کیا۔

ڈاکٹر رمیض نے جلدی سے ان کا کوٹ اتارا اور انجکشن لگایا......ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ کرسی کی پشت پر سر لگا کر ریلیکسڈ ہونے لگے اور آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر زیدی نے ہمدردانہ انداز میں ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر رمیض......یہ ابھی بھی بیمار ہیں......ہمیں بہت محتاط ہو کر ان کے سامنے بات چیت کرنی ہوگی'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''رائٹ سر......ورنہ کچھ دیر پہلے مجھے بھی ان پر غصہ آ رہا تھا......لیکن اب......'' ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر کہا اور خاموش ہو گئے۔

''انہیں ریسٹ کی ضرورت ہے......آپ انہیں روم میں شفٹ کر دیں......ہوش آنے پر میں انہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دوں گا'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆

نذیر حسین خلاف معمول رات کو جلد گھر لوٹ آیا تو زینب اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر کمرے سے باہر نکلی۔ دروازے کا ایک پٹ بند تھا اور ایک کھلا تھا۔ وہ بری طرح بند دروازے سے ٹکرائی۔ نذیر حسین نے آگے بڑھ کر اس کو تھاما۔

''تو......کیوں باہر آ گئی......میں تیرے پاس ہی آنے لگا تھا'' نذیر حسین قدرے خفگی سے بولا۔

''تم......آج......جلدی کیوں آ گئے......؟ کیا اس کی کوئی خبر ملی ہے؟'' زینب نے جلدی سے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......ہاں بتاتا ہوں......پہلے تو......ادھر چارپائی پر بیٹھ'' نذیر حسین نے اس کا بازو تھام کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔

''جلدی سے بتا......وہ کہاں ہے؟'' زینب خوش ہو کر بولی۔

''یہ میں اخبار لایا ہوں......اس میں اس کی فوٹو چھپی ہے......بڑے شہر میں......بہت بڑا ڈاکٹر بابو بن گیا ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی عزت دی ہے......بہت بڑا آدمی بن گیا ہے......سنا ہے......باہر کے کسی ملک چلا گیا تھا......اب واپس آیا ہے......کاش تو دیکھ سکتی تو اس اخبار کو دیکھتی اس کی کتنی بڑی تصویر اس میں لگی ہے'' نذیر حسین فرط جذبات سے خوش ہو کر بولا۔

''لا......مجھے......دکھا......کدھر ہے......اس کی تصویر......میں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھوں گی'' زینب نے نذیر حسین کے ہاتھوں کو

ٹٹولتے ہوئے کہا۔

نذیر حسین نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اخبار کو کھولا اور اس کی تصویر پر زینب کے ہاتھ رکھ دیئے۔ زینب نے اپنے ہاتھ اس کی تصویر پر پھیرے اور خوش ہو کر اس کی تصویر کو چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نذیر حسین کی آنکھیں بھی بھر نے لگیں۔

''نذیر حسین...... مجھے اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے...... خدا کے لئے مجھے مرنے سے پہلے ایک بار اس سے ملا دو...... میں صرف ایک بار اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں'' زینب نے ایک ہاتھ سے اس کی تصویر کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا اور دوسرے ہاتھ سے نذیر حسین کا ہاتھ پکڑ کر التجا کرنے لگی۔

''اچھا...... اچھا...... جاؤں گا...... کسی روز'' نذیر حسین نے یوں کہا...... جیسے وہ ظاہری طور پر نہ جانتا ہو مگر اندرونی طور پر خود بھی اس سے ملنے کے لئے بے تاب ہو۔

''کسی روز...... نہیں...... کل...... صبح ہی اس سے ملنے جاؤ...... میں اب اور جدائی برداشت نہیں کر سکتی...... تمہیں کیسے اپنا دل کھول کر دکھاؤں...... تم اس کو جا کر بتانا کہ اس کی جدائی میں اس کی ماں کی آنکھیں سفید ہو گئی ہیں...... ایک بار وہ ملنے آ جائے گا...... تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی'' زینب نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا...... کہا نا...... چلا جاؤں گا...... ہاتھ میں چار پیسے تو آ جائیں...... بڑے شہر میں کرائے پر ہی بہت زیادہ خرچ ہو جاتا ہے'' نذیر حسین نے اداس لہجے میں کہا۔

''یہ...... میرے سرہانے کے نیچے کچھ پیسے ہیں...... آج چھوٹو آیا تھا...... کہنے لگا اماں...... تیرے علاج کے لئے کمیٹی ڈالی تھی۔ آج ہی نکلی ہے تو تجھے دینے آیا ہوں'' زینب نے چارپائی پر سرہانہ ٹٹول کر نیچے سے پیسے نکال کر نذیر حسین کو پکڑائے۔

''کتنے ہیں؟'' نذیر حسین نے پیسے گنتے ہوئے پوچھا۔

''دو...... ہزار......'' اس نے پیسے گن کر کہا۔

''تو...... ان پیسوں سے شہر چلا جا...... میں علاج پھر کرا لوں گی'' زینب نے جلدی سے کہا۔

''زینبے...... تو...... نہیں جانتی...... چھوٹو نے یہ پیسے کتنی مشکل سے اکٹھے کیے ہیں...... قدرت نے اس کے ساتھ بھی عجیب مذاق کیا ہے اس کو اتنا چھوٹا وجود دیا ہے...... جس کو سرعام ذلیل کیا جاتا ہے...... سارا دن سرکس کے پنجرے میں وہ بند رہتا ہے۔ اس پر سرکس کے مالک نے ٹکٹ لگائی ہوئی ہے لوگ اس کے پنجرے کے پاس آ کر قہقہے لگاتے ہیں۔ آوازیں کستے ہیں...... اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر کے ان کو ہنساتا ہے اور پھر رات کو مالک اسے چند روپے دیتا ہے۔ ان روپوں سے اس نے کمیٹی ڈالی تھی...... یہ اس کی بڑی محنت کی کمائی ہے...... میں کیسے یونہی کرائے میں اسے اڑا دوں'' نذیر حسین اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے بارے میں انتہائی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''چھوٹو...... سرکس میں یہ سب کرتا ہے...... تو نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا...... یہی کہتا تھا کہ وہ سرکس میں کام کرتا ہے...... میرا بچہ اتنی مشکل

سے پیسہ کماتا ہے" زینب سسکنے لگی۔

"شاید...... آج بھی نہ بتاتا...... اگر وہ تجھے یہ پیسے نہ دے کر جاتا...... زینے میں نے اسے رات رات بھر آہستہ آہستہ چپکے چپکے روتے اور سسکتے ہوئے سنا ہے...... مجھے اکثر کہتا ہے...... ابا...... سچ بتا...... تو نے مجھے کہاں سے اٹھایا...... تیری ساری اولاد تو ٹھیک ٹھاک ہے پھر میں ہی ایسا کیوں ہوں...... میں اسے کیا جواب دوں...... کیا کہوں......؟ کہ تو رب کی نشانی ہے اور اس کے فیصلوں میں تیرا...... میرا...... کیا دخل؟ وہ جو چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے...... پیدا کرتا ہے...... انسان کی اس کے سامنے اوقات ہی کیا ہے؟ مگر وہ میری باتوں کو نہیں سمجھتا...... روتا ہی چلا جاتا ہے" نذیر حسین ان پیسوں کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا کر سسکنے لگا۔

"ہاں...... مولا کے بھی عجیب ہی رنگ ہیں...... ایک کو ساری اولاد میں اتنا عقلمند اور بڑا آدمی بنا دیا کہ وہ بھی ہم سے پوچھتا ہے کہ ہم نے اسے کہاں سے لیا...... اور...... چھوٹو کو اتنا چھوٹا بنا دیا ہے کہ وہ بھی یہی سوال کرتا ہے...... ہم تو 'سوال' ہی بن کر رہ گئے ہیں" زینب نے تاسف سے کہا اور دونوں رونے لگے۔

"نذیر حسین...... خدا کے لئے تو چھوٹو کو ان پیسوں کے بارے میں مت بتانا...... بس کہنا کہ علاج کے لئے سنبھال کر رکھے ہیں...... مگر تو اس کو ملنے چلا جا...... صبح سویرے ہی نکل جا" زینب نے جلدی سے کہا۔

"مگر...... میں اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا؟" نذیر حسین نے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

"لے...... یہ بھی کوئی مشکل کام ہے...... تو اخبار لے کر کسی بھی بڑے اسپتال چلے جانا...... وہاں کسی کو میرے بیٹے کی فوٹو دکھانا...... سب تجھے اس کے بارے میں بتا دیں گے...... وہ اتنا بڑا آدمی بن گیا ہے...... ہر کوئی اسے پہچانتا ہوگا" زینب نے قدرے مسکرا کر فخریہ انداز میں کہا تو نذیر حسین کو اس کی تجویز پسند آئی اور وہ مسکرانے لگا۔

"ہاں...... یہ تو نے ٹھیک کہا ہے...... میں کل ہی چلا جاؤں گا" نذیر حسین نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"سن...... وہ نیا سوٹ پہن کر جانا...... جو تو نے عید پر سلایا تھا" زینب نے رائے دی۔

"اری...... وہ تو بہت پرانا لگتا ہے...... دیکھتا ہوں جو ٹھیک لگتا ہے وہی پہن جاؤں گا" نذیر حسین اٹھ کر ایک پرانے لوہے کے صندوق میں سے کپڑے نکالنے لگا۔

"دیکھنا...... اچھا جوڑا پہن کر جانا...... تو بہت بڑے آدمی سے ملنے جا رہا ہے...... اللہ کرے وہ بس ایک بار تیرے ساتھ آ جائے...... نذیرے...... اس کو ساتھ لے کر ہی آنا...... اس کے بغیر مت آنا......" زینب نے کہا۔

"تو بھی پاگل ہے...... وہ بڑا آدمی ہے...... اور اس کے اپنے بڑے کام کاج ہوں گے...... ان کو چھوڑ کر وہ کیسے آئے گا......؟" نذیر حسین نے ایک جوڑا نکال کر اسے اچھی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو...... بھلا...... کام کاج اسے 'ماں' سے بڑھ کر پیارے ہوں گے۔ اس کو کہنا...... سب کام چھوڑ...... اور...... ماں کو ملنے چل......" زینب

نے قدرے بارعب انداز میں کہا۔

نذیر حسین رک گیا اور ٹھٹھک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے کچھ یاد آنے لگا۔ آخری بار جب وہ ان سے ملنے آیا تھا۔

''میرا......تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ...... مجھے ہمیشہ اپنے اور تمہارے رشتے سے نفرت محسوس ہوتی ہے......تم لوگ میرے لئے مر چکے ہو......اور......میں تمہارے لئے'' اس کے تلخ الفاظ نذیر حسین کے کانوں میں گونجنے لگے۔

اس نے کپڑے صندوق میں واپس رکھے اور زینب کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور اسے پیسے پکڑائے۔

''یہ کیا ہے......تم مجھے پیسے کیوں واپس کر رہے ہو؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں نہیں جا رہا'' نذیر حسین نے بمشکل کہا۔

''کیوں......؟'' زینب نے غصے سے کہا۔

''ہم اس کے لئے مر چکے ہیں......اس نے آخری بار یہی کہا تھا......کیا یاد نہیں تمہیں......؟'' نذیر حسین سسکنے لگا اور روتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ زینب اسے آوازیں دیتی رہ گئی مگر وہ جا چکا تھا زینب بھی رونے لگی اس کے کانوں میں بھی وہی الفاظ گونجنے لگے۔

''تم میرے لئے مر چکے ہو......اور......میں تمہارے لئے'' زینب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

☆

ڈاکٹر دریہ اور ڈاکٹر رمیض اپنے اپنے کلینک سے فارغ ہو کر رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ ڈاکٹر دریہ کا شمار شہر کی بہترین گائنا کالوجسٹ میں ہونے لگا تھا اور ڈاکٹر رمیض نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت کم عرصے میں زبردست شہرت اور کامیابی حاصل کر لی تھی۔ دونوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن پر قدرت خاص طور پر مہربان ہوتی ہے۔ وہ جہاں قدم رکھتے ہیں۔ وہیں پھول کھلنے لگتے ہیں جس شے کو ہاتھ لگاتے ہیں وہی سونے کی بن جاتی ہے۔ دولت و شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رمیض بہت نیک، خدا ترس اور انسانیت کی خدمت کرنے والے انسان تھے۔ ڈاکٹر دریہ بھی انہی خیالات کی مالک تھی اور ڈاکٹر رمیض کی کولیگ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے میں سوچ کی ہم آہنگی پا کر ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور دونوں اپنے اس فیصلے پر بہت خوش تھے۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا بہت خیال رکھتے تھے اور دونوں کو آئیڈیل کپل سمجھا جاتا تھا گو کہ دونوں بے حد مصروف زندگی گزار رہے تھے مگر پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر رمیض کے والدین گاؤں شفٹ ہو گئے تھے اور ڈاکٹر رمیض نے گاؤں میں ایک ویلفیئر ٹرسٹ قائم کیا تھا جس کا نگران انہوں نے اپنے والد کو بنایا تھا اور پندرہ دن بعد دونوں میاں بیوی گاؤں چلے جاتے اور وہاں کے غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے......ڈاکٹر دانش ان کے گھر میں ایک بہت باعزت مہمان کے طور پر رہ رہے تھے اور ان کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کے لئے خصوصی طور پر ایک نوجوان ملازم ساجد رکھا گیا تھا جو ان کا بہت خیال رکھتا۔ گھر میں شیف کے علاوہ اور دو تین ملازم رکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر رمیض......ڈاکٹر دانش سے بہت محتاط انداز میں گفتگو کرتے۔ ان کی صحت اور آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ ڈاکٹر دانش زیادہ تر اپنے ریسرچ

پیپرز اور کمپیوٹر پر کام کرنے میں مصروف رہتے۔ رات کو کلینک سے واپس آ کر ڈاکٹر رمیض...... ڈاکٹر دانش کے ساتھ اپنی ریسرچ کے بارے میں ڈسکشن کرتے۔ ڈاکٹر رمیض نے اپنے اس نئے گھر کی انیکسی میں اپنی ریسرچ لیب بنا رکھی تھی جہاں وہ اپنے فارغ وقت میں بیٹھ کر ریسرچ کرتے۔

ڈاکٹر دریہ اور ڈاکٹر رمیض کھانا کھانے میں مصروف تھے اور دونوں کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش اچانک اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر ایک دم چونکے...... دونوں قدرے بے تکلفانہ انداز میں کھانا کھا رہے تھے ان کو دیکھ کر ڈاکٹر دانش کے اندر ایک دم کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹی اور دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب دیکھ کر ان سے حسد محسوس ہونے لگا۔ نفرت اور حسد سے ایسا اضطراب جنم لینے لگا جس سے ان کے دل و دماغ میں اک آگ سی بھڑ کنے لگی۔ وہ بہت بے قرار ہونے لگے اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس چلے گئے۔ انہیں فریحہ یاد آنے لگی۔ وہ بھی ان سے محبت کے دعوے دار تھی مگر وہ بہت بے وفا نکلی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اسے ان سے نفرت ہونے لگی تھی...... وہ ان کی صورت سے، ان کی باتوں اور ان کے وجود سے نفرت کرنے لگی تھی...... یقیناً اس کے دل میں کوئی اور بس گیا تھا۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے...... اس پر کبھی بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے...... شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ دل لگا بیٹھتی ہے...... وہ شوہر کو کس قدر آسانی سے دھوکہ دیتی ہے'' ڈاکٹر دانش نے نفرت سے فریحہ کے بارے میں سوچا اور ان کا دماغ غصے سے کھولنے لگا۔

باہر سے دریہ اور ڈاکٹر رمیض کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ کسی بات پر بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش کو غصہ آنے لگا۔ ان کے قہقہے ان کے کانوں میں کسی نشتر کی طرح چبھنے لگے۔ قہقہوں کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور ڈاکٹر دانش کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

''آپ کے یہ بے ہنگم قہقہے مجھے کتنا ڈسٹرب کر رہے ہیں کیا آپ کو اس کا اندازہ ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے کمرے سے باہر نکل کر انتہائی غصے میں اونچی آواز سے چلاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رمیض اور دریہ ایک دم ساکت ہو گئے اور انتہائی حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے...... دونوں یوں خاموش اور پریشان ہو گئے جیسے اچانک کسی چوری کے پکڑے جانے پر کوئی حیران و پریشان ہو جاتا ہے...... دونوں چور نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

''سوری...... سر......'' ڈاکٹر رمیض نے ان کے قریب آ کر کہا تو ڈاکٹر دانش نے انہیں انتہائی خونخوار نگاہوں سے دیکھا اور کمرے میں واپس چلے گئے۔

''رمیض...... یہ سب کیا ہے؟'' دریہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''غلطی ہماری ہی ہے...... ہمیں خیال ہی نہیں رہا کہ اس گھر میں ایک مہمان بھی رہتا ہے...... جو بیمار بھی ہے اور......'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''رمیض...... کیا ہم اپنے گھر میں اپنی مرضی سے ہنس بول بھی نہیں سکتے...... سارا دن مریضوں کے ساتھ سر کھپا کر گھر آئیں تو گھر میں چند لمحے بھی اپنی مرضی سے نہ گزار پائیں تو پھر ہم کہاں جائیں...... اوہ...... مائی گاڈ......'' دریہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا اور سسکنے لگی۔

''چلو......اپنے بیڈروم میں چلتے ہیں......اٹھو......سویٹ ہارٹ'' ڈاکٹر رمیض نے محبت سے دریہ کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا اور وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ ڈاکٹر رمیض نے دریہ کو محبت سے سمجھا بجھا کر نارمل کیا اور ڈاکٹر دانش سے ایکسکیوز کرنے ان کے کمرے میں چلے گئے۔

ڈاکٹر دانش کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رمیض نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا پا کر وہ اندر چلے گئے۔ ڈاکٹر دانش نے خشمگیں نگاہوں سے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا۔

''آئی ایم سوری......سر......آپ ہماری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے'' ڈاکٹر رمیض نے شائستہ لہجے میں قدرے ادب سے کہا۔

''اٹس آل رائٹ'' ڈاکٹر دانش نے قدرے درشت لہجے میں جواب دیا ڈاکٹر رمیض کو ان کے رویے سے دکھ سا محسوس ہونے لگا۔

''سر......آپ......؟'' ڈاکٹر رمیض نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

''ادھر بیٹھیے ڈاکٹر رمیض......'' ڈاکٹر دانش نے اپنی نظر کی عینک اتارتے ہوئے کہا اور انہیں اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ ڈاکٹر رمیض بیٹھ گئے اور قدرے حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

''ڈاکٹر رمیض......عورت پر کبھی بھروسہ نہ کریں......وہ بہت چالاک اور مکار ہوتی ہے۔ اس کے دل میں کوئی اور ہوتا ہے......اور محبت کے دعوے وہ کسی اور سے کرتی ہے......وہ اپنے شوہر کے ساتھ کبھی بھی مخلص نہیں ہوتی......اس کا شوہر اس کے لئے محض دل بہلاوا ہے اور کچھ نہیں......شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی اور سے دل لگا بیٹھتی ہے......آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ مخلص نہیں......اور میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں'' ڈاکٹر دانش نے اس قدر وثوق سے کہا تو ڈاکٹر رمیض چونک گئے۔

''کیسا ثبوت......؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ سے بے وفائی کا......وہ آپ کے ساتھ محض دل بہلا رہی ہیں۔ اچھا وقت گزار رہی ہیں......آپ ان کے لئے کچھ بھی نہیں......صفر ہیں بالکل......'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ڈاکٹر رمیض کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرے پر نجانے کتنے سائے لہرانے لگے۔

''دریہ......ایسی نہیں......وہ ایسا نہیں کر سکتی'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے روہانسی آواز میں کہا۔

''فریحہ بھی ایسی نہیں تھی......مگر وہ بھی ویسی ہی نکلی'' ڈاکٹر دانش زیر لب بڑبڑائے۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

''وہ محبت کا دعویٰ مجھ سے کرتی تھی اور اولاد کسی اور کی پیدا کی......جانتے ہو......اس نے ایک ابنارمل بچے کو جنم دیا......کیا تم سوچ سکتے ہو کہ مجھ جیسے جینئس انسان کا بچہ بھلا ابنارمل ہو سکتا ہے......؟ امپاسبل......اس نے مجھے دھوکہ دیا......اور قدرت نے اس کو عذاب میں ڈالا......میں نے اس کو چھوڑ دیا......وہ اسی قابل تھی'' ڈاکٹر دانش غصے سے بولے۔

''مگر......وہ......تو......بہت حساس اور سمجھدار معلوم ہوتی تھیں'' نادانستہ ڈاکٹر رمیض کے منہ سے نکلا۔

''کیا تم فریحہ سے ملے تھے؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

''کیوں......؟''

''یونہی...... آپ کی آمد کی اطلاع دینے گیا تھا......''

''نان سینس...... تم بہت نان سینس انسان ہو...... مجھ سے ایک بار تو پوچھ لیتے کہ میں اس سے ملنا بھی چاہتا ہوں کہ نہیں......'' ڈاکٹر دانش غصے سے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

''آئی ایم سوری......'' ڈاکٹر رمیض آہستہ آواز میں بولے۔

''تم اس قدر بیوقوف ہو سکتے ہو...... مجھے اندازہ نہیں تھا۔ نجانے تم کیسے ڈاکٹر بن گئے۔ عقل تو تم میں رتی بھر نہیں'' ڈاکٹر دانش نے اس قدر طنزیہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر رمیض حیران رہ گئے، انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔

''سر...... عقل...... کسی کی میراث نہیں ہوتی...... یہ قدرت کی عطا ہوتی ہے...... جسے چاہے نواز دے'' ڈاکٹر رمیض نے خفگی سے کہا۔

''ہاں...... اسی بات پر تو حیرانگی ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو ظاہری طور پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں مگر ان کا دماغ عقل سے بالکل خالی ہوتا ہے...... انہیں معمولی باتوں کی بھی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی'' ڈاکٹر دانش نے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اور جن کو عقل مند ہونے کا زعم ہوتا ہے...... وہ کتنے خود بین اور متکبر ہوتے ہیں...... شاید انہیں خود بھی اندازہ نہیں ہو پاتا...... کیونکہ انہیں اپنے سوا کوئی اور نہ تو اہم لگتا ہے نہ اس قابل دکھائی دیتا ہے'' ڈاکٹر رمیض نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر رمیض...... یہ کمتر اور بے وقوف لوگوں کا حسد ہوتا ہے جو ایسے عقلمند لوگوں کو متکبر کہتے ہیں۔ دراصل وہ اس طرح کی باتیں کر کے اپنے کومپلیکس چھپا رہے ہوتے ہیں...... عام اور معمولی لوگوں کے کومپلیکس بھی تو بہت ہوتے ہیں نا'' ڈاکٹر دانش نے پھر کہا۔

''کتنی حیرت کی بات ہے کہ بہت سے کومپلیکسڈ لوگوں کو اپنے کومپلیکس نظر نہیں آتے مگر دوسروں کا معمولی پن کتنی جلدی دکھائی دیتا ہے...... یہ تکبر نہیں تو اور کیا ہے؟'' ڈاکٹر رمیض نے غصے سے جواب دیا۔

''کم عقل لوگوں کو بات سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے...... ان کے دماغ میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اعلیٰ درجے کی بات کو قبول کر سکیں، عام، کند ذہن لوگوں کے بارے میں ٹھیک کہا گیا ہے to cast pearl before the swine (بھینس کے آگے بین بجانا)...... مسٹر رمیض...... آپ جسے تکبر سمجھتے ہیں وہ اعلیٰ درجے کے انسان کی elevation ہوتی ہے جسے آپ جیسے لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ آپ جائیے اور اپنی بے وفا...... مکار بیوی کے ساتھ محبت کا ڈرامہ رچایئے...... وہ آپ کا دل بہلائے اور آپ اس کا...... مگر اس ڈرامے کو محبت نہ سمجھ لیجئے گا...... وہ بہت شاطر عورت ہے اس کا ذہن آپ سے زیادہ تیز اور متحرک ہے۔ گڈ نائٹ'' ڈاکٹر دانش نے کمرے کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر رمیض کو باہر جانے کو کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے غصے سے ان کی جانب دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان کے دل و دماغ میں آتش فشاں ابل رہا تھا اور لاوا پھٹنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہونے لگیں اور دل انتہائی توہین اور بے عزتی کے احساس سے سلگنے لگا وہ اسٹڈی روم میں چلے گئے اور وہاں جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ نجانے کہاں سے آنسو ان کی آنکھوں سے لاوے کی طرح بہنے لگے "ڈاکٹر دانش کس قدر کریہہ انسان ہیں...... انہیں اب یقین آنے لگا تھا۔ فریحہ نے ٹھیک کہا تھا...... وہ ایک مکار انسان ہے" مگر اب انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ مکار ہی نہیں انتہائی رزیل انسان بھی ہیں۔ اس قدر زعم، تکبر، خود بینی اور خود غرضی انہوں نے آج سے قبل کسی انسان میں نہیں دیکھی تھی...... وہ انہیں کیا سمجھتے تھے اور وہ حقیقت میں کیا تھے...... دریہ کو انہوں نے بے وفا کہا تھا اور ان کے پاس اس کا ثبوت بھی تھا کیسا ثبوت؟ اور ان کے پاس کہاں سے ثبوت آ گیا؟ کیا دریہ واقعی ہی ایسی تھی؟ وہ اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ دونوں نے چند ماہ اکٹھے جاب کی تھی اور دونوں میں انڈرسٹینڈنگ ہو گئی تھی اور دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد دونوں خوش تھے۔ ڈاکٹر دانش نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی۔ ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے...... ضرور اس کے پیچھے بھی کوئی بات ہوگی۔ ڈاکٹر رمیض کا ذہن مختلف شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا۔ وہ اس قدر شدید الجھن کا شکار ہونے لگے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا ہو رہا ہے...... وہ ساری رات یونہی بے چین اور بے قرار رہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی انہیں نیند نہ آئی۔

دریہ اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ رات کو وہ خاصی ٹینشن میں تھی اور بے حد تھکی ہوئی بھی تھی اس لئے جلد ہی سو گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر رمیض کو کمرے میں نہ پا کر وہ چونکی اور انہیں تلاش کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ نیم بیداری کے عالم میں تھی۔ ڈاکٹر رمیض کو ایک کمرے سے دوسرے میں تلاش کرتی ہوئی وہ لاؤنج میں آئی اور اچانک ڈاکٹر دانش کے ملازم ساجد سے بری طرح ٹکرائی جو ان کے لئے چائے بنانے کچن میں جا رہا تھا۔ ساجد نیچے گر گیا اور ڈاکٹر دریہ نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دونوں کو دیکھا اور اپنے موبائل میں ان کی تصویر بنا لی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" ڈاکٹر دریہ نے ساجد سے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں...... ٹھیک ہوں" اس نے اٹھنا چاہا مگر کمر میں درد کی وجہ سے وہ کراہنے لگا۔

تم یہاں لیٹ جاؤ۔ ڈاکٹر دریہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پر لٹایا اور اس کے لئے دودھ گرم کرنے لگی...... اس نے اسے گرم دودھ پلانے کے بعد میڈیسنز دیں۔ وہ اس کی تیمارداری میں اتنی مصروف رہی کہ ڈاکٹر رمیض اس کے ذہن سے نکل گئے۔ دن طلوع ہونے کو تھا جب ڈاکٹر رمیض اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دریہ کو ساجد کے اوپر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ انتہائی مہین نائٹ ڈریس میں تھی، ڈاکٹر رمیض کو اس پر غصہ آ گیا۔

"دریہ...... یہ سب کیا ہے؟" ڈاکٹر رمیض غصے سے چلائے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ساجد گر گیا تھا...... اسے چوٹ لگی ہے...... اور......" ڈاکٹر دریہ نے کمرے میں آ کر کچھ بتانا چاہا۔

"گھر میں اس کی تیمارداری کے لئے کوئی اور نہیں؟" "تم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے تمہیں شرم آنی چاہیے" ڈاکٹر رمیض نے کمرے میں آ کر انتہائی غصے سے کہا۔

''آئی ایم سوری، مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' دریہ نے اچانک اپنے آپ کی جانب دیکھا اور شرمندگی کا اظہار کرنے لگی۔

''عورت پر کبھی بھروسہ نہ کریں وہ بہت چالاک اور مکار ہوتی ہے...... شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی دوسرے کے ساتھ دل لگا بیٹھتی ہے''

ڈاکٹر دانش کے الفاظ ڈاکٹر رمیض کے کانوں میں گونجنے لگے اور انہوں نے گھور کر دریہ کو دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو کر واش روم میں ڈریس چینج کرنے چلی گئی۔

''یہ محض اتفاق تھا...... دریہ ایسی نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے سوچا۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے...... آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ مخلص نہیں اور میں آپ کو اس کا ثبوت دے سکتا ہوں'' ڈاکٹر رمیض کے دل میں دریہ کے بارے میں شک پیدا ہونے لگا۔

''وہ آپ کے ساتھ محض دل بہلا رہی ہے'' ڈاکٹر رمیض کا دل بری طرح بے قرار ہونے لگا۔

''اس کا مطلب ہے دریہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے...... محبت کا ڈرامہ کر رہی ہے'' ڈاکٹر رمیض نے غصے سے سوچا اور ان کا خون کھولنے لگا۔

دریہ واش روم سے باہر نکلی اور معذرت خواہانہ انداز میں ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا...... اور آنکھیں جھکا لیں...... ڈاکٹر رمیض نے خفگی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''پلیز...... رمیض...... آئی...... ایم سوری...... مجھے بالکل ہی خیال نہیں رہا تھا'' دریہ ڈاکٹر رمیض کے قریب آئی اور محبت سے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

''آئی کانٹ ٹرسٹ یو (میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا)'' ڈاکٹر رمیض کی زبان سے نادانستہ جملہ نکلا، ڈاکٹر دریہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''کیا...... آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا؟'' ڈاکٹر دریہ کے لئے یہ انتہائی صدمے کی بات تھی۔

''ہاں...... مجھے تم پر اعتبار نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے اپنی سرخ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر غصے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

دریہ حیرت سے انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ بہت زیادہ رونے سے اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ڈاکٹر رمیض ہاسپٹل جا چکے تھے اور اسے بار بار ہاسپٹل سے فون آ رہا تھا۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بتا کر چھٹی لینا چاہی مگر ایک دو ایمرجنسی کیسز کی وجہ سے اسے ہاسپٹل جانا پڑا۔ وہ بمشکل تیار ہوئی اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ چائے پیتے ہوئے نجانے کتنے آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل گر رہے تھے۔

''جس شخص کو اس نے بہت چاہا تھا...... ساری دنیا میں اس کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ اس پر اعتبار کیا تھا اور اس پر جان چھڑکتی تھی اس کو ہی...... اس پر اعتبار نہ رہا تھا...... وہ اسے بے اعتبار کہہ کر چلا گیا تھا......'' اس کی آنکھوں سے سیلاب سا رواں تھا۔

''خیریت تو ہے مسز رمیض...... آپ کیوں رو رہی ہیں؟'' ڈاکٹر دانش اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں...... یونہی...... طبیعت ٹھیک نہیں'' دریہ نے ٹالنا چاہا۔

''لگتا ہے......آپ میں اور ڈاکٹر رمیض میں کوئی جھگڑا ہوا ہے'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں کہا تو دریہ نے چونک کران کی جانب دیکھا۔

''دراصل عورت بہت معصوم ہوتی ہے......بہت وفادار......بہت مخلص......اپنے شوہر کو ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہے......مگر اس معصوم کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کا شوہر کس قدر مکار اور بے وفا ہوتا ہے......لمحوں میں اپنی وفاداریاں بدل لیتا ہے......مرد کو گرگٹ کہا جاتا ہے......پل میں کچھ پل میں کچھ......مفاد پرست، خودغرض اور بے وفا......عورت اس پر اعتبار کر لیتی ہے اور وہ اسے ایکسپلائٹ کرتا ہے......ہے نا یہی بات؟'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو دریہ نے چونک کران کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں سے مزید آنسو بہنے لگے۔

''آپ بہت مخلص اور باوفا ہیں لیکن ڈاکٹر رمیض بہت کم ظرف اور معمولی انسان ہیں......اور اس میں شاید ان کا بھی قصور نہیں......انہیں یہ ساری چیزیں جہیز سے ملی ہیں آپ کو ان کا بیک گراؤنڈ تو معلوم ہوگا......انتہائی غریب، کم ذات گھرانے سے ان کا تعلق ہے اور ایسا معمولی بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگ کبھی بھی اعلیٰ ظرف نہیں ہو سکتے......ان سے اچھی توقعات بے معنی ہیں......نجانے آپ نے کیوں ان سے شادی کر لی......آپ خوبصورت ہیں، ٹیلنٹڈ ہیں......کیا آپ کو یہی شخص ملا تھا......اپنی زندگی خراب کرنے کے لئے؟'' ڈاکٹر دانش نے اس قدر بے باکی سے کہا تو دریہ نے حیرانگی سے ان کی جانب دیکھا۔

''مسز رمیض......آپ اس شخص پر جتنا بھی اعتبار کر لیں اور جتنی محبت بھی کر لیں......سب بے کار ہے......آپ کو اس سے کچھ نہیں ملے گا......نہ محبت نہ وفا......میں اپنی زندگی کے تجربہ کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''کیوں......؟'' دریہ نے بمشکل پوچھا۔

''اس کا کیریکٹر اسٹرونگ نہیں......اس نے آپ سے شادی بہت سے مفادات کی خاطر کی......اور شاید محبت بھی کسی اور سے کرتا ہے......اور میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں'' ڈاکٹر دانش نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کیسا ثبوت؟'' دریہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

''آپ سے بے وفائی کا......'' ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر کہا۔

''ک......کیسے؟'' دریہ نے گھبرا کر پوچھا۔

دریہ کا موبائل بجنے لگا۔ ایک ایمرجنسی کیس کے سلسلے میں اسے ہاسپٹل بلایا جا رہا تھا وہ کرسی سے اٹھی۔

''ڈاکٹر دانش ثبوت کے بغیر بات نہیں کرتا......آپ مجھ پر اعتبار کریں وہ شخص آپ کے قابل ہی نہیں......جتنی جلدی ہو......اس سے چھٹکارا پالیں'' ڈاکٹر دانش نے کہا تو اس نے حیرت سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا اور حیرت و خوف کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ دریہ اپنا بیگ اٹھا کر گھر سے باہر چلی گئی اور ڈاکٹر دانش مسکرانے لگے۔

رات کو ڈاکٹر رمیض بہت پریشان اور تھکے ہارے گھر لوٹے تو دریہ ابھی تک ہاسپٹل سے نہیں آئی تھی۔ گھر میں اک عجیب سا سناٹا چھایا تھا۔ ڈاکٹر رمیض نے ملازموں کو آوازیں دیں مگر کوئی بھی موجود نہ تھا سوائے شیف کبیر علی کے......سب لوگ کہاں ہیں......اور......'' ڈاکٹر رمیض

نے دریہ کے بارے میں پوچھنا چاہا۔

''صاب......ڈاکٹر دانش صاب یہ گھر چھوڑ کر شام کو کہیں چلے گئے ہیں اور بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں آئیں'' کبیر علی نے بتایا۔

''ڈاکٹر دانش گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں......کہاں......؟'' ڈاکٹر رمیض نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......کہہ رہے تھے......اب دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے......اپنا سارا سامان اور کاغذ بھی لے گئے ہیں'' کبیر علی نے بتایا تو ڈاکٹر رمیض ایک دم فکرمند ہو گئے۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں......اور کہاں جا سکتے ہیں؟ اپنے گھر......نہیں......نہیں......شاید میری کوئی بات انہیں بری لگی ہے اس لئے انہوں نے یہ گھر چھوڑ دیا ہے......اوہ......مائی گاڈ......یہ میں نے کیا کیا......؟ نجانے مجھے کیوں غصہ آ گیا اور میں بھول گیا کہ وہ تو بیمار انسان ہیں......مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے......کاش وہ مجھے مل جائیں'' ڈاکٹر رمیض کا ضمیر انہیں پریشان کرنے لگا۔ وہ پہلے ہی دریہ کی وجہ سے پریشان تھے......سارا دن وہ ہاسپٹل میں بھی بہت اپ سیٹ رہے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک انہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان تھے۔ کیسے اتنے ہائپر ہو گئے اور دریہ سے بھی تلخ کلامی پر اتر آئے۔ سارا دن دل و دماغ پر ایک بوجھ سا چھایا رہا۔ اک عجیب سی پریشانی اور مایوسی نے انہیں اتنا بے چین اور مضطرب رکھا کہ کسی مریض کا بھی چیک اپ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''دریہ ان سے بے وفائی کر رہی ہے......اور انہیں خبر ہی نہیں ہو پائی تھی''

ڈاکٹر دانش کے تلخ وطنزیہ جملے بار بار ان کے ذہن میں گونجتے اور ان کے اندر اک آگ سی لگا دیتے......اور ڈاکٹر دانش بھی دل برداشتہ ہو کر کہیں چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر رمیض نے پریشان ہو کر ڈاکٹر محسن زیدی کو فون پر بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''یہ تو بہت برا ہوا......ہماری اتنی محنت ضائع گئی......ڈاکٹر دانش کو نجانے کیا ہو گیا ہے......شاید بیماری نے ان کے ذہن پر ایسا اثر کر دیا ہے......لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا......ہمیں انہیں تلاش کرنا چاہیے......کہیں وہ اپنی مسز کے پاس تو نہیں چلے گئے؟'' ڈاکٹر محسن زیدی نے اچانک پوچھا۔

''نہیں......سر......وہ......وہاں تو بالکل ہی نہیں جا سکتے......ان کی مسز ان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی'' ڈاکٹر رمیض نے پریقین لہجے میں کہا۔

''آئی......سی......پھر وہ کہاں جا سکتے ہیں......؟'' ڈاکٹر محسن زیدی نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں......بہت اپ سیٹ ہوں......رات کو میری ان سے تلخ کلامی ہوئی تھی'' ڈاکٹر رمیض نے پریشانی سے گلوگیر آواز میں بتایا۔

''اوہ......انس ویری سیڈ'' ڈاکٹر محسن زیدی نے پریشانی سے کہا تو ڈاکٹر رمیض کے اندر احساس گناہ مزید بڑھنے لگا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''آپ فکر نہیں کریں......میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں آپ ایسے انسان نہیں......یقیناً صورت حال گھمبیر ہو گئی ہو گی۔ ڈاکٹر دانش اکثر ایسی تلخ باتیں کرتے ہیں کہ سننے والا ایک دم ہائپر ہو جاتا ہے......اینی وے......آپ اپ سیٹ نہ ہوں......خدا بہتر کرے گا......میں بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں'' ڈاکٹر زیدی کے الفاظ نے کسی حد تک ڈاکٹر رمیض کو تسلی دی اور وہ تھوڑے سے مطمئن ہو گئے۔

دریہ رات کو گھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر نائٹ ڈیوٹی لگوائی تھی وہ ڈاکٹر رمیض سے اتنی خائف ہو گئی تھی کہ ان کی شکل بھی

نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈاکٹر دانش کی باتیں سارا دن اندر ہی اندر کچوکے لگاتی رہیں ایک ایک لمحہ اس نے انتہائی اذیت میں گزارا...... ڈاکٹر رمیض اندر سے کیسا انسان تھا...... اسے خبر ہی نہیں ہو پائی تھی۔ وہ اس قدر خود غرض...... لالچی اور مفاد پرست شخص ہوگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تو اس کی شخصیت کا اچھا پہلو ہی دیکھا تھا۔ ان کی شادی کو صرف چند ماہ ہوئے تھے اور آپس میں ملاقات ہوئے صرف ایک سال...... اور ایک سال میں کوئی کسی کو کتنا جان پاتا ہے...... اور انسان کو اندر سے کون جان پاتا ہے۔ شاید وہ خود بھی نہیں...... ڈاکٹر رمیض کی ہر بات اسے مشکوک لگنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی پوری شخصیت بھی...... ڈاکٹر دریہ کا اسٹرونگ فیملی بیک گراؤنڈ تھا۔ وہ ہاسپٹل کے ایم ایس کی بیٹی تھی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس کے چاروں بھائی انجینئرز اور ڈاکٹرز تھے۔ جہیز میں اسے خوبصورت بنگلہ، گاڑی اور بینک بیلنس دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رمیض کو دس لاکھ سلامی دی گئی تھی۔ وہ اس شادی سے فرش سے عرش پر جا پہنچے تھے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس ایک دم ہائی ہو گیا تھا۔ دریہ کے دونوں بھائی امریکہ اور انگلینڈ میں تھے جو ڈاکٹر رمیض کو بھرپور اسپورٹ کرتے۔ دریہ خود بھی ماہر گائنا کالوجسٹ تھی۔ بہت کم عرصے میں اس نے بہت شہرت کمائی تھی۔ دریہ سے شادی ڈاکٹر رمیض کے لئے ہر طرح سے انتہائی فائدہ مند ثابت ہوئی تھی۔

''ڈاکٹر رمیض کسی اور سے محبت کرتا ہے...... کوئی اور اس کے دل میں ہے...... اور دریہ اتنی بے وقوف نکلی تھی کہ اسے اس کی بھنک ہی نہیں ہونے پائی تھی۔ وہ تو پورے یقین اور سچائیوں کے ساتھ ڈاکٹر رمیض پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ انہیں دل و جان سے چاہتی تھی...... اور وہ ان کے لئے کچھ بھی نہیں تھی۔ انہوں نے تو ایک جملہ کہہ کر اس کی ذات کی نفی کر دی تھی کہ انہیں اس پر اعتبار نہیں...... اور جس رشتے میں اعتبار ہی نہ ہو...... وہ کب تک قائم رہ سکتا ہے۔ کھوکھلے اور بے اعتبار رشتے ہمیشہ ختم ہو جاتے ہیں...... ڈاکٹر دانش کی باتیں سن کر اس قدر نا امید اور بد دل ہوگئی تھی کہ اسے ڈاکٹر رمیض سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

''آپ...... اس شخص سے جتنی جلدی چھٹکارا پالیں...... یہ آپ کے لئے اچھا ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے...... ڈاکٹر دانش کی باتیں اسے ٹھیک لگ رہی تھیں۔ وہ جتنا زیادہ ان کے بارے میں سوچتی...... ڈاکٹر رمیض اتنا ہی زیادہ مشکوک نظر آنے لگتے...... وہ شخص اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ مزید زندگی گزاری جاتی...... اگر وہ ڈاکٹر دانش کے بارے میں مشکوک ہو کر سوچتی...... تو...... ڈاکٹر رمیض کی زبان سے نکلے الفاظ کو جھٹلا نہ پاتی۔ وہ الفاظ اسے کسی نشتر کی طرح کانوں میں چبھتے رہتے۔

''مجھے تم پر اعتبار نہیں......''

ڈاکٹر رمیض کے الفاظ نے اسے بے حد دکھی کر دیا تھا مگر ڈاکٹر دانش کے انکشافات نے اس کے دل میں ڈاکٹر رمیض کے لئے بے انتہا نفرت بھر دی تھی۔ اتنی نفرت کہ اب وہ اس شخص کے بارے میں کچھ بھی مثبت نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اس کی ہر سوچ...... انتہائی نفرت پر ختم ہونے لگی تھی۔

لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے والے...... ایک دوسرے کو چاہنے والے...... ایک دوسرے کی خاطر قربان ہونے والے محض ایک شخص کی وجہ سے ایک دوسرے سے اتنے دور ہو گئے۔ اپنے درمیان موجود محبت سے جنم لینے والے تمام نازک جذبات لطیف احساسات اور خوبصورت رشتے کو ختم کرنے کے درپے تھے۔

☆

رات گہری ہو رہی تھی جب فریحہ آفس سے تھکی ہوئی لوٹی۔ اس نے بیگ اور گاڑی کی چابیاں ٹیبل پر رکھیں اور انتہائی تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

اماں......ایک گلاس پانی لے آئیں'' فریحہ نے شکستہ لہجے میں کہا تو اماں ٹرے میں پانی کا گلاس رکھ کر لے آئی۔

''بی بی......ڈرائنگ روم میں کوئی شخص آپ کا انتظار کر رہا ہے'' اماں نے خالی گلاس ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہے......اور آپ نے کس کو اندر بٹھایا ہے؟'' فریحہ نے حیرت اور خفگی سے پوچھا۔

''بی بی......وہ......وہ......اپنے آپ کو......آپ کا شوہر بتا رہے تھے......اور......میں کون ہوتی ہوں......گھر کے مالک کو......گھر سے باہر نکالتی'' اماں نے رک رک کر کہا۔

''گھر کا مالک......مائی فٹ......'' اور فریحہ انتہائی غصے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

ڈاکٹر دانش صوفے پر نیم دراز سگریٹ کے گہرے کش لگانے میں مصروف تھے۔ فریحہ کو غصے میں دیکھ کر مسکرائے۔

''تم......یہاں......کیوں آئے......اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی......میرے گھر میں آنے کی......ابھی باہر نکلو......میں تمہیں ایک منٹ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی'' فریحہ غصے سے چلائی۔

''یہ الفاظ تم مجھے کہہ رہی ہو......کیا کسی نیک اور شریف عورت کو زیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے یہ سب کہے'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور اپنی کوٹ کی جیب میں موبائل پر ریکارڈنگ شروع کر دی۔

''نہیں ہوں......میں شریف اور نیک عورت......میں بہت بری اور بدکار عورت ہوں......یہی سننا چاہتے ہو نا......تو سن لو......میں بار بار کہوں گی......میں بہت بری اور بدکار عورت ہوں'' ڈاکٹر دانش نے موبائل آف کر دیا۔

''اب جاؤ یہاں سے......'' فریحہ نے غصے سے کہا۔

''پلیز......فریحہ ڈارلنگ......میں یہاں ہمیشہ کے لئے رہنے کے لئے نہیں آیا......میرا یقین کرو......میں صرف چند دن کے لئے آیا ہوں......اور وہ بھی اپنے بیٹے کی خاطر......میں نے بہت ریسرچ کے بعد ایک ویکسین تیار کی ہے اس سے اس کی ابنارملٹی ختم ہو جائے گی......دیکھو فریحہ وہ ہماری زندگی کی آخری امید ہے......پلیز مجھ سے میری امید نہ چھینو......'' ڈاکٹر دانش نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا اور فریحہ کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ فریحہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اس کا دل نرم پڑنے لگا۔

''مجھے انگلینڈ جا کر اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور یقین کرو......میں عاصم کی وجہ سے انتہائی ذہنی اذیت میں سے گزرا ہوں......تم سے کی گئی زیادتیوں نے مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا......پلیز مجھے معاف کر دو......اور مجھے اپنے بیٹے کا علاج کرنے دو......'' ڈاکٹر دانش نے فریحہ کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور پھر ایک دم اس کے قدموں میں گر گئے۔ فریحہ نے حیرت سے انہیں دیکھا اور ایک دم پیچھے ہٹی۔

''یہ......یہ......آپ کیا کر رہے ہیں؟'' فریحہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تمہارا گنہگار ہوں اور ہر گنہگار اسی قابل ہوتا ہے کہ وہ گڑ گڑا کر اس سے معافی مانگے جس کے ساتھ وہ کوئی زیادتی کرتا ہے'' ڈاکٹر دانش نے پھر اس کے پاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''پلیز...... ایسا مت کریں'' اور فریحہ نے پریشان ہو کر انہیں اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔

''تھینک یو...... اس عزت افزائی کا بہت شکریہ'' ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر کہا اور اس لمحے ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

فریحہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے......؟ وہ اس شخص کو دیکھنا تو کیا اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور اب لمحوں میں ساری صورت حال بدل گئی تھی۔ اس نے اس شخص کو معاف بھی کر دیا تھا اور اسے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی...... شاید عاصم کی خاطر...... ایک موہوم سی امید کی کرن اس کے اندر جگمگائی تھی۔ اسے ڈاکٹر دانش کی ذہانت اور ٹیلنٹ پر کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی قابلیت کی وہ قائل تھی اس لئے ویکسین کے نام پر وہ چونک گئی تھی۔ ہوسکتا ہے عاصم میں کچھ بہتری آ جائے...... ڈاکٹر دانش نے ماضی میں اسکے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ عاصم کی خاطر یکسر بھول گئی تھی۔ وہ منکھیوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھنے لگی وہ اس شخص کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر عاصم کی خاطر اسے قبول کر رہی تھی۔ اس کے لئے کتنا مشکل ہو رہا تھا...... ذہن اس شخص کو قبول نہیں کر رہا تھا مگر دل کہہ رہا تھا کہ ایک بار اعتبار کر لو...... اپنے بیٹے کی خاطر......'' وہ خاموش اپنی سوچوں میں گم رہی۔

''میں اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں کیسا ہے وہ؟'' ڈاکٹر دانش نے سکوت کو توڑا۔

''آیئے...... میرے ساتھ'' فریحہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی اور دونوں عاصم کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ کارپٹ پر بچھے میٹرس پر بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ خود ہی ہنس رہا تھا، بے ہنگم قہقہے لگا رہا تھا اور مسلسل چھت کو گھور رہا تھا۔

''یہ کتنا بڑا ہو گیا ہے...... اور......'' ڈاکٹر دانش نے حیرت اور کراہت سے عاصم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''سولہ سال کا ہو گیا ہے''

''تم اسے کس طرح manage (سنبھالتی) کرتی ہو؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت مشکل سے، لیکن یہ میری زندگی ہے...... میری زندگی کی امید ہے...... میرے لئے...... میری سانسوں کی طرح ضروری ہے...... میں اپنی زندگی اور وجود کو اس کے بغیر خالی سمجھتی ہوں...... اور...... زندگی تو خود بخود اپنے آپ کو manage کر لیتی ہے...... انسان چاہے یا نہ چاہے'' فریحہ نے جواب دیا۔

''ہاں...... یہ...... تو ہے...... لیکن میں اس کو بالکل ٹھیک کر دوں گا...... میں نے بہت جدوجہد سے ایک ویکسین تیار کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ عاصم اس سے بالکل ٹھیک ہو جائے گا'' ڈاکٹر دانش نے اسے امید دلاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ویکسین آپ نے کسی اور پر بھی استعمال کی ہے؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... ایک مریض پر...... انگلینڈ میں...... اور وہ بالکل صحت یاب ہو گیا تھا...... اور جانتی ہو...... ٹھیک ہونے کے بعد وہ پہلے

سے بھی زیادہ ایکٹو ہو گیا" ڈاکٹر دانش نے کمال صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ مریض...... عاصم کی طرح پیدائشی ابنارمل تھا؟" فریحہ نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"نہیں...... ایک حادثے میں اس کا برین damage ہو گیا تھا مگر میرے علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو گیا...... اور جانتی ہو...... میڈیا...... میری اس ویکسین کے بارے میں جاننے کے لئے کتنا متجسس ہو رہا ہے۔ پریس کانفرنس کے دوران میری ریسرچ موضوع بحث بنی رہی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کسی اور کانفرنس میں اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا......" ڈاکٹر دانش نے فخریہ انداز میں کہا۔

"کیوں......؟" فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

"لوگ ہمیشہ دوسروں کی کامیابیوں سے حسد کرتے ہیں اور کامیاب لوگوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی میری ویکسین پر تنقید کرنا شروع کر دیتا یا اس کا فارمولا چوری کر لیتا تو میری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جاتی...... اور میں نے تو یہ سب کچھ اپنے بیٹے کے لئے کیا ہے...... اور تمہارے لئے......" ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"میرے لئے......؟" فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... تم عاصم سے بہت محبت کرتی ہو...... شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ...... تم میری اولاد کی جس محبت سے پرورش کر رہی ہو...... میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کو الفاظ نہیں...... یو...... آر...... ریئلی گریٹ" ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشامدانہ انداز میں کہا تو فریحہ کا دل ایک دم موم ہو گیا۔

وہ شخص پہلی بار اس کے سامنے اعتراف کر رہا تھا کہ وہ اس کی اولاد کی اچھے طریقے سے پرورش کر رہی ہے ورنہ وہ تو عاصم کو فریحہ کے گناہوں کی سزا کہا کرتا تھا۔ اسے اپنی اولاد کہتے ہوئے اسے شرمندگی اور بے عزتی محسوس ہوتی تھی اور اب وہ خود ہی اسے اپنی اولاد کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر دانش میں کتنی تبدیلی آ گئی ہے...... ممکن ہے وہ جس کرائسس میں سے گزرے ہیں اس نے ان کی سوچ بدل دی ہو اور ان کے اندر نفرت کی جگہ محبت بھر دی ہو...... فریحہ کے لئے ڈاکٹر دانش کا یوں بدل جانا بہت غیر متوقع تھا...... مگر...... انسان تو ہر لحہ بدلنے والی مخلوق ہے۔ وہ کب کیا کرے؟ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ فریحہ بھی حیرت سے آنکھیں کھولے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھتی رہی۔

"عاصم...... بیٹے...... کیسے ہو؟" ڈاکٹر دانش نے نیچے جھک کر عاصم کے ہاتھ کو محبت سے پکڑنا چاہا۔ عاصم نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر دانش نے اسے اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ عاصم نے زور سے ہاتھ کھینچا اور اپنے اوپر جھکے ہوئے ڈاکٹر دانش کے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا۔ عاصم کو قطعی احساس نہیں تھا کہ اس نے کسی کو تھپڑ مارا ہے۔ ڈاکٹر دانش ایک دم بوکھلا گئے اور ایک دم سیدھے کھڑے ہو گئے...... فریحہ بھی حیران رہ گئی اور پریشان ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں...... اس بیچارے کو کیا معلوم کہ وہ کیا کر رہا ہے؟" ڈاکٹر دانش نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا تو فریحہ خاموش ہو گئی۔

اسی لمحے لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی بیل سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد اماں کمرے میں آئی۔

''بی بی......وہ......آپ کا فون ہے......شیر افگن صاب کا'' اماں نے آہستہ آواز میں کہا۔

فریحہ بوکھلا گئی اور ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر دانش کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے اور انہوں نے حیرت سے آنکھیں گھماتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

''یہ شیر افگن کون ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے کمرے سے باہر نکلتی اماں سے پوچھا۔

''ایک صاب...... بی بی سے ملنے آتے ہیں'' اماں جلدی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکلی اور ڈاکٹر دانش کا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا۔

......❁......

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز ''علم و عرفان پبلشرز'' کی خدمات حاصل کیجیے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک...... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجیے اور کتاب لیجیے......

خواتین کے لیے سنہری موقع......سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجیے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

(۱۵)

جمی بہت خوش تھا جب وہ گھر میں داخل ہوا۔ نرگس صحن میں چارپائی پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ بے بی کے مرنے کے بعد وہ زیادہ تر بیمار ہی رہتی تھی اور فردوس وجمی کے ساتھ بھی بہت کم جاتی تھی۔ فردوس کمرے میں بیٹھی ایک نئے سوٹ کے دوپٹے پر ستارے لگانے میں مصروف تھی جو اس نے رات کو ایک شادی پر پہن کر جانا تھا۔

"ارے...... جمی کیا ہوا......؟ کاہے کو بھاگتا ہوا آرہا ہے...... خیر تو ہے۔" نرگس نے چارپائی سے قدرے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے...... آپا...... تیرے لئے خوشخبری ہے" جمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جمی...... کیسی خوشی...... اور...... کہاں کی خوشخبری...... میری ساری خوشیاں تو میرا بے بی اپنے ساتھ ہی لے گیا...... اب تو صرف غم ہے...... اور میرے آنسو" نرگس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"آپا...... تو خبر سنے گی تو خود بخود خوش ہو جائے گی۔" جمی نے مسکرا کر کہا۔

کیسی خبر......؟ نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

"فردوس کہاں ہے؟" جمی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اندر کمرے میں پھوی رہی ہے۔" نرگس نے جواب دیا۔

"فردوس...... اری...... او...... فردوس...... کہاں ہو......؟ باہر آ کر بات تو سنو۔" جمی نے زور سے آواز لگاتے ہوئے کہا تو فردوس دوپٹہ پکڑے باہر آ گئی۔

"اے جمی کیا...... تیری کوئی لاٹری نکل آئی ہے...... جو اتنا خوش ہو رہا ہے۔"

"بات ہی ایسی ہے...... تو بھی سنے گی تو خوش ہو جائے گی۔" جمی نے جواب دیا۔

"اب بتا بھی دے......" نرگس نے بیزاری سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"شامو کا پتہ چل گیا ہے......" جمی نے خوشی سے بتایا۔

"سچ...... کہاں ہے وہ......؟ فردوس نے خوش ہو کر پوچھا۔

"بڑے شہر میں...... ایک بہت بڑے بیوٹی پارلر میں کام کرتا ہے...... اس کا اپنا ایک بہت بڑا گھر ہے...... گاڑی ہے...... اور وہ بہت امیر ہو گیا ہے...... افسر بن گیا ہے...... اس کے پاس بڑا پیسہ آ گیا ہے۔" جمی نے مزے لے لے کر بتایا تو نرگس اور فردوس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے

لگیں......انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیا تو سچ کہہ رہا ہے......اور...... تجھے کس نے یہ سب بتایا؟ نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپا......سو......فیصد سچ بتا رہا ہوں میں نے استاد جمالے کے گھر سے پتہ کروایا ہے......استاد جمالے سے اس نے بال کاٹنا سیکھے تھے۔ سنا ہے، استاد جمالے کے مرنے سے پہلے وہ اس سے ملنے آیا تھا...... کسی دوسرے ملک جا رہا تھا......اور......اس نے استاد کو دو لاکھ روپے علاج کے لئے بھی دیئے۔'' جمی نے حیرت سے کہا۔

''دو......لا......کھ...... دونوں نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''ہاں......وہ......بہت بدل گیا ہے......بہت کما رہا ہے......اس کی شہر میں بڑی عزت ہے اور بڑا مشہور بھی ہو گیا ہے۔'' جمی نے کہا تو وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہونے لگیں۔

''واقعی......یقین نہیں آ رہا......اس نے اتنی ترقی کر لی ہے......'' فردوس نے کہا۔

''اچھا ہوا......ادھر سے چلا گیا......ورنہ ہماری طرح آج وہ بھی غم اور دکھوں سے مر رہا ہوتا......ویلوں کے پیسے اکٹھے کر رہا ہوتا......اس کا نصیب کہیں اور جا کر چمکنا تھا......وہ یہاں کیسے رہ سکتا تھا......؟'' نرگس نے افسردگی سے کہا۔

''رب کے رنگ بھی نرالے ہیں......دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور چھیننے پر آتا ہے تو آخری لقمہ بھی چھین لیتا ہے۔ فردوس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''جمی......تو جا کر اس سے مل......پتہ نہیں......اب وہ ہم سے ملنا بھی پسند کرے گا یا نہیں'' نرگس نے کہا۔

''اری......آپا......تُو بھی کمال کرتی ہے......اب وہ بڑا امیر بندہ بن گیا ہے......یہاں......ہمارے ٹوٹے پھوٹے گھر میں کہاں آنا پسند کرے گا......اور وہ بھی ہم سے جنہوں نے اسے اتنی ٹھنڈی رات میں گھر سے نکالا تھا......'' فردوس نے کہا۔

''فردوس مجھے بار بار نہ یاد دلا......میرے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے......مجھے لگتا ہے مجھ سے بڑا گناہ ہو گیا ہے......پتہ نہیں......رب مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں......'' نرگس نے نم آنکھوں سے کہا تو فردوس شرمندہ ہونے لگی۔

''آپا......میرا یہ مطلب نہیں......مگر......سچ تو یہی ہے نا......'' فردوس نے کہا۔

''اب تو کیا کہتی ہے......؟'' نرگس نے فردوس سے پوچھا۔

''میرے خیال میں ہمیں استاد جمالے کے گھر سے اس کا ایڈریس لے کر اسے خود جا کر ملنا چاہئے۔ اگر وہ ناراض ہوگا......تو اس سے معافی بھی مانگ لیں گے......'' فردوس نے رائے دی۔

''ہاں......کہہ......تو......تو......ٹھیک رہی ہے......جمی......تو اس کا ایڈریس لے لے اور ہم کل ہی اس سے جا کر ملتی ہیں۔ نرس نے کہا تو جمی فوراً ہی اٹھ کر باہر جانے لگا۔

''میں ابھی جا کر ایڈریس لاتا ہوں۔'' جمی کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا اور نرگس جلدی سے چار پائی سے اٹھی اور منہ دھونے چلی گئی...... فردوس حیرت سے اسے دیکھنے لگی......نرگس بھاگم بھاگ کبھی کوئی کام کرتی کبھی کوئی...... اس کے اندر ایسی امید پیدا ہوئی تھی جس نے اسے زندہ کر دیا تھا......وہ ہر بات میں شامو کا ذکر کرتی۔

''فردوس......شامو کو ملنے کیا خالی ہاتھ جائیں گے؟'' نرگس نے فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' فردوس نے چونک کر پوچھا۔

''اب وہ بڑا آدمی بن گیا ہے اور ہم نے اسے مبارکباد دینے جانا ہے...... اور...... مبارکباد خالی ہاتھ تو نہیں دی جاتی نا؟ نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا تو فردوس مسکرا دی۔

''ہاں...... ہاں...... مٹھائی لے کر جائیں گے۔'' فردوس نے کہا۔

''تیاری شروع کر دو...... ہم کل صبح ہی اس سے ملنے جائیں گے...... اور...... سن...... میرے صندوق میں کپڑوں کے نیچے کچھ پیسے رکھے ہیں...... وہ نکال کر جمی کو دینا...... شامو کے لئے مٹھائی لے آئے۔'' نرگس نے خوشی سے کہا۔

''ٹھیک ہے......'' فردوس کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

رات کو جمی شامو کا ایڈریس لے آیا۔ فردوس اور نرگس نے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزیں نکال کر رکھی تھیں۔ فردوس نے جمی کو پیسے دیئے کہ وہ مٹھائی لے آئے۔

''آپا...... صبح ہی لے آؤں گا...... یا پھر اس کے شہر سے لے لیں گے بڑے شہروں میں اچھی مٹھائیاں ملتی ہیں۔'' جمی نے جواب دیا۔

''ہاں...... تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو...... وہیں سے لے لیں گے۔'' نرگس نے جواب دیا۔ خوشی سے وہ ساری رات نہ سو سکیں، کبھی کوئی کام کرتیں تو کبھی کوئی کام۔

وہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئیں جمی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اہتمام سے نئے کپڑے پہنے...... اپنے آپ کو خوب بنایا، سنوارا اور مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گئیں...... وہ ایک بہت بڑے بیوٹی پارلر کا ایڈریس تھا۔ جمی اندر گیا اور ریسپشنسٹ لڑکی سے شامو کے بارے میں پوچھا۔

''یہاں تو اس نام کا کوئی بھی نہیں'' لڑکی نے جواب دیا۔

جمی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''شامو...... میرا دوست ہے، دوسرے شہر سے آیا ہے۔'' جمی نے ہاتھوں کو ادھر ادھر چلاتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے اس کی جانب بغور دیکھا۔

''آپ شمی کی بات تو نہیں کر رہے؟'' لڑکی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا...... تو جمی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''شاید...... وہی...... یہاں آ کر شامو سے 'شمی' بن گیا ہوگا۔'' جمی نے جواب دیا۔

''ایک منٹ......میں ان سے پوچھتی ہوں......آپ کا نام......؟ لڑکی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''جمی......میں جمی ہوں......اسے بتانا......فردوس اور نرگس بھی میرے ساتھ ہیں۔'' جمی نے خوش ہو کر بتایا۔

لڑکی نے انٹر کام پر نمبر ملا کر جمی کے بارے میں بتایا۔

''وہ آ رہے ہیں......آپ تشریف رکھیں۔'' لڑکی نے کہا تو جمی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں نے حیرت سے اسے دیکھا، کچھ اسے دیکھ کر مسکرائیں......اور کچھ نے معنی خیز انداز میں آنکھوں کو گھمایا۔

تھوڑی دیر بعد شمی لاؤنج میں آیا......اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی......بوائے کٹ ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس نے کلائیوں پر مختلف قسم کے بینڈز پہن رکھے تھے۔ جمی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا......شمی مسکرا کر اسے گلے ملا۔ باہر نرگس اور فردوس بھی گاڑی میں بیٹھی ہیں۔'' جمی نے اس کے کان میں سرگوشی کی......تو......شمی نے لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''مس ہما......میں ابھی آیا۔'' اور وہ جمی کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا گیا۔ نرگس اور فردوس اسے دیکھ کر گاڑی سے نکلیں اور اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگیں۔

''ارے شامو......میرے بچے تو اتنا بدل گیا ہے......رب مجھے معاف کر دے۔ میں تجھ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' نرگس نے نم آنکھوں سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ گھر چلیں......میں رات کو گھر آ کر بات کروں گا۔'' اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا کر جیب میں سے روپے نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور گھر میں ملازم کو فون کیا کہ اس کے مہمان آ رہے ہیں۔

''جمی......تم ان کو لے کر گھر جاؤ......اور آرام کرو......میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔'' شمی نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ان کو مطلوبہ گھر کے سامنے اتارا......گھر انتہائی عالیشان دو منزلہ کوٹھی پر مشتمل تھا۔

''ارے یہ ہمیں کہاں اتار رہے ہو......؟'' نرگس نے حیرت سے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہی......ان صاحب کا گھر ہے......اور مجھے یہی ایڈریس بتایا گیا ہے۔ ٹھہرو میں بیل بجاتا ہوں۔'' ڈرائیور نے باہر نکل کر بیل پر ہاتھ رکھا......تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا۔

''آپ شمی صاحب کے مہمان ہیں نا'' لڑکے نے پوچھا۔

''ہاں......'' جمی نے جواب دیا۔

''اندر تشریف لے آیئے۔'' وہ لڑکا ان کو لے کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا......رنگ برنگی ٹائیلوں کے فرش پر چلتے ہوئے پھسلنے کے ڈر سے وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پکڑنے لگیں۔ چاروں طرف لکڑی کی کھدائی کے خوبصورت بڑے بڑے دروازے اور ستون نصب تھے......شیشے کی خوبصورت بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے......گھر کی آرائش، فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز، ہر شے خوبصورت اور منفرد تھی۔ تینوں حیرت سے آنکھیں

کھول کھول کر گھر کو دیکھنے لگے۔

''یقین نہیں آتا...... کہ یہ شاموکا گھر ہے۔'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''شامو نہیں...... شمی'' جمی نے دونوں کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''ہاں...... ہاں...... شمی صاب'' فردوس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔لڑکے نے تینوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔وہ نرم وگداز جدید طرز کے صوفوں،ٹیبلز اور ڈرائنگ روم کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''میں ابھی آتا ہوں......'' لڑکا کہہ کر باہر جانے لگا۔

''تمہارا کیا نام ہے......؟ جمی نے پوچھا۔

''ناصر......'' لڑکے نے جواب دیا...... اور...... مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آپا سچ یقین نہیں آرہا...... رب نے شمی پر اتنا کرم کر دیا ہے...... ایسا گھر...... ایسے ٹھاٹ باٹ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے...... رب کے رنگ ہیں...... بندے کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے......'' فردوس نے حیرت سے کہا۔

''اور رب کے رنگ بڑے نرالے ہیں...... بندہ حیران ہی رہ جاتا ہے......'' نرگس نے بھی اس کی ہاں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

جمی حیرت سے ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا تھا۔اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا...... کیا کہے......؟ اسے شامی کی قسمت کہے یا قدرت کا معجزہ یا پھر شمی کی محنت......؟

تھوڑی دیر بعد ناصر خوبصورت گلاسوں میں ان کے لئے پیپسی ڈال کر لے آیا...... گلاس اٹھاتے ہوئے ان کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے...... انہوں نے جلدی جلدی گلاس ختم کیے۔

''آیئے میں آپ لوگوں کو آپ کا کمرہ دکھا دوں...... آپ لوگ فریش ہو جایئے...... اتنی دیر میں، میں کھانا لگواتا ہوں۔'' ناصر نے کہا تو تینوں اپنے بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیئے۔

''سنو...... اس کو وہ مٹھائی تو دو...... جو ہم شمی کے لئے لائے ہیں۔'' فردوس نے جمی سے کہا۔

نرگس نے فردوس کے بازو کو جھٹکا دیا اور نفی میں سر ہلایا تو دونوں خاموش ہو گئے۔

ناصر ان کو ایک خوبصورت ویل فرنیشڈ بیڈروم میں لایا۔تینوں حیرت سے کمرے کو گھورنے لگیں۔

''اس کے ساتھ ایک اور بیڈروم ہے...... آپ میں سے ایک وہاں رہ سکتا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

نہیں...... نہیں...... ہم تینوں کے لئے یہ کافی ہے۔'' نرگس نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... آپ فریش ہو جائیں...... میرا مطلب ہے ہاتھ منہ دھولیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' ناصر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔تینوں اٹھ کر کمرے کی چیزوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھنے لگیں...... کبھی وہ بیڈ شیٹ کو ہاتھ لگاتی ،کبھی ٹیبل لیمپس کو...... کبھی پنکھا چلا کر دیکھتیں...... کبھی

لائٹوں کو آن آف کرتیں...... ہر ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں۔

''شمی کتنا نصیب والا ہے......'' فردوس نے کہا۔

''ہاں......'' جمی نے آہ بھر کر کہا۔

''آپا...... تو نے مٹھائی دینے سے کیوں روکا؟'' فردوس کو دیکھ کر یاد آیا تو اس نے نرگس سے پوچھا۔

''فردوس...... تو بھی بڑی باؤلی ہے...... اتنی مہنگی مٹھائی ہم شامو کے لئے لائے ہیں اور تو اس لڑکے کو دینے کو کہہ رہی تھی...... پاگل اگر وہ بیچ میں سے کھالیتا تو ہم شامو کو کیا بتاتے کہ ہم تو پورے دو کلو مٹھائی لائے ہیں...... تمہارا نوکر کھا گیا ہے......'' نرگس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ہاں...... تو...... ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' فردوس اور جمی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''جا...... فردوس...... جا کر ہاتھ منہ دھولے......'' نرگس نے کہا تو فردوس اپنا پرس پکڑ کر واش روم میں چلی گئی۔

اتنے بڑے ویل فرنیشڈ واش روم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں...... وہ حیرت سے ایک ایک ٹونٹی کو چیک کرنے لگی...... کسی سے ٹھنڈا پانی نکلتا تو کسی سے گرم، وہ واش بیسن کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے چہرے کو ادھر سے ادھر گھما کر ہر زاویے سے چیک کرتی رہی۔ اس نے ہاتھ منہ دھو کر ٹاول سے خشک کر کے اپنے پرس میں سے اپنا میک اپ نکال کر دوبارہ میک اپ کیا...... واش روم میں رکھی پرفیوم اور باڈی سپرے اپنے اوپر چھڑکیں...... مسکرا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور خوشی سے ٹونٹیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگی۔ ایک دم چھت سے پانی اس کے اوپر گرنا شروع ہو گیا، وہ اونچی آواز میں چلانے لگی۔

''ہائے...... مرگئی...... کسی کمبخت نے میرے اوپر پانی پھینک دیا ہے...... اوئے...... جمی اندر آ...... دیکھ تو سہی۔'' فردوس چلائی تو نرگس اور جمی واش روم کی طرف بھاگے۔ فردوس پر شاور سے پانی گر رہا تھا اور اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

''فردوس تو بھی پاگل ہے...... بھلا اس کو کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔'' جمی نے شاور کی ٹونٹی بند کرتے ہوئے کہا۔

''ارے...... مجھے کیا پتا...... یہاں چھت پر بھی نلکا لگا ہے۔

جا اب میرے کپڑے بیگ میں سے نکال کر لا۔'' فردوس نے کہا تو جمی کمرے میں چلا گیا اور بیگ لا کر اسے تھما دیا۔

''خود ہی نکال لو...... جو تم نے پہننے ہیں...... مجھے کیا معلوم اب تم کونسا جوڑا پہنوگی۔'' جمی نے منہ بنا کر کہا اور وہاں سے چلا گیا...... اور فردوس کپڑے بدل کر باہر نکلی تو ناصر آ گیا۔

''آ جائیے...... کھانا تیار ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ابھی آتے ہیں...... پہلے ہم ہاتھ تو دھولیں۔'' جمی نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد تینوں ڈائننگ روم میں پہنچیں تو انواع و اقسام کے کھانے خوبصورت کرسٹل کے برتن دیکھ کر حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''ایسے برتنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔'' فردوس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

''اری...... ہم نے تو زندگی بھر ایسے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگایا...... ڈر تو لگے گا ہی نا...... کیوں جمی؟'' نرگس نے آہ بھر کر کہا۔

''اور نہیں تو کیا......؟'' جمی نے جواب دیا۔

''صاحب کا حکم ہے...... ٹھیک طرح سے کھانا کھایئے...... اور اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔'' ناصر نے کہا۔

''وہ خود کب آئے...... گا...... گی......'' فردوس الجھتے ہوئے بولی۔

''وہ رات کو دیر سے آئیں گے...... مگر کہہ رہے تھے کہ جلد آنے کی کوشش کریں گے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''آپ لوگ آرام سے کھانا کھائیں...... جس چیز کی ضرورت ہو یہ بیل بجا دیجئے گا...... میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ناصر نے ایک بیل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ ہمیں اتنی عزت دے رہا ہے کہ حیرانگی ہو رہی ہے...... سچ...... آج تک تو ہمیں کسی نے عزت سے بلایا ہی نہیں......'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''چل...... کھانا کھا...... خوامخواہ دکھی نہ ہو۔'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''ہائے اللہ...... اتنا کچھ ہے...... کیا کھاؤں۔ کیا نہ کھاؤں......'' فردوس نے ایک دم موڈ بدلتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اری...... سب کچھ ہی کھا لے...... مگر...... اتنا نہ کھانا کہ تیرا پیٹ ہی پھٹ جائے......'' نرگس نے ہنستے ہوئے کہا اور تینوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

رات کا ایک بج گیا تھا مگر شمی ابھی تک نہیں آیا تھا اور وہ اس کے انتظار میں جمائیاں لینے لگیں۔

''پتہ نہیں...... شمی کب آئے گا...... مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے۔'' جمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا...... اور بستر پر لوٹنے لگا۔

''ہائے...... ایسا نرم بستر تو زندگی بھر نصیب نہیں ہوا...... آپا...... یہاں آ کر یوں محسوس ہونے لگا ہے...... کہ ہمیں تو خدا نے کچھ بھی نہیں دیا۔ نہ ڈھنگ کی زندگی...... نہ اچھا کھانا پینا نہ اچھا پہننا اوڑھنا۔'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''اور...... نہ ہی اچھا نصیب......'' نرگس نے آہ بھر کر کہا۔

گیٹ بیل بجی...... تو تینوں اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگیں۔ شمی اندر داخل ہوا تو تینوں مسکرا کر کھڑے ہو گئیں۔

''آپ لوگ تھک تو نہیں گئے۔'' شمی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارے ہماری ساری تھکاوٹ تو تجھے دیکھ کر ہی ختم ہو گئی...... صدقے جاؤں میرے بچے نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ ٹھہر میں تیری نذر تو اتار لوں۔'' نرگس نے جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر اس پر وارے۔

''بس...... یہ تم لوگوں کی دعائیں ہیں......'' شمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شمی.......کیا یہ.......سب تیری کمائی کا ہے؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.......میری محنت کی کمائی کا.......آپا.......محنت کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے.......بس انسان کو شروع میں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں.......پھر آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا جاتا ہے۔'' شمی نے کہا۔

''تم پر اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' جمی نے کہا۔

''ہاں.......بس کسی نے راہ دکھائی.......اور میرے دل نے اس کی بات کو مان لیا.......'' شمی کی آنکھوں کے سامنے رانی گھوم گئی۔

''ارے کس نے تجھے راہ دکھائی.......کچھ مجھے بھی تو بتا۔'' جمی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''تھا.......کوئی.......جو میرے ناچ گانے کی کمائی کا چاکلیٹ بھی نہیں لیتا تھا.......کہتا تھا.......مجھے تیری حرام کی کمائی کا کچھ نہیں کھانا.......بس میرے دل نے اس کی بات مان لی، پھر استاد جمالا مل گیا.......وہ تو اک فرشتہ تھا.......اس نے نہ صرف مجھے اپنا ہنر سکھایا بلکہ مجھے اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا.......اگر استاد جمالا میری زندگی میں نہ آتا تو میں آج سڑکوں پر آوارہ پھر رہا ہوتا یا کب کا مر کھپ گیا ہوتا.......وہ مر گیا ہے.......تو لگتا ہے جیسے میری زندگی خالی ہو گئی ہو.......اس دنیا سے روشنی ختم ہو گئی ہو۔ میری زندگی بنانے والا وہ شخص تھا.......میں اس کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا.......وہ ہر قدم پر مجھے یاد آتا ہے.......اس کی باتیں.......اس کی محبت.......اس کا پیار.......تم سوچ نہیں سکتیں وہ کیا تھا.......اچھا.......نیک.......اور صاف گو انسان۔ اللہ کا کتنا بڑا تحفہ ہے، جو وہ دوسرے انسانوں کو دیتا ہے.......ایسے انسانوں سے دنیا چمکتی ہے.......مگر ان کے اپنے لوگ ہی ان کی قدر نہیں کرتے.......استاد کے بیٹے بھی بڑے نافرمان نکلے.......اپنے باپ کی قدر نہ کر سکے.......اور.......وہ ان کا غم کلیجے میں چھپائے مر گیا۔'' شمی سسکنے لگا تو نرگس، فردوس اور جمی کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

''اور وہ انسان تو بہت ہی بڑے ہوتے ہیں جو ہم جیسوں کو اپنے جیسا سمجھ کر اپنے سینے سے لگاتے ہیں.......ہمارا دکھ محسوس کرتے ہیں ہماری کمیوں اور خامیوں کا ذمہ دار ہمیں نہیں ٹھہراتے.......ایسے انسان بہت کم ہیں.......سونے سے بھی زیادہ قیمتی۔'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''شمی.......ہمارے دلوں میں چھلنی سے زیادہ چھید ہیں.......ان سوراخوں سے غم اور دکھوں کا لہو کیسے کیسے نکلتا ہے.......ہمارے دلوں پر لوگ کیسے چھریاں چلاتے ہیں.......کسی کو کیا خبر.......شمی تجھے کیا بتائیں.......ہمارے بے بی کے بیمار ہونے پر ظالموں نے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کیا.......میرے پرس سے تو سونے کی انگوٹھی بھی چرا لی۔'' فردوس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ.......وہ.......بچہ.......کیا ہوا اسے.......؟'' شمی نے ایک دم آنسو پونچھ کر حیرت سے پوچھا۔

''پتہ نہیں شمی اسے کیا ہو گیا.......شاید اسے تیری ہی بد دعا لگ گئی اور وہ مر گیا.......میرا بچہ.......مجھ سے بچھڑ گیا.......میری گود اجاڑ گیا.......'' نرگس بین کرنے کے انداز میں بولی۔

''آپا.......میری بد دعا.......تو نے یہ کیسے سوچا.......میں بھلا اسے کیوں بد دعا دوں گا.......'' شمی نے حیرت سے کہا۔

''میں نے اس رات تجھے گھر سے نکالا.......تو.......تو نے کہا تھا نا.......کہ تجھے اب یہ مل گیا ہے نا.......اس لئے مجھے نکال رہی ہو.......'' نرگس

نے جواب دیا۔

''آپا.....اگر تم مجھے گھر سے نہ نکالتی تو آج میرے پاس یہ گھر نہیں ہوتا.....ہم لوگ بھی بڑے ناشکرے ہیں.....اللہ کے رازوں کو نہیں سمجھتے اور شکوے کرتے ہیں۔استاد جمالے نے مجھے یہی سکھایا.....کہ.....شامو.....رب سے کبھی شکوہ نہ کرنا.....تو کچھ نہیں جانتا.....مگر.....وہ سب کچھ جانتا ہے۔آپا اس ایک بات پر عمل کرنے سے میرے دل کے اندر سے سارے دکھ، سارے شکوے، ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ورنہ میں اٹھتے بیٹھتے رب سے یہی شکوہ کرتا تھا کہ اس نے مجھے کیوں ایسے پیدا کیا.....استاد کی کس کس بات کو یاد کروں؟''شمی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ تو سچ ہے.....تیرا یہ گھر اور تیری شان دیکھ کر ہمیں تو یقین ہی نہیں آیا.....کہ.....یہ سب کچھ تیرا ہے.....''جمی نے حیرت سے کہا۔

''میرا نہیں.....سب کچھ اوپر والے کا ہے۔''شمی نے کہا۔

''شمی تو.....تو.....بڑا اللہ والا بن گیا رے.....پہلے.....تو.....تو.....؟''فردوس نے کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میری کیا اوقات.....بس زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے.....پیٹ کی خاطر بڑی ذلت سہی ہے اور اپنے بے آسرا وجود کے لئے پناہ ڈھونڈنے میں بڑے دھکے کھائے ہیں.....جب انسان بڑی مشکلوں سے گزرتا ہے تو پھر اسے کوئی شے نہ تو خوش کرتی ہے اور نہ سکون دیتی ہے۔سکون تو بس قدرت کے فیصلوں پر شکر کرنے میں ہے۔''شمی نے کہا تو سب حیرت سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگے۔

''شمی.....تو خود ہی بڑا نہیں ہوا.....تو بڑی بڑی باتیں بھی کرنے لگا ہے.....ارے تو نے کہاں سے ایسی باتیں سیکھیں؟''فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''استاد جمالے سے.....اور.....خود اپنے آپ سے۔''شمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارے شمی.....تو نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔''نرگس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپا.....تو.....کیا کر رہی ہے.....ارے.....تو نے تو مجھے ماں جیسا پیار دیا ہے.....بھلا میں تجھ سے کیوں ناراض ہوں گا.....؟شمی نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تو نرگس فرط جذبات سے سسکنے لگی تو شمی نے محبت سے اپنا بازو پھیلا کر اس کے کندھے پر رکھ کر اس کو اپنے ساتھ لگایا تو وہ سسک سسک کر رونے لگی۔فردوس اور جمی بھی رونے لگے۔

''آپا.....یہ گھر بار.....سب تیرا ہے.....اب تم سب یہاں رہو گے۔''شمی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''یاد آیا.....اے.....جمی.....وہ مٹھائی کا ڈبہ تو دے.....جو ہم شمی کے لئے لائے ہیں۔''نرگس نے آنسو پونچھتے ہوئے جمی سے کہا تو وہ بھاگ کر بیگ میں سے مٹھائی کا ڈبہ لے آیا۔''نرگس نے اسے ڈبہ پکڑا دیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی.....؟اپنے گھر کو دیکھنے کے لئے کیا مٹھائی کی ضرورت ہوتی ہے؟شمی نے محبت سے کہا۔

''تم جو مرضی کہو.....مٹھائی تو ہمیں لانی ہی تھی۔''نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا تو شمی نے ڈبہ پکڑ لیا۔

''شکریہ۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تجھے خوش دیکھ کر دل بڑا خوش ہو رہا ہے۔" جمی نے مسکرا کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب آپ لوگ سو جائیں...... جمی کو بہت نیند آ رہی ہے...... صبح بات کریں گے۔" شمی اٹھتے ہوئے بولا تو سب اس کے جانے کے بعد آلتی پالتی مار کر سو گئے۔

☆

آپریشن کے بعد برکتے کا کولہا بڑی مشکل سے جڑا تھا...... کتنی مشکلوں سے سرکاری ہسپتال میں درخواستیں دے دے کر آپریشن کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اسے ہسپتال نہیں لے کر گیا۔ وہ ہر وقت چارپائی پر لیٹی کراہتی رہتی، رانی اور منے کو یاد کرتی رہتی۔ ملکا دن شروع ہونے سے رات گئے تک اسے کوستا رہتا اور گالیاں دیتا رہتا...... اس کے لیے اب وہ ایک ناکارہ وجود تھی...... جس نے اس کی جھگی میں نحوست پھیلا رکھی تھی...... اسے ہر وقت برکتے پر غصہ آتا رہتا جو اب اس لئے کسی کام کی نہیں رہی تھی...... اس کا بس نہیں چلتا تھا کسی طرح اسے جھگی سے باہر نکال پھینکتا...... اور جس سے ہمیشہ کے لئے اس کی جان چھوٹ جاتی...... جس طرح اس بچے سے چھوٹ گئی تھی۔ ملکے کو کبھی اپنے کیے پر نہ رنج ہوتا نہ شرمندگی۔ وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر بری الذمہ قرار دیتا...... کہ اس نے ان کے ہاں بھوکا پیاسا رہ کر مرنا تھا...... اور اس نے اسے کب جان سے مارا تھا جو اللہ اس کو جرم وار ٹھہرائے گا...... اس نے بچے کو پھینکا ہی تھا نا...... قتل تو نہیں کیا تھا...... اور...... برکتے جو اس کو اللہ کے عذاب سے ڈراتی تھی اب بستر پر پڑی کراہتی رہتی تھی۔ اس کے لئے زندگی مصیبت بنی ہوئی تھی وہ ایک قدم اٹھ کر نہیں چل سکتی تھی۔ اس کی چارپائی کو درمیان سے کاٹ دیا گیا تھا۔ کوئی اسے صاف نہ کرتا۔ سارا دن اس کے پاس سے بدبو آتی رہتی...... گڈی کا دل چاہتا تو اسے صاف کر دیتی ورنہ منہ اور ناک پر کپڑا رکھے ادھر ادھر پھرتی رہتی...... اور بڑبڑاتی رہتی۔ بچے ماں کی بیماری سے تنگ آ چکے تھے...... پہلے وہ سارا دن جھگی سے باہر رہتے...... اب رات کو بھی جھگی میں نہ گھستے...... ہر وقت منہ بنائے بڑبڑاتے رہتے۔

"ابا...... اس کا کچھ کر...... کیا مصیبت ہمارے پلے ڈال دی ہے۔ جھگی میں اک پل نہ بیٹھا جائے۔" بجو غصے سے بولتا۔

"ارے کہاں...... اس گند کے ڈھیر کو پھینکوں...... میں تو خود اس سے بڑا تنگ ہوں......" ملکا منہ بنا کر غصے سے بولتا ہوا جھگی سے باہر نکل گیا، بجو، مٹھو، گڈی اور شبو بھی اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔

"ابا...... تو دوسری جھگی کیوں نہیں لگا لیتا...... اس کو یہیں پڑا رہنے دے...... روٹی پانی ادھر ہی دے جائیں گے۔" مٹھو نے رائے دی تو ملکا اور بجو سوچ میں پڑ گئے۔

"نئی جھگی پر بڑا خرچا آئے ہے...... اور...... پھر زمین بھی کہاں ہے......؟" ملکے نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ابا...... زمین میں نے دیکھ لی ہے...... اور ہم نے جھگی بنانی ہے، کوٹھی نہیں بنانی...... کہ اس پر بڑا پیسہ لگے...... بس کل سے ہم جھگی ڈال لیں گے...... رات بھر نیند نہیں آتی...... اماں ساری رات بولتی رہتی ہے...... پھر اس کی بو نے...... دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے...... جان مصیبت میں ڈال دی ہے۔" بجو غصے سے بولا۔

”ٹھیک ہے رے...... کاہے کو غصہ کرے ہے...... کل ڈال لینا جھگی...... بلالانا اپنے یار بیلیوں کو...... میں خود اس مصیبت سے تنگ ہوں...... اتنے لوگ ہر روز مر جاتے ہیں...... پر اس کو اللہ نہیں اٹھاتا...... اللہ جانے اس نے کیا کھایا ہے...... جو مرتی ہی نہیں......“ ملکا غصے سے اسے کوسنے لگا تو سب بچے خاموشی سے اسے سننے لگے۔

سب بچوں اور دوستوں نے مل کر نئی جھگی ڈال لی اور ایک ایک چیز اٹھا کر وہاں سے لے گئے...... سوائے برکتے کی چارپائی اور اس کے ٹوٹے وجود کے۔

”ارے...... مجھ نصیب جلی کو بھی ساتھ لے جاؤ...... یہاں اکیلی کو کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو...... تم جیسی اولاد سے تو میں بے اولاد رہتی تو اچھا تھا...... تمہارا ناس ہو...... کوئی تو مجھے پوچھے...... یہ سب ملکے کے کہنے میں آ گئے ہیں۔ بڑا ہی ہرجائی ہے...... جب اس کی ٹانگ بس کے نیچے آئی تھی تو میں کس طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ ساری ساری رات جاگتی رہتی تھی اس کا ہر کام خود کرتی تھی اور اب میں اس کے لئے بوجھ بن گئی ہوں۔ مجھے دیکھ کر ناک منہ چڑھاتا ہے۔ مجھ سے اسے بو آتی ہے...... میرا ہائے ہائے کہنا اس کو برا لگتا ہے۔ ہر وقت مجھے یوں گالیاں دیتا ہے جیسے میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے...... اور...... ان بچوں کو دیکھو...... مر جانے...... سب کچھ بھول گئے...... کس طرح میں نے ان کو پالا...... گرمی، سردی سے بچاتی...... خود بھوکی رہتی مگر ان کے لئے روٹی پکاتی...... خود نہیں کھلاتی...... آج ان کو ماں بری لگے ہے...... ہائے میری رانی کہاں چلی گئی۔ وہ آج یہاں ہوتی تو کوئی میرے ساتھ یوں نہ کرتا......“ برکتے اونچی آواز میں رونے لگی اور بین کرنے لگی مگر اس کی بات سننے کو کوئی بھی نہیں تھا۔

”اے اللہ! تو مجھے کونسا دن دکھانا چاہتا ہے جو ابھی تک مجھے نہیں اٹھا رہا...... کاہے کو اتنی لمبی زندگی دے دی ہے...... کہ...... اس کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو گیا ہے...... ہائے...... میری رانی کو ہی بھیج دے وہ آ کر اپنی ماں کو ایک نظر دیکھ لے...... ربا...... مجھے اس سے ایک بار ملا دے......“ برکتے آنسو بہاتی رہی اور ہائے ہائے کرتی رہی۔

نئی جھگی میں آ کر سب بہت خوش تھے۔ ملکا بھی اور بچے بھی...... سب بچے اچھلتے، کودتے، چھلانگیں لگاتے، شور مچاتے...... انہیں کوئی منع کرنے والا نہیں تھا۔ گڈی کی عمر پندرہ برس ہو گئی تھی اس نے اچھا قد کاٹھ نکالا تھا۔ قدرے بھرے بھرے جسم کے ساتھ وہ اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ شبو اس سے چھوٹی تھی۔ پپو اور مجو کی عمریں چار پانچ برس ہو رہی تھیں۔ مشو تجو اور مجو کے ساتھ مل کر وہ اودھم مچاتے کہ خدا کی پناہ...... پہلے تو برکتے انہیں منع کرتی رہتی تھی...... وہ ان کے شور سے تنگ آ کر ان کو گالیاں دیتی تھی۔ اب برکتے نہیں تھی تو سب خوش تھے۔ آزاد تھے، کوئی نہ کوئی تھوڑی دیر کے بعد برکتے کے پاس ایک چکر لگا آتا اور اپنا فرض پورا کر دیتا۔ گڈی جا کر اسے روٹی پانی دے آتی۔ شبو اور گڈی دن میں ایک بار جا کر اس کی گندگی صاف کرتیں...... ملکا بس جھگی کا پردہ اٹھا کر حال پوچھتا اور وہیں سے لوٹ جاتا۔

نوری کی سہیلی بھاگی 25 سالہ، جوان صحت مند، خوش باش لڑکی بہانے بہانے سے گڈی سے ملنے اس کی جھگی میں آتی جاتی رہتی۔ دھندے سے واپس آنے کے بعد وہ شام کو چکر لگاتی پھر کھانا کھا کر رات گئے تک گڈی کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ گڈی سے اس کی دوستی دن بدن زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی جھگی میں آتی تو ملکا ادھر ادھر اس کے آس پاس منڈلاتا رہتا...... گڈی کو بہانے سے کبھی برکتے کو دیکھنے

کو بھیج دیتا تو کبھی روٹی پکانے کو......اور......موقع دیکھ کر بھاگی سے مزے لے لے کر باتیں کرتا...... بھاگی پہلے سے زیادہ جھگی میں آنے لگی تھی اور ملکا اب اپنا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ بالوں کو کالے رنگ سے سیاہ کر کے وہ اپنے اندر نو جوانوں جیسی چستی اور جوانی محسوس کرتا۔ اپنے کپڑوں پر گلاب اور موتیے کا عطر چھڑکتا۔ کبھی اپنے کانوں میں موتیے کی کلیاں اُڑستا اور جیسے ہی بھاگی تنہائی میں ملتی اسے کلیاں پیش کرتا۔ بھاگی شرما کر کلیاں اپنے کانوں کے سوراخوں میں ڈال دیتی۔

''اے...... بھاگی......اب میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا......کب تیرے رشتے کے لئے تیری اماں سے بات کروں؟'' ملکے نے موقع دیکھ کر اسے کہا۔

''جب مرضی بھیج......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سچ...... لے......آج ہی بھیجتا ہوں۔'' ملکے نے خوشی سے کہا۔

''مگر اماں ایویں تو تجھے میرا رشتہ نہیں دے گی۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے اتنے ڈھیر سارے بچے ہیں......ان کا تو پہلے کچھ کر۔'' بھاگی نے کہا تو ملکے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بچوں کا کیا کرنا ہے......بھلا بچوں کو میں......مار تو نہیں سکتا......نا'' ملکے نے کہا۔

''گڈی کی سادی کر دے......شبو اور دوسرے بچوں کو برکتے کے پاس چھوڑ دے۔ اس جھگی میں صرف تم......اور میں رہیں گے۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گڈی کی سادی......کہاں کروں......اور وہ بھی اتنی جلدی۔'' ملکے نے حیرت سے سوال کیا۔

''اماں کی نظر میں اک بندہ ہے......اس کی پہلی بیوی کے بچے نہیں......تو گڈی سے اس کی سادی بنا دے......وہ تجھے اس کے پیسے بھی دے گا......'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پیسے......؟ کون پیسے دے گا؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''رمضو......'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''وہ......بدمعاش......نشئی......نہ......نہ......میں گڈی کی سادی اس سے نہیں بناؤں گا۔'' ملکے نے غصے سے کہا۔

''ارے......پاگل ہو رہا ہے......سارے مرد یہی تو کرتے ہیں۔ کون نسہ نہیں کرتا......تو بھی تو اکثر بھنگ پیتا ہے نا......وہ سوٹا لگا لیتا ہے تو کیا ہو گیا......سن......اگر تو نے گڈی سے اس کی سادی نہ کی......تو میری اماں......میری سادی اس سے کر دے گی......پھر تو کس سے سادی کرے گا۔ کیا تو میرے بغیر رہ لے گا؟ اپنی بھاگی کے بغیر......''

بھاگی نے بڑے لاڈ سے منہ بنا کر بچوں کی طرح منمناتے ہوئے کہا۔

''اری...... تیرے بغیر ہی تو اب نہیں رہ سکتا۔''ملکے نے بھی لاڈ سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''گڈی کی تو نے سادی تو کسی نہ کسی کے ساتھ بنانی ہے نا...... اگر رمضو کے ساتھ کر دیتا ہے تو...... میں ...... تجھے مل جاؤں گی ...... سن وہ پیسے بھی دے گا...... اس نے اماں سے پورے دو ہزار کی بات کر رکھی ہے...... گڈی مجھ سے جوان ہے...... میں اماں کو بولوں گی...... قیمت بڑھا...... تین ہزار تو وہ دے ہی دے گا۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تین...... ہزار......''ملکے کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''ہاں...... اور...... ان تین ہزار سے ہم موج مستی کریں گے...... تو مجھے نئے کپڑے بنا کر دینا...... زیور اور بہت ساری چیزیں لے کر دینا......'' بھاگی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تو...... کیا...... تیری اماں...... مجھ سے پیسہ نہیں لے گی۔''ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں لے گی...... وہ تین ہزار تو مجھے ہی دے گی نا...... تیرے پیسے...... میرے پاس آ جائیں گے اور اس سے ہم عیس کریں گے...... عیس'' بھاگی نے ہنستے ہوئے کہا تو ملکا مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے...... رمضو سے بات کرلو...... تو...... میں گڈی کو اس سے بیاہ دیتا ہوں۔''ملکے نے کہا۔

''مگر گڈی کی سادی سے پہلے اپنی سادی کا ذکر نہ کرنا...... کہیں گڈی لڑائی نہ ڈال دے...... ایک دو بار رمضو نے اسے چھیڑا تھا تو گڈی نے اسے بہت گالیاں دی تھیں۔ وہ رمضو کو پسند نہیں کرتی۔'' بھاگی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تجھے کس نے یہ سب بتایا؟ ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''خود...... گڈی نے بتایا...... گڈی نے تو اس کے منہ پر تھوکا بھی تھا......'' بھاگی نے اسے بتایا تو ملکا خاموش ہو گیا۔

''تو...... غم نہ کر...... اماں رمضو کو سمجھا دے گی...... وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بھاگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گڈی کو پتہ چلا تو اس نے وہ رونا پیٹنا ڈالا کہ خدا کی پناہ۔

''ابا...... میں...... اس بدشکلے سے بیاہ نہیں کروں گی...... وہ بہت برا آدمی ہے......'' گڈی روتے ہوئے بولی۔

''حرام خور...... بدشکلا ہے تو کیا ہوا...... آدمی تو ہے نا...... انسان کی اولاد ہے نا کسی جن بھوت کی اولاد تو نہیں نا...... بڑی آئی باتیں بنانے والی...... تجھ سے تو اچھا ہے۔''ملکے نے غصے سے کہا۔

''ابا...... تو...... تو...... اس کی بات ایسے کر رہا ہے جیسے تو میرا نہیں اس کا باپ ہو......'' گڈی غصے سے بولی۔

''زیادہ...... باتیں نہ کر...... بس میں نے تیرا رشتہ اس کے ساتھ پکا کر دیا ہے...... اس کی پہلی بیوی کے بچے نہیں ہوا۔ کیا ہے جو وہ دوسری سادی بنا لے گا...... ارے بستی کی اچھی اچھی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں...... تو...... تو نصیب والی ہے...... جس سے سادی بنانے کو وہ راضی ہو گیا۔'' ملکا منہ بنا کر بولا۔

’’کونسی اچھی...... اچھی...... ذرا مجھے بھی تو بتا...... سب تو اس کے منہ پر تھوکتے ہیں...... کمبخت...... بدماس...... نسی میرے لئے تجھے وہی ملا ہے...... میں بتائے دیتی ہوں...... اگر تو نے جبردستی کی تو میں بھی رانی کی طرح تجھ سب کو چھوڑ کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔‘‘ گڈی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

’’کیا بولا تو نے...... تیری زبان گدی سے نکال کر کاٹ ڈالوں گا...... تیرے اتنے ٹوٹے کروں گا کہ چیل کوؤں کو بھی کھانے کو نہیں ملیں گے...... سمجھی تو...... میں نے جو کہہ دیا...... سو...... کہہ دیا۔ تیری سادی رمضو سے ہی ہوگی۔‘‘ ملکے نے اس کی چٹیا زور سے پکڑ کر اسے دو تین گھونسے مارے وہ زور زور سے چلانے لگی۔

’’خبردار...... جو...... تیری آواز باہر نکلی...... جان سے ماردوں گا...... کل رمضو کے ساتھ تیری سادی ہے...... اور باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ کرنا...... میں باہر ہی بیٹھا ہوں۔‘‘ ملکے نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو گڈی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رمضو...... ملکے کی عمر کا تھا۔ انتہائی کالا...... بدشکل، گھنگھریالے بالوں والا، کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالی رکھتا۔ راہ چلتے لوگوں کو چھریاں چاقو دکھا کر روپے پیسے لوٹتا...... لڑکیوں کو چھیڑتا...... اور اپنی بیوی کی ہر روز پٹائی کرتا۔ دونوں میں ہر وقت لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا۔ وہ بڑا ہی بدنام آدمی تھا...... اور...... گڈی کو اس سے بڑی نفرت تھی۔ بھاگی بھی اس کو سخت ناپسند کرتی تھی، اگر وہ ملکے کو اپنی چالوں سے نہ پھنساتی تو اس کی اماں اس کی شادی رمضو سے ہی کر دیتی...... اسے ملکا بہت بہتر لگا...... اور اس نے اپنی جگہ گڈی کو پھنسا دیا۔ گڈی اپنے نصیبوں کو روتی رہ گئی اور ملکے نے روتی چلاتی گڈی کی سادی رمضو سے کر دی، رخصت ہونے سے پہلے وہ برکتے سے ملنے آئی تو اس کے سرہانے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

’’اماں...... تو بھی میرے لئے کچھ نہیں کر سکی...... ابا بڑا ظالم نکلا بستی کے سب سے گندے مرد کے ساتھ تیری دھی کو بیاہ دیا۔ اماں...... کیا میں اتنی بری ہوں...... کہ...... اس نے مجھے اس بدماس کے ساتھ بیاہ دیا ہے...... اماں...... بول...... بتا...... مجھے......؟‘‘ گڈی دلہن بنی رونے لگی۔

’’اری...... تیرے باپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے...... اس نے ایک دن کے بچے کو کہیں پھینک دیا...... اسے اس پر ترس نہ آیا...... تجھ پر کیسے آتا...... ہائے...... میں کیا کروں...... چارپائی پر مٹی کی ڈھیری بنی ہوں...... وہ مجھے کیا سمجھے ہے...... بڑا ہی ظالم ہے...... مجھے معاف کر دینا...... تیری اماں تیرے لئے کچھ نہ کر سکی...... ہائے...... ری...... کیا کروں؟‘‘ برکتے نے گہری سانس لے کر آہ بھری اور سسکنے لگی...... گڈی نے ماں کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا......

’’پتہ نہیں اماں...... میرا کیا بنتا ہے...... رمضو اتنا جالم ہے...... مجھے اس سے بڑا ڈر لگے ہے...... اماں...... مجھے لگتا ہے وہ مجھے مار ڈالے گا...... اماں...... مجھے اس کے ساتھ نہ بھیج۔‘‘ وہ ہچکیاں لینے لگی۔

’’اری...... باہر بھی آ جا...... دولہا تیرا انتظار کر رہا ہے......‘‘ ملکے نے جھگی کا پردہ اٹھا کر کہا تو گڈی روتی، سسکتی ماں کی طرف بے بسی سے دیکھتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

گڈی کی رخصتی کرنے کے بعد ملکا رمضو سے تین ہزار لے کر بھاگی کی جھگی پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ مولوی سے نکاح پڑھوایا اور

ہنستی، مسکراتی بھاگی کے ساتھ اپنی جھگی میں آ گیا۔ بچے حیران و پریشان رہ گئے...... بھاگی دلہن بنی، بجی سنوری، مسکرا مسکرا کر ملکے کی طرف دیکھ دیکھ کر شرماتی تو ملکے کا دل باغ باغ ہو جاتا......

''ابا...... یہ تو نے کیا کیا...... ؟ تو نے اپنی سادی کر لی...... ؟ تجو نے غصے سے باپ کے سامنے اکڑتے ہوئے کہا۔

''ابے...... چل...... آیا...... مجھ سے پوچھنے والا...... میں جتنی مرضی سادیاں کروں تو کون ہوتا ہے مجھ سے پوچھنے والا...... کیا تیری ماں ہے اس قابل جو میرے کام کر سکے...... گڈی کے جانے کے بعد کسی نے روٹی تو پکانی تھی نا...... اس لئے بھاگی کو لے آیا ہوں۔'' ملکے نے غصے سے اپنی ایک بیساکھی سے تجو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''شبو روٹی پکا لیتی...... تو اب بہانے نہ بنا...... یہ اس لئے ہماری جھگی کے چکر لگاتی تھی اس کو ذرا بھی سرم نہ آئی۔ گڈی کی سہیلی ہو کر اس کے ابے سے سادی بنالی...... '' تجو غصے سے بھاگی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ارے...... کس سے منہ ماری کرے ہے...... تیری ماں لگوں ہوں...... چل...... چپ کر...... اور نکل جا یہاں سے...... ورنہ اک جھانپڑ دوں گی...... میرا نام بھی بھاگی ہے...... تم لوگوں کو ٹھیک کر کے رکھ دوں گی...... بدجبان ہیں...... سارے کے سارے''۔ دلہن بنی بھاگی نے مکا لہرا کر تجو کی قمیض کا کالر زور سے پکڑ کر دھمکی دیتے ہوئے کہا تو ملکے سمیت سب حیران رہ گئے۔ بچے حیران پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔

''اری...... چل...... چل...... بڑی آئی...... ہماری ماں...... اری...... پہلے شکل تو دیکھ سیسے میں...... تیرے ہاتھ نہ توڑ دوں تو پھر کہنا...... یہ ہماری جھگی ہے...... نکل یہاں سے۔'' تجو نے اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہ جھگی...... ہم نے بنائی ہے...... اپنے یاروں کے ساتھ مل کر...... نکل یہاں سے۔'' مٹھو نے بھی غصے سے کہا۔

''اوئے...... حرام خورو...... کیا کر رہے ہو...... تمہیں ذرا سرم نہیں آتی۔ باپ کے سامنے...... ماں سے بدجبانی کر رہے ہو۔'' ملکے نے غصے سے اپنی بیساکھی سے دونوں کے سینوں پر چھو کر انہیں دھکا دیا۔ دونوں کو غصہ آ گیا اور ملکے کی بیساکھیاں کھینچ کر اسے چارپائی پر زور سے دھکا دیا۔

''سن...... ابا...... تیرا لحاظ کر رہے ہیں...... ہماری اس جھگی میں تیری یہ نئی دلہن نہ رہ سکے گی...... جہاں دل چاہے اسے لے جا ہمیں نہ تیری ضرورت ہے نہ اس کی...... '' تجو نے ملکے کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تو بچوں کو چھوٹا ہی سمجھ رہا تھا...... اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ تجو اور مٹھو اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر سکتے ہیں۔ ملکے نے بے بسی سے بھاگی کی طرف دیکھا

''چل...... بھاگی دوسری جھگی میں چلتے ہیں۔'' ملکے نے اسے کہا۔

''اُس میں...... وہاں تو بو رکتے ہے...... '' بھاگی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''بو رکتے ہے تو کیا...... ہوا...... ؟ تجھے کھا تو نہیں جائے گی نا...... چل ادھر...... '' ملکے نے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم لوگوں کو میں بعد میں دیکھوں گا۔'' ملکے نے باہر نکلتے ہوئے تجو اور مٹھو کو دیکھتے ہوئے گویا دھمکی لگائی۔

''دیکھی جائے گی...... '' تجو نے اکڑ کر جواب دیا۔

برکتے کی جھگی میں دیا سا جل رہا تھا۔ بہت کم روشنی تھی اور وہ بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ رانی کو یاد کر کے تڑپ رہی تھی۔ گڈی کے نصیبوں پر ماتم کر رہی تھی...... اپنی بے بسی اور لاچاری پر سسک رہی تھی۔ جب اچانک ملکا اور بھاگی جھگی میں داخل ہوئے وہ انہیں دیکھ کر چونکی، بھاگی دلہن بنی چھن چھن کرتی ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔ برکتے نے حیرانگی سے ملکے کی جانب دیکھا۔

''ملکے...... یہ...... یہ...... تو...... اسے یہاں کیوں لایا ہے؟'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے بیاہ کر کے لایا ہوں...... اب تو...... تو...... کسی کام کی نہیں رہی...... اور مجھے اس کی ضرورت تھی......'' ملکے نے بھاگی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تو برکتے کے مردہ بدن میں آگ لگ گئی وہ چارپائی پر لوٹنے لگی۔

''ارے...... تو...... کتنا ظالم ہے...... بیٹی کو کھوہ میں دھکا دے کر خود اپنی سادی رچا بیٹھا ہے...... واہ...... رے، تجھ جیسا باپ رب کسی کو نہ دے...... بڑا ہی ظالم ہے...... تو پتھر دل......'' برکتے غصے سے بڑبڑائی۔

''چل...... چپ کر کے سو...... زیادہ بڑبڑ نہ کر...... خوامخواہ بدشگونی نہ پھیلا۔'' ملکے نے غصے سے کہا اور آگے بڑھ کر دیا بجھا دیا۔

برکتے کے دل پر خنجر چلنے لگے وہ سسکیاں بھرنے لگی...... مرد ذات بڑی ہی بے وفا ہے۔ اسے ذرا بھی میرا خیال نہیں آیا اور اسے میرے سامنے لے آیا...... مجھے دکھ دینے کو ربا ابھی کتنے اور دکھ باقی ہیں...... دیکھنے کو'' برکتے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھ کر یا تو اپنے آپ کو مار لیتی یا ملکے اور بھاگی کو۔ جن کی دبی دبی سرگوشیوں اور بھاگی کی ہنسی کی آواز سن کر اس کے دل کے ٹوٹے ہو رہے تھے۔ دل یوں تڑپ رہا تھا جیسے ابھی پھٹنے کو بے تاب ہو۔

ہر طرف گہرا اندھیرا تھا...... اور ایک جھگی میں تین وجود اپنی اپنی سانسیں لے رہے تھے۔ دو خوشی اور مستی سے سرشار ایک دوسرے میں جذب ہو رہے تھے...... اور تیرا ان کی خوشیوں اور ملن پر ماتم کر رہا تھا...... دو ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہے لگا رہے تھے اور ایک سسک رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر کوئی اس کو سننا ہی نہیں چاہتا تھا...... دو اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے اور تیسرا اپنی ہار پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کھیل میں فاتح کون تھا......؟

مرد یا عورت......؟

یا

صرف عورت......؟

عورت، عورت کو ہرا کر خوش ہوتی ہے یا۔

مرد کو مہرہ بنا کر عورت پر فتح حاصل کر کے...... یا

مرد عورت کو بے وقوف بنا کر...... یا

مرد، عورت کے ہاتھوں خود بے وقوف بن کر......؟

☆

رمضو نے گڈی کو پہلی رات ہی ایسی مار ماری تھی کہ اس کا پورا جسم زخموں سے چور ہو گیا تھا۔ رمضو نے شراب کے نشے میں دھت اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔

''اری...... گڈی...... دیکھ تو سہی...... میں تیرے لئے لڈو لایا ہوں...... بڑے اسپیشل ہیں...... تو نے ساری زندگی ایسے لڈو نہیں کھائے ہوں گے۔'' رمضو اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ کر بولا۔ وہ اتنا بدصورت لگ رہا تھا کہ گڈی نے نفرت سے منہ دوسری جانب پھیر دیا۔

''مجھے نہیں کھانے...... یہ...... لڈو۔'' گڈی نے غصے سے کہا۔

''اری...... اکڑتی کس بات پر ہے...... تجھ سے سادی بنا کر لایا ہوں...... وہ بھی پورے تین ہزار میں۔'' رمضو نے مسکرا کر کہا۔

''کس نے لئے...... تین ہزار......؟'' گڈی نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے باپ ملکے نے...... اور کس نے......؟'' رمضو نے جواب دیا۔

''تو...... تو...... جھوٹ بول رہا ہے۔'' گڈی کو اس کی بات سن کر رونا آ گیا۔

''میں کاہے کو جھوٹ بولوں گا...... یقین نہیں آتا...... تا تو سویرے جا کر اس سے پوچھ لینا...... اری اس نے تجھے میرے ہاتھ بیچا ہے...... اس لئے اب زیادہ نخرے مت کر...... اور میرے پاس آ جا......'' رمضو نے مست آنکھوں سے مدہوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں...... تھوکتی ہوں تجھ پر...... میں تیرے پاس نہیں رہوں گی...... ابے نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے......'' گڈی نے رونا شروع کر دیا۔

''اری...... تجھ سے میں نے سادی بنائی ہے...... اب...... آ...... جا میرے پاس......'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ گڈی نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ فرش پر جا گرا۔ رمضو کی بیوی نجو جھگی کے باہر بیٹھی رمضو اور گڈی کی باتیں سن رہی تھی۔ رمضو کے گرنے کی آواز سن کر جھٹ اندر آ گئی اور گرے ہوئے رمضو پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''تو...... نے...... اس کا ٹھیک علاج کیا...... یہ ہے ہی اسی قابل۔'' نجو نے ہنستے ہوئے گڈی سے کہا تو رمضو نے غصے سے دونوں کو دیکھا اور بمشکل زمین سے اٹھا۔

''تم دونوں کو تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔'' اور اپنی چھڑی سے دونوں کو پیٹنا شروع کر دیا، نجو تو ایک چھڑی کھا کر ہی باہر بھاگ گئی مگر گڈی پکڑی گئی...... اس نے اس کو ایسی مار ماری کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہی...... اس نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔

''حرام خور...... بدجان...... رمضو کے سامنے جبان چلاتی ہے...... ایسی ماروں گا...... کہ یہاں ہی مر جائے گی...... تو رمضو کو جانتی نہیں...... بڑی آئی بیگم صیب...... اری تجھ پر تو میں ہجار دفعہ تھوکوں......'' وہ بڑبڑاتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا جھگی سے باہر چلا گیا۔ گڈی ساری رات زخموں کی تکلیف اور چوٹوں کے درد سے کراہتی رہی۔ تڑپتی رہی۔ مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔

''ربا...... تو نے ہمارے نصیب ایسے کیوں بنائے ہیں...... ہم تو جنوروں سے بھی برے انسان ہیں...... وہ تو اپنے بچوں کو بیچتے نہیں ہوں گے...... جس طرح ہمارے ماں باپ بیچتے ہیں......

یا اللہ! تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے......؟

اماں تڑپ تڑپ کر سانسیں گن رہی ہے۔

اور

رانی......نجانے کہاں ہوگی؟

زندہ بھی ہے یا نہیں۔

گڈی کو رانی بہت یاد آنے لگی جو اس سے بہت پیار کرتی تھی، جو اس کی بہن ہی نہیں سہیلی بھی تھی......جس کے ساتھ وہ لڑتی بھی تھی...... مگر......پیار بھی بہت کرتی تھی......رانی تم کہاں ہو......؟ مجھے ایک بار تو آ کر دیکھو......آ کر دیکھو......رجو جالم نے مجھے کتنا مارا ہے......دیکھو اے نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کیا ہے۔ ابے نے بڑا جلم کمایا ہے۔

میں کیا کروں......؟

کہاں جاؤں......؟

کس کو اپنے زخم دکھاؤں......؟

کس کو سب کچھ بتاؤں......؟ رانی تو......میری بات سنتی تھی......مجھے دیکھنے ایک بار آ جا......" گڈی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے یاد کرنے لگی۔

☆

رینا بیگم پہلی بار مجرے میں رقص کرنے جا رہی تھی۔ چمن بیگم صبح سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس کے لیے اچھو سے خاص قسم کے موتیے اور گلاب کے پھولوں کے گجرے اور پھولوں کے ہار منگوائے گئے۔ چمن بیگم نے خصوصی طور پر انتہائی قیمتی اور دیدہ زیب سرخ رنگ کا لباس، اس کے لیے منگوایا۔ شیریں بائی اور فضہ بائی نے سرِ شام ہی اسے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے۔ نئے لباس کے ساتھ ویسی ہی چوڑیاں، انگوٹھیاں جھمکے، ہار اور پازیبیں پہنائی گئیں۔ شیریں بائی نے طوائفوں کے مخصوص اسٹائل کے مطابق اس کی چٹیا بنائی اور ساری چٹیا میں موتیے کے ہار پروئے۔ میک اپ مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے سراپے کو آئینے میں دیکھا تو خود ہی حیران رہ گئی۔ وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چمن بیگم آئی تو وہ بھی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"ماشاء اللہ......چشم بدور......رینا بیگم آپ نے تو سب کو ہی مات دے ڈالی......استاد چندو خان کی نظریں واقعی بڑی دور بین ہیں...... انہوں نے آپ کے اندر چھپی طوائف کو دیکھ لیا۔ جو ہم نہ دیکھ سکے......سچ......آج اگر نگار بیگم یہاں موجود ہوتیں تو خود آپ کی نظر اتارتیں......مگر یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔" چمن بیگم نے مسکرا کر پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ اس پر وارے اور انہیں علیحدہ رکھ دیا۔

رینا خود بھی بہت خوش تھی۔ وہ جو خواب اپنی آنکھوں میں سجائے اس کوٹھے پر آئی تھی وہ آج پورا ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس قدر خوش تھا کہ

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کسے بتائے کہ اس نے جو خواہش کی تھی۔ وہ آج پوری ہونے جا رہی تھی۔
نگار بیگم کی طرح نوٹوں کے فرش پر چلنا اس کا خواب تھا اور نگار بیگم پر پھولوں کی پتیوں کی بجائے نوٹوں کو نچھاور ہوتے دیکھ کر وہ اپنے تخیل میں ہی کتنا خوش ہوتی تھی۔ آج نگار بیگم کی طرح اچھے کپڑے اور زیورات پہنے وہ کھڑی تھی۔ اس کے لئے نگار بیگم کے گھنگھر والائے گئے جنہیں چمن بیگم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے پاؤں میں باندھا، گھنگھروؤں کے ساتھ روپے لگا کر ان کا صدقہ اتارا۔
''رینا بیگم...... آج آپ کا پہلا مجرا ہے...... ایسا کمال کا رقص کرنا کہ لوگ نگار بیگم کو بھول جائیں...... نگار بیگم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں ہیں...... ان کے جانے کے بعد بھی لوگ ان کو بھول نہیں پا رہے...... اب یہ آپ پر ہے...... آپ کیسے نگار بیگم کا نقش ان کے ذہنوں سے صاف کرتی ہیں۔'' چمن بیگم نے اسے تیسری منزل پر بڑے ہال کمرے میں بھیجنے سے پہلے کہا۔
''ہم آپ سے رقص کے بعد بات کریں گے۔'' رینا بیگم نے بڑی ادا سے کہا اور چھن چھن کرتی سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل کے ہال کمرے میں پہنچ گئی...... نگار بیگم کی زندگی میں اسے تو کیا کسی طوائف کو اس کمرے میں نگار بیگم کی مرضی کے بغیر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سیڑھیوں میں ہی ایک دربان بیٹھا رہتا تھا جو کسی کو بلاوجہ وہاں جانے نہیں دیتا تھا۔ صرف وہی طوائف جاتی جس کی رقص کی باری ہوتی یا جو کسی مہمان کے ساتھ شب گزاری کے لئے مخصوص ہوتی۔ اس نے آج تک نگار بیگم کو ناچتے نہیں دیکھا تھا...... نہ نوٹوں پر چلتے دیکھا تھا، بس سن ہی رکھا تھا...... اور باقی اس کے ذہن نے خود ہی سب کچھ سوچ لیا تھا...... اس نے ہال کمرے میں قدم رکھا تو چونک گئی۔ اتنا بڑا کمرہ بھانت بھانت کے مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب شکلوں سے نہ تو شریف لگتے تھے اور نہ ہی عزت دار...... سب کے آگے شراب کے جام...... نوٹوں کی گڈیاں اور پھولوں کے ہار پڑے تھے...... ارد گرد رنگ برنگی شمعیں مخصوص انداز میں روشن تھیں۔ کمرے میں پھولوں اور عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی...... وہ جیسے ہی ہال کمرے میں داخل ہوئی ہر آنکھ نے اسے خاص زاویے اور بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر گھبرانے لگا۔ بھیک دیتے ہوئے جب کوئی بری نظر اس پر پڑا تا تھا تو وہ اسے ہزار گالیاں بکتی تھی اور اب ہر کوئی اسے ایسی ہی گندی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چمن بیگم اس کے پیچھے آ گئیں...... اور...... سب سے اس کا تعارف کرانے لگیں۔
''یہ رینا بیگم ہیں۔ نگار بیگم کے مریکہ جانے کے بعد استاد چندو خان اور ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ نگار بیگم سے بڑھ کر کوئی اور گوہر نایاب آ کر اس حویلی میں موجود ہے تو وہ رینا بیگم ہیں...... استاد صاحب نے ان کو رقص کی خصوصی تربیت دی ہے...... آپ ان کا رقص دیکھ کر بہت کچھ بھول جائیں گے...... استاد صاحب شروع کیجئے......'' چمن بیگم نے مسکرا کر استاد صاحب کو کہا۔
''رینا بیگم آپ کے قدم تھمنے نہ پائیں...... آج کی رات کو یادگار بنا دیں۔'' چمن بیگم نے رینا بیگم سے کہا تو اس نے گہری سانس لی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہر قدم جس خوشی سے اٹھا رہی تھی وہ خوشی نجانے کہاں غائب ہو گئی تھی...... استاد چندو خان اور ان کے سازندوں نے خصوصی طور پر اس رات کے لئے تیار کی گئی غزل شروع کی......
رینا بیگم نے دھڑکتے دل کے ساتھ حاضرینِ محفل پر نظر ڈالی، اس کا دل بدکنے لگا...... کوئی چہرہ ایسا نظر نہ آ رہا تھا جس کو دیکھ کر محفل کے

تقدس کا یقین آتا۔

''رینا بیگم شروع کیجیے......'' چمن بیگم نے کہا۔

اسے چمن بیگم کے الفاظ یاد آنے لگے۔

''ایسا رقص کرنا...... کہ لوگ نگار بیگم کو بھول جائیں۔'' اور اس نے یہ چیلنج خود قبول کیا تھا۔ اسے اپنے الفاظ یاد آنے لگے۔ ''ہم آپ سے رقص کے بعد بات کریں گے۔''

اس نے آنکھیں بند کیں...... پھر انہیں کھولا اور گہری سانس لی اور ہال کے عین وسط میں کھڑی ہو کر رقص شروع کر دیا۔ مہمان اس کی اداؤں اور رقص پر قربان ہونے لگے۔ شراب کے جام چلنے لگے...... اس پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی...... نوٹوں میں پھول لپیٹ کر اس پر نچھاور کیے جانے لگے۔ وہ ناچتی ہوئی ادھر ادھر جاتی تو چمن بیگم آنکھوں ہی آنکھوں میں مخصوص مہمان کی جانب جانے کو اشارہ کرتیں جب وہ اس کے پاس جاتی تو وہ رقص کے دوران اس کے بدن کو چھونے کی کوشش کرتا...... اور پھر اس پر دل کھول کر نوٹ نچھاور کرتا۔ ہال کمرے کا فرش نوٹوں سے بھر گیا اور وہ ان نوٹوں پر رقص کرتی انہیں اپنے قدموں تلے روندتی جاتی...... نوٹ اس کے مہندی والے پاؤں کے ساتھ ادھر ادھر اڑتے، رات گئے تک محفل جاری رہی...... نہ دیکھنے والے تھک رہے تھے اور نہ وہ رقص کرتی ہوئی تھک رہی تھی...... محفل اپنے عروج پر تھی، سارے مہمان نشے میں وحشت ادھر ادھر پڑے تھے...... عجیب مدہوشی کا عالم تھا......

''واہ...... واہ...... کیا رقص کیا ہے...... برسوں سے اس کوٹھے پر آ رہے ہیں مگر جو لطف آج آیا ہے۔ اس سے قبل کبھی نہیں آیا۔ رینا بیگم نے تو نگار بیگم کو بھی مات دے دی ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر موٹا شخص بولا جس کی توند بے ہنگم طریقے سے اس کی قمیض میں پھنسی ہوئی تھی، رنگ سیاہ، بالکل گنجا اور چہرہ انتہائی کریہہ و بدشکل تھا۔ چمن بیگم نے اس کے منہ سے تعریف سن کر بڑے فخریہ انداز میں رینا بیگم کی طرف دیکھا جو تھک کر چور ہو گئی تھی...... اور جس کے پاؤں سے خون رسنے لگا تھا۔

''کہیے چمن بیگم...... ہم نے آپ سے رینا بیگم کے بارے میں ہی کہا تھا نا۔'' استاد چندو نے مسکرا کر اپنے موسیقی کے ساز سمیٹتے ہوئے کہا۔

''جی...... حضور نے بالکل سچ فرمایا تھا...... اور...... بندی نے بھی تو آپ کی رائے کو سب سے مقدم سمجھا تھا...... آپ تو جانتے ہیں...... آپ کے اور ہمارے فیصلے کی کتنی مخالفت کی گئی تھی کہ رینا بیگم کہاں رقص سیکھ سکیں گی...... انہیں تو رقص، سر اور تال کی الف، ب کی بھی سمجھ نہیں۔'' چمن بیگم نے مسکرا کر استاد چندو سے کہا۔

''چمن بیگم...... یہ گوہر نایاب آپ نے اتنے دنوں سے کہاں چھپا کر رکھا تھا......'' موٹے آدمی نے پھر پوچھا۔

''سرکار...... یہ ہمیں کی پروردہ ہیں...... بس ہیرے کو تراشنے میں وقت تو لگتا ہے نا...... ویسے ہی آپ کے سامنے پیش کر دیتے تو آپ ہی کہتے...... یہ کوئلہ کہاں سے اٹھا لائی......؟ چمن بیگم نے خاص کندن بیگم کے سٹائل میں ہاتھوں کے اشاروں، ناک اور بھنوؤں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''چمن بیگم...... رینا بیگم نے تو ہمارا دل لوٹ لیا ہے...... فرمائیے...... کیا آپ ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشیں گی......'' موٹے آدمی نے بڑی ادا سے رینا بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لگتا ہے آج سرکار کی جیبیں ابھی تک نوٹوں سے بھری ہیں...... مگر سرکار یہ بھی سوچ لیجئے کہ ہیرا بالکل خالص ہے...... سیپ میں بند سچے موتی کی طرح...... کیا اس موتی کی قیمت آپ ادا کر پائیں گے؟ چمن بیگم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

رینا بیگم حیرت سے ان کی گفتگو سن رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی گفتگو ہو رہی ہے...... اس کے چہرے پر حیرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ چمن بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور تالی بجائی۔ ایک خوش لباس ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی۔

''کریمن بی...... رینا بیگم کو مہمان خانے میں لے جایئے اور انہیں تازہ دم کیجئے...... بہت تھک گئی ہیں۔'' چمن بیگم نے کہا تو کریمن بی رینا بیگم کو مہمان خانے میں لے گئی۔ وہ اس مہمان خانے میں پہلی مرتبہ داخل ہو رہی تھی۔ بہت خوبصورت آراستہ کمرہ تھا۔ جس کے عین وسط میں لکڑی کی خوبصورت کھدائی والا بیڈ لگا تھا۔ شیشے کی کھڑکیوں پر مخمل کے دبیز پردوں کے نیچے سفید جالی کے پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے میں مدہم روشنیوں کے خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے اور خوشبوؤں کی ملی جلی مہک سے کمرہ بہت معطر ہو رہا تھا۔ شیشے کی میزیں اور بیڈ کی سائیڈز پر خوبصورت کرسٹل کے ٹیبل لیمپس رکھے تھے۔ اتنا خوبصورت اور رومانوی سا ماحول تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی وہ تھکے وجود کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی۔

''رینا بیگم...... کھانے کو کچھ لاؤں......'' کریمن بی نے پوچھا۔

''نہیں...... میرے پاؤں دبا دیجئے...... میں بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور کریمن بی اس کے پاؤں دبانے لگی۔ چمن بیگم موٹے آدمی سے بحث و تمحیص میں مشغول رہیں۔

''سرکار آپ برسوں سے اس کوٹھے پر آ رہے ہیں...... اور آپ کو یہاں کی روایات کا بھی بخوبی علم ہوگا...... تین لاکھ میں اصل اور سچا ہیرا کہاں سے ملے گا......؟'' چمن بیگم نے اپنے سامنے نوٹوں کا کھلا بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ساڑھے تین لاکھ دے دیتے ہیں۔'' ایک درمیانی عمر کا شخص نشے میں دھت بولا۔

''ہم چار لاکھ دیتے ہیں۔'' ایک اور آدمی نے مری ہوئی آواز میں کہا اور نشے سے مدہوش ہو کر گر گیا۔ سب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

''چمن بیگم...... پانچ لاکھ...... اب آپ اس سے زیادہ کی بات نہیں کریں گی...... پرانے مہمانوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔'' موٹے آدمی نے کہا اور اپنی جیبیں خالی کر کے اس کے سامنے رکھ دیں۔

''ٹھیک ہے...... سرکار...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... چمن بیگم نے اتنے نوٹوں کی جانب للچائی نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگی۔

''سرکار اوپر تشریف لے جایئے......'' چمن بیگم نے اسے اشارہ کیا اور وہ خوشی و نشے سے جھومتا ہوا وہ جھوم جھوم کر گنگناتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

رینا بیگم سو رہی تھیں جب وہ شخص مہمان خانے میں داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی کریمن بی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ہوس بھری نظروں سے رینا بیگم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کے اوپر جھکا، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی......

''ک......کون ہیں......آپ......؟ اور......یہاں......ہمارے کمرے میں کیوں......؟'' رینا بیگم نے گھبرا کر بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''حضور......ایسی بھی کیا لاعلمی......ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ کو ہماری مہمان نوازی کا شرف بخشا گیا ہے۔'' وہ بے ہنگم ہنسی، ہنستے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیا رات یونہی سوال و جواب کرتے گزر جائے گی......حضور محبت کی باتیں کب کریں گے......؟'' وہ آدمی بولا۔

''شرم کیجئے......آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......اور......آپ نے ہمارے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے کی......؟ ابھی نکلئے یہاں سے......میں آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی......'' رینا بیگم غصے سے چلانے لگیں۔

''ثابت ہو گیا......ہیرا اصلی ہے......حضور......چلایئے مت ہم آپ کے قدردان ہیں......آپ سے محبت کی کلیاں چننے کے پورے پانچ لاکھ ادا کیے ہیں......آپ کی خاطر تو آج اپنا سارا کچھ لٹا دیا ہے......یہ دیکھیے ہماری خالی جیبیں......'' وہ مسکرا کر اپنی خالی جیبیں دکھانے لگا۔

رینا بیگم کے ہوش اڑنے لگے......اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا......اس آدمی نے آگے بڑھ کر اسے بیڈ پر گرایا اور قہقہے لگانے لگا۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی اور اس کے گندے پیلے دانتوں پر پان نے سرخ رنگ کے نشانات چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے چیخنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے اس کی آواز جیسے گلے میں پھنس گئی......وہ رات بھر اس کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلتا رہا اور وہ خون کے آنسو بہاتی رہی۔ وہ اسے یوں چھوڑتا رہا جیسے کتا گوشت لگی ہڈی کو چھوڑتا ہے۔ صبح ہونے تک وہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ اگلے روز شام کو اسے ہوش آئی تو اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ رقص کی محفل......وہ......رات......وہ شخص......اور اس کی کریہہ شکل، باتیں و حرکات اس کے ذہن میں جونک کی مانند چمٹ گئیں تھیں......وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......اس کے آنسو تھمنے کو نہیں آ رہے تھے......اسے نگار بیگم بری طرح یاد آنے لگی......جس کی حالت بھی اس کی طرح ہوتی تھی اور جو اٹھتی بیٹھتی سسکتی رہتی تھی۔ آہیں بھرتی تھی کیا نگار بیگم بھی میری طرح اس صورتحال سے دوچار ہوتی تھی۔ نگار بیگم کی طرح رقص کرنا، نوٹوں پر چلنا اور اس کی طرح بنی ٹھنی رہنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی اور اس کی خواہش کے لئے اس نے سب کچھ چھوڑا تھا۔ اس خواہش نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ عزت، شرافت، معصومیت، شرم و حیا، پاکیزگی اور تقدس......بدلے میں اسے کیا ملا تھا۔ ذلت، رسوائی، ضلالت اور دولت......''

انسان کتنا نادان ہے، ان دیکھی منزلوں ناتمام خواہشوں اور ان دیکھے خوابوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے......اپنی زندگی کا مقصد اپنی خواہشات کی تکمیل میں گزار دیتا ہے مگر خواہش اس صورت میں پوری ہوتی ہے کہ تمام خوشیاں اور آرزوئیں گم ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کیلئے انسان کو اتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ ساری زندگی کی کمائی بھی اس قیمت کو ادا نہیں کر پاتی۔

اس نے کیا کھویا تھا اور کیا پایا تھا......؟

جو کھویا تھا وہ سب کچھ کتنا قیمتی تھا......

اور جو پایا تھا وہ سب کتنا کریہہ تھا اور ارزاں بھی۔

رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں مگر دل کا غبار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا ٹوٹ چکی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ ایک طوائف کی زندگی کتنی بھیانک اور کریہہ ہوتی ہے یہ اسے اب معلوم ہوا تھا جب اس کے ساتھ سب کچھ بیتی تھی۔ وہ تو نگار بیگم کو اپنا 'آئیڈیل' بنا کر آئی تھی۔ مگر وہ آئیڈیل اس کی اپنی خواہش اور لالچ تھا اور اس لالچ نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اب اسے بھکارن کی حیثیت سے زندگی اچھی لگ رہی تھی...... جس کا کشکول تو خالی ہوتا تھا مگر جس کے پاس سب کچھ تھا...... بس وہ نادان تھی۔ سمجھ نہ سکی کہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو لمبی اور اونچی اونچی اڑانیں بھرنے کے لئے کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی زمین کے ننگے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی ہو کر آسمان پر اڑتی نگار بیگم بننے کی 'خواہش' کی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ نوٹوں پر چلنے کے لئے نگار بیگم کو کن مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ نگار بیگم کو اپنی شان و شوکت اور تمکنت کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ جسے وہ پری سمجھتی تھی...... وہ کیا نکلی تھی...... اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ ان لمحوں کو کوسنے لگی تھی...... جب وہ یہاں آئی تھی اسے اچھوکی باتیں یاد آنے لگی تھیں جب وہ اس حویلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی...... اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی...... لالچ کی، ہوس کی...... اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا...... سوائے ماتم اور گریہ کرنے کے۔ اسے دلبر یاد آنے لگا...... جس نے اس کے طوائف بننے اور نگار بیگم کی جگہ لینے کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی...... اسے وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب نگار بیگم کے بعد چمن بیگم نے استاد چندو خان، شیریں بائی اور رینا، دلبر اور حویلی کے تمام سمجھدار بزرگ لوگوں کو اکٹھا کیا تھا اور ان سے رائے مانگی تھی کہ نگار بیگم کی جگہ کس طوائف کو لینی چاہئے...... چمن بیگم نے خود کندن بیگم کی جگہ سنبھال رکھی تھی اور اب وہ کوٹھے کے تمام امور کی نگران بن بیٹھی تھی...... وہ کندن بیگم کی ملازمہ خاص تھی۔ نگار بیگم اس کے ہاتھوں میں پروان چڑھی تھی۔ طوائفوں کو کوٹھے کے تمام آداب سکھانے کی وہ ذمہ دار تھی اور اب وہ مالکہ بن گئی تھی۔ نگار بیگم بھی اسے خاص اہمیت دیتی تھی۔

''نگار بیگم کے بعد اب کسی ایسی طوائف کی ضرورت ہے جو اس حویلی کا چاند بن کر چمکے...... اور...... اس چاندی کی چمک دیکھنے کے لئے مہمان جھوم جھوم کر آئیں۔'' چمن بیگم نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے نگار بیگم کو ان کی زندگی میں ہی کہا تھا کہ اگر ان کی جگہ کوئی لے سکتا ہے تو وہ رینا بیگم ہیں...... ان کے اندر کتنا فن ہے اس کو خود بھی معلوم نہیں...... یہ اس کوٹھے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں...... تھوڑی سی محنت ان کو اس حویلی کی ہی نہیں اس پورے چاندنی بازار کی چندا بنا سکتی ہے۔'' استاد چندو خان نے کہا تو رینا بیگم مسکرا دی۔

''نہیں...... وہ طوائف نہیں...... اور کوٹھے کو ایک طوائف ہی چلا سکتی ہے۔'' دلبر نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو رینا نے غصے بھری نگاہوں سے دلبر کی طرف دیکھا۔

''آج کی رینا کو دیکھ کر کون یہ بتا سکتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی ہے......اور......کل کو جب یہ رینا بیگم بن کر اس کوٹھے کو چمکائے گی تو کون پوچھے گا......کہ یہ یہاں کی طوائف نہیں۔'' چمن بیگم نے جواب دیا۔

''ایک ملازمہ کو آپ کوٹھے کا جھومر کیسے بنا سکتی ہیں؟

دلبر نے کہا تو رینا بیگم نے پھر غصے سے دلبر کی طرف دیکھا۔

''فن قدرت کی عطا ہے......اور وہ جب کسی کو کوئی خوبی یا فن عطا کرتی ہے تو اس کا خانوادہ نہیں دیکھتی......وہ اس بندے پر اپنی عنایت کرتی ہے......اس کو اپنے کرم سے نوازتی ہے۔میاں تم وہ کچھ نہیں دیکھ رہے......جو ہم دیکھ رہے ہیں......اس بچی میں بہت صلاحیت ہے......چمن بیگم آپ ہماری بات کا یقین کریں اور رینا بیگم کو نگار بیگم کا جانشین مقرر کر دیں......'' استاد چندو خاں نے کہا۔

''شیریں بائی......آپ کا کیا خیال ہے؟ چمن بیگم نے سب طوائفوں کی نمائندہ شیریں بائی سے پوچھا۔

''آپ سب اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں......کوئی رینا بیگم سے بھی تو پوچھے......کہ......یہ کیا چاہتی ہیں؟ شیریں بائی نے قدرے نخوت سے جواب دیا۔

''ہاں......رینا بیگم کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔'' استاد چندو خاں نے کہا۔

''رینا بیگم......کیا آپ ''نگار بیگم'' بننا پسند کریں گی؟'' چمن بیگم نے پوچھا تو رینا بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور آواز فرطِ جذبات سے کپکپانے لگی۔

''نگار بیگم'' وہ بڑبڑائی۔

''ہاں......'' چمن بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

یہ لمحہ اس کے لئے کتنا انمول تھا......قدرت اس کو وہ کچھ عطا کر رہی تھی جو اس نے چاہا تھا۔اس کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔اس نے جس بات کی تمنا کی تھی وہ آرزو پوری ہونے لگی تھی۔وہ کس قدر خوش نصیب تھی۔قدرت اس پر کتنی مہربان تھی......اس پر کرم کر رہی تھی......اسے نواز رہی تھی......عطا کر رہی تھی......اور اس عطا پر وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی......اس نے دلبر کی طرف بالکل نہ دیکھا......اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نگار بیگم......زیورات میں لدی......شان و تمکنت سے قدم اٹھاتی بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھی......رنگ برنگی نوٹوں پر چلتی نظر آئی......اس کے لب مسکرانے لگے......

''ہاں......رینا بیگم......کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟'' چمن بیگم نے پھر پوچھا۔

''میں......میں......'' وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی

''ہاں......اپنے دل کی بات کریں......اپنی مرضی بتائیں۔'' استاد چندو نے پوچھا۔

''میں......نگار بیگم......؟ وہ بمشکل بول پائی۔

''ہاں...... آپ کی لگن اور ہماری محنت آپ کو نگار بیگم بنا دے گی۔'' استاد چندو نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''مجھے خوشی ہوگی......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تو دلبر نے غصے سے اسے دیکھا۔

''مبارک ہو...... مبارک ہو۔'' چمن بیگم سب کو مبارکباد دینے لگی...... جلدی سے مٹھائی منگوائی گئی اور سب کا منہ میٹھا کرایا گیا...... چمن بیگم نے نگار بیگم کے گھنگھرو منگوائے اور اپنے ہاتھوں سے اسے گھنگھرو پہنائے...... اس کی نذر اتارنے اور نیاز بانٹنے کا حکم دیا......

دلبر کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی...... اس کی آنکھوں میں دکھ اور غصہ تھا...... وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''نجانے کیوں...... دلبر...... رینا بیگم کی مخالفت کر رہا تھا...... خدا جانے...... اس کو ان سے کیا حسد ہونے لگا ہے...... میری بچی کو حاسدین کی نظر بد سے بچائے۔'' چمن بیگم نے رینا بیگم کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو رینا بیگم مسکرا دی۔ اس کے بعد دلبر نہ اس سے ملنے آیا...... اور...... نہ اس سے بات کی...... وہ جب گھنگھرو پہن کر استاد چندو خاں سے رقص سیکھ رہی ہوتی تو اس طرف آتے ہوئے اسے دیکھ کر وہ دوسری جانب نکل جاتا...... وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ رینا بیگم کو نگار بیگم کا کمرہ مل گیا تھا...... اس کا بستر...... اس کی چیزیں...... اس کے زیورات...... اس کے کپڑے...... اس کا سب کچھ...... رینا بیگم بہت توجہ سے رقص سیکھ رہی تھی اور اس نے بہت جلدی رقص کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دلبر کے خلاف ہوگئی تھی جو اس کی کامیابیوں کے خلاف تھا...... اس نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا بھی تھا اور اس کا خواب پورا ہونے پر اس نے مبارکباد کی بجائے اس کی مخالفت کی تھی۔ وہ اس سے محبت نہیں...... حسد کرتا تھا...... اور ایسے حاسد سے نظریں بچانا ہی بہتر ہے...... وہ بھی دلبر کو دیکھ کر منہ پھیر دیتی، اسے دلبر کے الفاظ...... اس کی محبت...... اس کی محبت کے دعوے سب جھوٹے لگنے لگے تھے۔

رینا بیگم کے پہلے مجرے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، مگر دلبر رینا بیگم کو کہیں نظر نہ آیا، وہ اندر ہی اندر منتظر رہی کہ وہ ایک بار اسے دیکھنے آئے کہ وہ بنی سنوری کس قدر حسین لگ رہی ہے...... جیسے کوئی نئی نویلی دلہن...... وہ منتظر ہی رہی...... مگر وہ نہ آیا...... اس نے بھی پروا نہ کی...... مگر ہوش میں آنے کے بعد اسے دلبر بہت یاد آرہا تھا۔ شاید دلبر نگار بیگم کی زندگی کے بارے میں جانتا تھا...... شاید وہ اندر کی باتیں جانتا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ ایک طوائف کی زندگی کیسی ہوتی ہے......؟ اسے شاید یہ بھی معلوم تھا کہ طوائف کی تو سانسیں بھی بکی ہوتی ہیں...... طوائف تو سر بازار ناچنے والی وہ پتلی ہے جس سے سب دل تو بہلاتے ہیں...... مگر جس کو نہ محبت سے دیکھتے ہیں اور نہ عزت سے۔ دلبر اس سے محبت کرتا تھا...... جب وہ ملازمہ تھی...... جب سے وہ رینا بیگم بن کر حویلی میں اٹھلاتی پھرتی تھی وہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

کاش...... !دلبر تم مجھے بتاتے کہ ایک طوائف کی اندر کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟

کاش !میں تمہاری باتوں پر یقین کرتی...... تمہاری مخالفت کو سمجھ لیتی۔

کاش...... !میں تمہیں اور تمہاری محبت کو غلط سمجھتی...... کاش...... !میں یہاں نہ آئی ہوتی...... اور نگار بیگم کو دیکھ کر اس جیسی بننے کی تمنا نہ کی ہوتی......

کاش...... !مجھ میں حرص و لالچ...... اور...... ہوس نہ پیدا ہوتا......

کاش......! میرے اندر کی بھوک...... مجھے اتنا مضطرب نہ کرتی اور میں اپنا سب کچھ نہ چھوڑتی......

کاش......! میں بھکارن ہی رہتی...... ور ور مانگنے والی...... وہ سسکنے لگی...... اس کے آنسو اس قدر شدت سے رواں ہوگئے کہ تھم ہی نہ رہے تھے۔ اس کا دل اور کلیجہ پھٹنے کو بے تاب تھے وہ اتنا زیادہ تو اپنی جھگی میں بھی نہیں روئی تھی...... جس میں ڈھنگ سے بیٹھنے کو جگہ نہ تھی...... جس کے کپڑے میں نجانے کتنے سوراخ تھے مگر جس نے اس کے جسم کو چھپا کر رکھا تھا...... جس نے اسے سر بازار کھڑا نہیں کیا تھا...... جس کی طرف آتے ہوئے کوئی اجنبی مرد کئی بار سوچتا تھا...... اسے یہ اتنی بڑی رنگ برنگی شیشوں والی حویلی اس کے بڑے بڑے کمرے، لمبی لمبی راہداریاں رنگ برنگی ٹائلوں والے فرش، خفیہ کمرے، خوبصورت آراستہ بالکونیاں...... آرام دہ مہمان خانے...... سب کچھ زہر لگ رہا تھا۔ یہ حویلی اس کی عزت کی پاسدار نہیں نکلی تھی...... اسے تحفظ نہ دے سکی تھی...... اس کی چھت اس کے لئے سائبان نہیں بنی تھی...... اس حویلی کی شان وشوکت نے اس کی زندگی اجاڑ دی تھی...... اسے ویران کر دیا تھا اور اب وہ اجڑی بیٹھی رو رہی تھی......

دروازے پر دستک ہوئی اس نے اپنے آنسو پونچھے اور مڑ کر دیکھا چمن بیگم کمرے میں داخل ہوئی...... وہ بہت خوش تھی اور خوشی کا رنگ اس کے چہرے کو گلنار بنا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔

''ارے...... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ریتا بیگم آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ خدا نے آپ کے پہلے مجرے میں ہی اتنی برکت ڈال دی...... اور آپ کو وہ عزت دی...... جو بہت کم طوائفوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' چمن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عزت'' کے نام پر اس نے چونک کر چمن بیگم کو دیکھا......

کیسی عزت......؟ اور...... کتنی عزت......؟ وہ نادانستہ بولی...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے چمن بیگم سے کیا پوچھا تھا۔

''خدا نے آپ کو بہت 'عزت' سے نوازا ہے...... ہر مہمان آپ کے بارے میں فون کر کے پوچھ رہا ہے...... لگتا ہے اگلے مجرے پر پہلے سے بھی زیادہ رونق ہوگی......'' چمن بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

''اگلا مجرہ......'' آدھا جملہ اس کے حلق میں پھنس گیا...... اور اس نے بمشکل پوچھا۔

''یوں لگ رہا ہے...... جیسے آپ کا مجرہ تو ہر روز ہوگا...... آپ پر تو قسمت بڑی مہربان ہے...... صرف آپ کے مجرے کے بارے میں ہی لوگ پوچھ رہے ہیں......'' چمن بیگم نے مسکرا کر کہا تو اس کا رنگ فق ہوگیا۔

''آپ کو تو خوش ہونا چاہئے...... جتنا دس طوائفیں ایک رات میں کماتی ہیں...... آپ اکیلی ان سے زیادہ کما لیں گی...... طوائف کا کوٹھا بھرا رہے اسی میں اس کی کامیابی ہے۔'' چمن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کا دل کٹنے لگا...... اس کو چمن بیگم کے بار بار ''طوائف'' کہہ کر بلانے سے چڑ ہونے لگی تھی۔

''یہ آپ کی پہلی کمائی ہے......'' چمن بیگم نے چند ہزار روپے اس کی ہتھیلی پر رکھے تو وہ چونکی...... اسے شامو سے کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آنے لگے۔

''اچھی طرح جانتی ہوں تجھے...... ناچ...... گا کر حرام کی کمائی کھاتا ہے۔'' اس نے روپوں کو دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی......

''کیا ہوا......؟ یہ آپ کی محنت کی کمائی ہے۔'' چمن بیگم نے کہا۔

''محنت کی کمائی......'' وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی۔

''ہاں......'' چمن بیگم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''ارے تو محنت کر کے روٹی کمائے تو پھر تجھے پتہ چلے کہ محنت کی کمائی کیا ہوتی ہے، اسے شامو سے کہے اپنے الفاظ پھر یاد آنے لگے اس کا جسم لرزنے لگا...... اور دل ڈوبنے لگا۔ کیا محنت کی کمائی ایسی ہوتی ہے......؟ اس کے دل نے سرگوشی کی......

''نہیں......'' وہ اپنے آپ سے بڑبڑائی۔

''کیا مطلب...... کیا آپ یہ پیسے نہیں لیں گی......؟ چمن بیگم کے لہجے میں انجانی سی خوشی اور امید تھی۔

''میں...... میں...... اتنے روپوں کا کیا کروں گی؟ وہ ان روپوں سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

''آپ ان سے جو چاہیں...... کریں...... اپنے لئے ملبوسات، زیورات بنوائیے...... نذرونیاز دیں، غریبوں میں بانٹیں۔'' چمن بیگم نے کہا تو اسے اپنی منت یاد آنے لگی۔

''میں پانچ ہزار روپے درگاہ پر نیاز کے لئے دوں گی...... جب میں نگار بیگم کی طرح......'' اس سے آگے وہ کچھ یہ سوچ سکی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا۔

''منت ضرور پوری کرنی چاہئے اس کے دل نے کہا۔''

''رکھ لیجئے...... انسان کی بہت ضرورتیں ہوتی ہیں۔'' چمن بیگم نے روپے اس کے حوالے کئے اور اس نے ان میں سے صرف پانچ ہزار روپے رکھے باقی چمن بیگم کو واپس کر دیے۔ چمن بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ تو بہت سے اندیشے دل میں لئے اس کے پاس آئی تھی کہ رینا بیگم چند ہزار روپے دیکھ کر لاکھوں کا حساب پوچھیں گی مگر وہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

''ماشاءاللہ...... کیا قناعت پسند طبیعت پائی ہے...... اللہ نظر بد سے بچائے۔'' اور چمن بیگم نے پانچ ہزار کا نوٹ اس کے سر سے وار کر علیحدہ رکھا۔

''اب آپ آرام کیجئے...... میں چلتی ہوں...... جب مجرہ ہوگا...... تو اطلاع دے دوں گی...... تیار رہیے گا۔'' چمن بیگم کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ منت کے پیسے دیکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

''میں نے کیوں ایسی منت مانی تھی...... جو اتنی جلدی پوری ہوگئی...... کاش میں ایسی منت نہ مانتی...... کاش! میں پھر سے وہی بھکارن بن جاؤں...... کاش! میری یہ دعا پوری ہو جائے...... تو میں پانچ لاکھ کی نیاز درگاہ پر دوں گی۔'' اس کے دل نے پھر دعا کی۔

''رانی...... کیوں اپنے آپ کو دھوکے پر دھوکے دیئے جا رہی ہو......؟ جب کہ تم یہ اچھی طرح جانتی ہو...... کہ اب تمہارا اس زندگی کی

طرف لوٹنا ناممکن ہے...... کون تمہیں وہاں قبول کرے گا...... ''جو یہ سیڑھیاں ایک بار چڑھتا ہے...... وہ پھر مر کر ہی اترتا ہے......'' اچھو کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

اس نے گہری سانس لی اور سونی آنکھوں سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھنے لگی۔ نگار بیگم کے بستر پر لیٹتے ہوئے اس کا جسم بری طرح ٹوٹنے لگا......

گناہ کا احساس...... کہیں سے سر اٹھانے لگا اور اس کا دل ڈولنے لگا، نگار بیگم کا قتل کس نے کیا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی مگر یہ بات حویلی کے مکینوں نے دبادی تھی...... کیونکہ حویلی کی بدنامی کا خطرہ تھا اور الزام چمن بیگم پر ہی آتا تھا کیونکہ جوس کا گلاس وہی اس کے لئے لے کر گئی تھی اور سب چمن بیگم کو بچانا چاہتے تھے۔ اگر معاملہ پولیس میں جاتا تو حویلی پر کب کا تالا لگ چکا ہوتا۔ تفتیش سب سے ہوتی، اس لئے نگار بیگم کو رات کے اندھیرے میں ہی حویلی کے ایک خفیہ کمرے میں دفنا دیا گیا اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہ شادی کر کے امریکہ چلی گئی ہیں...... لوگ مشکوک انداز میں سوال کرتے مگر جواب ایک ہی ملتا...... کہ وہ امریکہ چلی گئی ہیں...... کب لوٹیں گی...... کوئی نہیں جانتا۔''

اور یہ راز صرف وہی جانتی تھی...... جس نے نگار بیگم کو قتل کیا تھا...... انتقام کی خاطر...... یا...... اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے...... اس کا کمرہ...... اس کی چیزیں...... اس کے ملبوسات سب اس سے یہی سوال کرتے...... کہ وہی نگار کی قاتلہ ہے نا......؟'' اور وہ ذہنی اذیت کا شکار ہونے لگتی۔

شروع کے دن تو نگار بیگم کی جانشین بننے کی خوشی میں ہی گزر گئے۔ اب جو ہوش آئی تو نگار بیگم ایک بھوت بن کر کمرے کے ہر کونے میں، ہر جگہ میں، بستر پر، واش روم میں اس کے سامنے کھڑی ہوتی اور اس کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھتی...... وہ اپنے آپ سے بھاگنے کی کوشش کرتی تو کبھی تو نگار بیگم خوفناک آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی، اس نے چمن بیگم سے کہہ کر اپنا کمرہ تبدیل کروا لیا اور اس کمرے کو تالا لگوا دیا۔ وہ دلبر کی تلاش میں تھی اور وہ کئی روز سے اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ چمن بیگم اس کے کمرے میں آئیں۔

''دلبر کہاں ہے؟ کئی روز سے نظر نہیں آ رہا۔'' رینا بیگم نے پوچھا۔

''یہاں حویلی میں ہی ہوتا ہے...... کیا آپ کو اس سے کوئی کام ہے...... کیا اسے بھیجوں......؟ چمن بیگم نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

چمن بیگم کے جانے کے بعد وہ پورا دن منتظر رہی کہ دلبر کب آتا ہے......؟ وہ شام کو اس کے کمرے میں آیا......

''آپ نے مجھے بلایا تھا......'' دلبر نگاہیں نیچی کر کے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''رینا بیگم اس کی طرف بغور دیکھتی رہی اور پھر اس کے قریب آئی۔

''کیا مجھ سے ناراض ہو؟'' رینا بیگم نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اس بے رخی کی وجہ جان سکتی ہوں......؟'' رینا بیگم نے پوچھا۔

''میں آپ کا خادم ہوں...... آپ جو حکم دیں گی اسے بجالاؤں گا۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر ہماری طرف دیکھو......'' رینا بیگم نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

دلبر نے ایک ٹک اسے دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔

''تم بہت بدل گئے ہو......'' رینا بیگم نے پوچھا۔

''نہیں...... وقت بدل گیا ہے۔'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''ہم سے خفا کیوں ہو؟'' رینا بیگم نے آہ بھر کر پوچھا۔

''میری اتنی اوقات کہاں...... کہ...... آپ سے خفا ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''کیا وہ باتیں...... وہ محبت...... وہ ملاقاتیں سب کچھ بھول گئے ہو؟'' رینا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کیوں......؟'' رینا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''اب ان کی ضرورت نہیں رہی......''

''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی......؟'' رینا بیگم نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب آپ کو 'محبت' کی ضرورت نہیں رہی۔'' دلبر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''کیا میں انسان نہیں رہی...... کیا میرے جسم میں دل دھڑکنا بند ہو گیا ہے...... کیا میرے اندر سے تمام جذبے، خواہشات ختم ہو گئی ہیں؟'' رینا بیگم نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ کا جسم...... آپ کا اپنا ہے؟ کیا اب آپ کی محبت صرف کسی ایک کے لئے ہے...... یا...... سب کے لئے؟'' دلبر نے معنی خیز انداز میں کہا تو رینا بیگم کو لگا جیسے اس نے سر بازار اس کے چہرے پر طمانچہ مارا ہو...... وہ غصے سے تلملانے لگی۔

''آپ کو زندگی میں اپنی خوشیاں اور خواہشات عزیز تھیں، آپ جو چاہتی تھیں...... وہ سب کچھ آپ کو مل گیا ہے۔ اب آپ کو کسی کی ضرورت نہیں...... محبت کی بھی نہیں۔'' دلبر نے کہا تو رینا بیگم خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہیں۔

''اس سے پہلے کہ تم ہمیں...... اپنی زندگی سے نکالو...... ہم تم کو نکال دیتے ہیں...... نکل جائے یہاں سے! ہمارے کمرے سے...... اور دوبارہ ہمیں اپنی شکل مت دکھانا۔'' رینا بیگم غصے سے چلانے لگیں تو دلبر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد رینا بیگم سسکنے لگی۔ کمرے کی چیزوں کو توڑنے لگی۔ اپنے بال نوچنے لگی اور اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی...... اسے ہر طرف خسارہ نظر آنے لگا...... اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اک محبت کی آس تھی۔ اب وہ بھی روٹھ گئی تھی...... ایک چیز کو پانے کے لئے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا...... وہ خالی ہاتھ...... ٹوٹے دل اور کھوکھلے وجود کے ساتھ کھڑی تھی...... دلبر اس کے ان دنوں کی محبت تھا جب وہ کچھ بھی نہیں تھی...... اب وہ بہت کچھ تھی مگر محبت نہیں رہی تھی۔ اسے

امید تھی کہ دلبر صرف ناراض ہے اور وہ اسے منا لے گی..... مگر دلبر کی باتوں اور رویے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کی نظروں سے گر چکی ہے اور اس سے محبت کی بھیک نہ وہ مانگ سکتی ہے اور نہ ہی وہ دینے کو تیار تھا۔ وہ بے بس کھڑی تھی۔ ذلیل و خوار..... وہ کتنی ہی دیر روتی اور تڑپتی رہی...... سسکتی رہی..... اور پچھتاوے کے آنسو بہاتی رہی۔

☆

چمن بیگم نے ساری طوائفوں میں بیٹھ کر بڑی بڑ ہانکی تھی کہ رینا بیگم نے اپنی ساری کمائی اسے دے دی ہے اور صرف پانچ ہزار روپے رکھے ہیں۔ وہ بلاواسطہ انداز میں ان طوائفوں کو طنزاً یہ سب کچھ سنا رہی تھی جو مجرا ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پوری کمائی میں سے آدھا حصہ وصول کرتی تھیں اور پھر کوئی دوسری بات کرتی تھیں۔

''چمن بیگم..... آپ یہ ساری باتیں ہمیں کیوں سنا رہی ہیں؟'' شیریں بائی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں تو..... یونہی بتا رہی تھی..... کہ..... وہ..... بڑی..... دل والی ہیں۔'' چمن بیگم کھسیا کر بولیں۔

''آپ کا جو بھی مطلب ہے وہ ہمیں سمجھ میں آ گیا ہے، مگر آپ ہم سے ایسی کوئی توقع مت رکھیں..... کہ ہم میں سے کوئی آپ کو اپنا حصہ دے گی.....'' شیریں بائی نے کہا۔

''میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔'' چمن بیگم نے کہا۔

''چمن بیگم..... اگر آپ ہماری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں..... وہی..... جو کچھ ہم کر رہی ہیں..... یا..... وہ جو رینا بیگم نے کیا ہے..... اتنی ذلت کے بعد پیسہ بھی ہاتھ نہ آئے تو لعنت اس پیشے پر.....'' فضہ بائی نے تلخی سے کہا تو چمن بیگم منہ بنا کر وہاں سے چلی گئی۔

''رینا بیگم سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی..... ایسی سخاوت اور شاہ خرچیاں کب تک چلیں گی..... انہیں شاید معلوم نہیں کہ جب کوئی انسان تر نوالہ بنتا ہے تو ہر کوئی اسے حلق سے اتارنے کی کوشش کرتا ہے..... احمق کہیں کی۔'' شیریں بائی نے منہ بنا کر کہا۔

''ہمیں..... انہیں سمجھانا چاہئے..... ورنہ یہ بڑھیا سب کچھ ہڑپ کر جائے گی اور ہر طوائف کے پاس اپنے بڑھاپے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور محفوظ ہونا چاہئے۔'' فضہ بائی نے کہا۔

''ہاں..... موقع دیکھ کر ہم اسے بتانے کی کوشش کریں گے۔'' شیریں بائی نے جواب دیا۔

☆☆☆

''رینا بیگم آج رات آپ کا مجرا ہے..... آپ کے رقص کی خوب دھوم مچی ہے..... دور دور سے مہمان آ رہے ہیں اور آج کچھ خاص قسم کے سرکاری افسر بھی آ رہے ہیں۔ آپ تیار ہو جائیے..... میں نینا بائی اور فضہ بائی کو بھیجتی ہوں آپ کو تیار ہونے میں مدد دیں گی۔'' چمن بیگم کہہ کر نکل گئیں اور اس کا دل ڈوبنے لگا..... پھر بہت سے مہمان..... جن کو دیکھ کر ہی اسے کراہت محسوس ہوتی تھی..... اور..... ابھی دو روز قبل تو اس نے مجرا کیا تھا اب پھر اتنی جلدی..... نگار بیگم تو پورے ہفتے میں صرف ایک بار مجرا کرتی تھیں اور وہ ہر دوسرے روز ابھی تو پاؤں اور بدن پہلے مجرے کی

تھکاوٹ سے چور تھے کہ اب دوسرا مجرا تیار تھا...... اسے الجھن سی ہونے لگی۔

سہ پہر کو ہی نینا بائی اور فضہ بائی اس کے کمرے میں پہنچ گئیں، دونوں جواں سال، خوبصورت اور فیشن ایبل طوائفیں تھیں جن کی بات چیت اور حرکات وسکنات سے ناز ونخرا اور ادائیں دوسروں کو ان کی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ چمن بیگم نے فیروزی اور پنک کلر کا خوبصورت اور قیمتی لباس اس کے لئے منگوایا تھا۔ میچنگ زیورات اور میک اپ پھولوں کے ہار اور گجرے، دونوں نے اس کو تیار کیا۔ وہ ان کے سامنے خاموش بت بنی بیٹھی رہی، جسے وہ سجاتی سنوارتی رہیں۔ اس میں پہلے دن کی خوشی اور جوش وجذبہ نہیں تھا۔ اس کا دل بجھا ہوا اور آنکھیں نم تھیں...... ٹوٹے دل سے بار بار آہیں بلند ہوتی تھیں۔ فضہ بائی نے اس میں یہ واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ اس نے نینا بائی کو کسی کام سے اپنے کمرے میں بھیجا...... اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے...... رینا بیگم آپ کچھ اداس نظر آرہی ہیں۔" فضہ بائی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... یونہی" اس نے آہ بھر کر جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

"سنا ہے...... آپ نے پہلے مجرے میں ہی بہت کمائی کی ہے۔" فضہ بائی نے موقع دیکھ کر اس موضوع کو چھیڑنا چاہا، وہ خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا، جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔

"آپ کو کتنا حصہ ملا ہے......؟" فضہ بائی نے پھر پوچھا۔

"کیسا حصہ......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"آپ شاید جانتی نہیں کہ آپ کا کتنا حصہ بنتا تھا...... کم ازکم وہ پانچ لاکھ تو آپ کو ملنے چاہئیں تھے...... جس کے بدلے میں......؟" اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔ رینا بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے...... کہ جب آپ نے اس پیشے کو اپنا ہی لیا ہے تو پھر اس کمائی کو بھی جائز سمجھیں...... ایک طوائف اپنا سب کچھ لٹا کر بھی خالی ہاتھ اور خالی جیب رہے تو اتنی ذلت بھری زندگی گزارنے کا کیا فائدہ؟ جب اس کے پاس پیسہ ہی نہ ہو......" فضہ بائی نے کہا۔

"کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے؟ نادانستہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں...... ہم طوائفوں کی زندگی میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہی تو ہم کیا کیا عذاب اور ذلت سہتی ہیں...... آپ چمن بیگم کو نہیں جانتی...... بہت لالچی بڑھیا ہے۔ ان سے اپنا پورا حصہ گن کر لیں...... چاہے وہ غریبوں کو بانٹ دیں...... اور ان کو بھی کیوں دیں...... اپنے پاس رکھیں...... بڑھاپے میں آپ کے کام آئے گا...... اس وقت جب طوائف کا کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا...... نہ یہ در و دیوار...... اور نہ ہی یہ گھنگھرو......" اس نے قریب پڑے گھنگھروؤں کو اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

رینا بیگم گھنگھروؤں کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی اور سسکنے لگی۔

"تمہیں پہننا کتنا تکلیف دہ ہے...... کاش مجھے معلوم ہوتا تمہاری جھنکار سے لوگوں کے دل جھوم اٹھتے ہیں مگر تم کو پہننے والی طوائف کس قدر اذیت سے گزرتی ہے شاید تم بھی کبھی نہ جان سکو۔ تمہاری چھن چھن سے میرا دل کتنا کٹتا ہے...... تمہارے شور کی آواز میرے کانوں کو پگھلے سیسے کی طرح تکلیف دیتی ہے اور تمہارے بوجھ سے میرے پاؤں لہولہان ہونے لگتے ہیں...... جب ایک طوائف گھنگھرو باندھ کر سرِ عام رقص کرتی ہے تو

اس کے دل پر کیا گزرتی ہے، کوئی نہیں جان سکتا...... تم اس کے لئے ذلت اور رسوائی لاتے ہو...... تمہاری جھنکار سن کر لوگ طوائف پر پیسہ لٹاتے ہیں...... تم طوائف کی بربادی کا ذریعہ ہو" اور اس نے اٹھا کر گھنگھرو زمین پر دے مارے اور سسکنے لگی......

"آپ جو کچھ چاہتی تھیں وہ سب کچھ آپ کو مل گیا ہے...... اب آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔" دلبر کے الفاظ اس کے کانوں میں نشتر چبھونے لگے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"رینا بیگم...... تشریف لے آیئے...... مہمان آپ کا رقص دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہیں۔" چمن بیگم نے اس کے کمرے میں آ کر مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے جلدی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا اور اس کے ساتھ باہر جانے لگی۔

"یہ کیا...... گھنگھروؤں کے بغیر؟ طوائف کا رقص گھنگھروؤں کے بغیر کیسے ممکن ہے...... ان کی جھنکار سے تو طوائف کے پاؤں میں جنبش رہتی ہے یہ اسے تھکنے نہیں دیتے...... مہمان ان کی جھنکار پر ہی تو فدا ہوتے ہیں...... انہیں پہن لیجئے۔" چمن بیگم نے کہا تو اس نے خاموشی سے گھنگھرو اٹھائے انہیں ایک ٹک دیکھا اور بڑی مشکل سے انہیں پہنا...... انہیں پہنتے ہوئے اس کا دل کتنا تڑپا...... کتنا رویا...... چمن بیگم کو بھی خبر نہ ہوئی...... اس نے چپکے سے دو آنسو گرائے...... اب یہی اس کا مقدر ہیں...... اور مقدر سے فرار ممکن نہیں...... وہ چھن چھن کرتی باہر نکل گئی...... مگر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

☆☆☆

تاش کے پتے

جُرم کی بساط پر کھیلی جانے والی خونی بازی...... ایک جنونی قاتل کا قصہ جو دُنیا کے عظیم ترین قاتلوں کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ تاش کے باون پتے اُس کے مرکز نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قاتل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سطر سنسنی اور سسپنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قاتل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

تاش کے پتے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈونچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی ناول سیکشن** میں پڑھا جا سکتا ہے۔

(۱۶)

باسط علی ایک بس سے اترتا تو دوسری پر سوار ہوتا، وہ چلنے لگتی تو اس سے اتر جاتا۔ پھر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر اور بس کا انتظار کرتا۔ وہ آتی تو اس میں سوار ہو جاتا۔ وہ چلنے لگتی تو اس سے بھی اتر جاتا۔ ہر روز اس کا یہی معمول تھا۔ وہ ہر روز اپنے گاؤں جانے والی بس میں سوار ہوتا مگر خوف، وہم اور وسوسے اسے اتنا تنگ کرتے کہ وہ پھر اتر جاتا۔ اس میں جرأت اور ہمت پیدا نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ گاؤں جا کر اپنے ماں باپ اور بہنوں کا سامنا کرتا اور سب سے زیادہ اسے حشمت خان سے ڈر لگتا تھا۔ اگر اسے نازی کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تو وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

نازی نے جب سے اس سے طلاق لی تھی، وہ مخبوط الحواس ہو گیا تھا۔ اس کا اپنی ذات پر یقین اور اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ ہر وقت اس کی آنکھیں نم رہتیں اور منہ سے سسکیاں و آہیں نکلتی رہتیں۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اسے رنج تھا تو یہی کہ نازی اس سے محبت کا دعویٰ تو کرتی تھی مگر اسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ اپنے حصے کی محبت کی طلب گار تھی مگر اس کے دل و دماغ میں جو جنگ اور کشمکش جاری تھی، اس تک نہیں پہنچ پائی تھی وہ اسے جھوٹا، مکار اور دھوکے باز سمجھتی تھی مگر سچ کیا تھا۔ نہ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی ماننے کی۔ محبت کے اس کھیل میں اسے صرف خسارہ ملا تھا اور خسارہ بھی اتنا شدید تھا جس کا نعم البدل کوئی نہیں تھا۔ نازی کے الفاظ اس کے دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہتے تھے اور شاہ زیب کی آنکھیں اسے شدید رنج و ملال اور پچھتاوے میں مبتلا رکھتی تھیں۔ اس نے شاہ زیب سے اس کی محبت چھینی تھی اور قدرت نے اس سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کا سکون بھی چھین لیا تھا۔ وہ ایسی آگ میں جلتا رہا تھا جس کی خبر نہ نازی کو ہو پائی تھی اور نہ ہی کسی اور کو۔ وہ خود بھی اس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر فرار ممکن نہیں تھی۔ کیا اسے محبت کرنے کی سزا ملی تھی؟ یا...... محبت چھیننے کی......؟ اس نے کیا کیا تھا کہ اسے اتنے خسارے ملے تھے، اپنے گھر والوں سے جدا ہوئے کئی ماہ گزر گئے تھے ان سے ملنے کو اس کا دل تڑپتا تھا مگر وہ ان کو ملنے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کالج کی نوکری چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا۔ تنگدستی اور افلاس نے اس کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ کئی کئی دن اور راتیں بھوکا رہتا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ نہ سونے کو بستر...... نہ کھانے کو کھانا...... اور نہ ہی جسم ڈھانپنے کو کوئی کپڑا...... وہ ریلوے اسٹیشن پر سوتا اور قریبی مزار سے کھانا کھا لیتا۔ کوئی ضرورت مند دکھائی دیتا تو اس کا سامان اٹھا کر چند روپے وصول کر لیتا۔ زندگی اسے عجیب رنگ دکھا رہی تھی۔ اتفاق سے ایک نوجوان کی وساطت سے اسے ایک سکول میں نوکری مل گئی۔ اس سے اس نے کرائے پر ایک کمرہ لیا اور وہیں رہنے لگا مگر نہ شاہ زیب اس کے ذہن سے نکلتا اور نہ ہی نازی...... نہ ہی ماں باپ اور نہ ہی بہنیں۔

وہ ہر روز سکول سے چھٹی کے بعد بس اسٹینڈ پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے گاؤں جانے کی کوشش کرتا مگر وہاں جانے کی ہمت نہ کر پاتا اور یونہی واپس لوٹ آتا۔ وہ ہر وقت پریشان، سوچوں میں گم اور بوکھلایا ہوا پھرتا۔ وہ قابل انسان تھا مگر اس کی بے انتہا سنجیدگی اور خاموشی سے سکول کی

انتظامیہ خوش نہیں تھی اور کئی بار اسے وارننگ مل چکی تھی۔ وہ بہت زیادہ پریشان رہتا تھا۔

نجانے قدرت نے اس سے کیسا انتقام لیا تھا کہ اس کو...... اس کی محبت دے کر اس سے چھین لی تھی۔ نازی اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ شاید ہی کوئی اور عورت اس سے زندگی میں اتنی محبت کر پائے گی۔ جتنی کہ نازی نے اس سے کی تھی۔ اور وہ بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتا تھا کہ نازی کے علاوہ کسی اور عورت کا...... اس کی زندگی میں داخل ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

نازی کے علاوہ اور کوئی نہیں اس کا دل صاف انکار کر دیتا۔

دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے مگر ایک دوسرے کی محبت کو نہیں پا سکے تھے۔ یہ کتنی عجیب اور ناممکن بات تھی۔

نازی اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات تھی۔

اور وہ نازی سے شدید محبت کرنے کے باوجود بھی محبت کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ یہ کتنی حیران کن بات تھی اور نازی سے جدا ہونے کے بعد...... اسے طلاق دینے کے باوجود بھی وہ اس سے نفرت نہیں کر پایا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ محبت کرنے لگا تھا اور یہ سب سے زیادہ حیران کن بات تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا...... اور کیا...... ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جتنا سمجھنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا۔

یہ سب ''کیوں'' ہوا تھا......؟ وہ اکثر اس پر سوچتا تو پریشان ہو جاتا...... 'شاہ زیب!' اس کی حسرت بھری نمناک آنکھیں...... اسے بے وفا...... غدار اور بے اعتبار ہونے کا شدید احساس دلاتیں اور یہ احساس اس کے اندر اس قدر ندامت اور تاسف پیدا کرتا کہ وہ محبت کے لطیف جذبات کو بھول جاتا۔ اس کے اندر کوئی شے بری طرح ٹوٹنے لگتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کسی تیز دھار آلے سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ اس سے سانس لینا محال ہو جاتا۔ اس کا دکھ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نازی بھی نہیں جان پائی تھی اور اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

نجانے...... اسے...... کسی کی بددعا لگ گئی تھی...... کس کی؟ وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

شاید...... شاہ زیب کی...... ہاں...... اس کے علاوہ اور کس کی لگ سکتی تھی۔ اسی کا تو سب کچھ۔ اس نے چھینا تھا اور شاہ زیب نے اس سے شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ کوئی الزام نہیں دیا...... ڈاکو اس کا گھر لوٹنے آیا اور اس نے خود ہی سارے دروازے کھول دیئے۔ ڈاکو لوٹ کر چلا گیا اور وہ دکھ اور حسرت بھری نگاہوں سے اسے لوٹ مار کے سامان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کس قدر حوصلہ مند اور اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ اور وہ کتنا کم ظرف، کمینہ اور حقیر...... نازی کے بلانے پر وہاں چلا گیا۔ شاہ زیب جیسے وفادار، مخلص دوست کے بھیس میں اسے لوٹنے کے منصوبے بناتا رہا...... اور پھر لوٹ کر چلا آیا، کاش...... وہ خالی ہاتھ لوٹ آتا۔

کاش...... وہ وہاں نہ جاتا۔

کاش...... ! وہ یہ سب نہ کرتا۔ تو...... آج اس کا اندر یوں مضطرب اور بے قرار نہ ہوتا۔ اس نے نازی اور شاہ زیب دونوں کو دکھ دیا تھا۔ ایک کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور ایک کی آنکھوں میں حسرت۔ اب اس کی اپنی آنکھوں میں بھی ہر وقت سرخی اور آنسو ٹھہرے رہتے جن سے فرار ممکن نہیں تھی۔

☆

''نازی...... آپ، کب تک یوں اداس اور غمگین رہیں گی۔ ایک شخص کے جانے سے زندگی ختم تو نہیں ہو جاتی''۔ تیمور نے دس کنال پر محیط کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں خوبصورت سیمنٹ کے بنے پر پیچ راستوں پر نازی کے ساتھ واک کرتے ہوئے کہا۔

کاش...... یہ زندگی ختم ہو جاتی'' نازی نے مایوسی سے جواب دیا۔

کیا...... آپ اس شخص سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ اسے اپنی زندگی سے بھی اہم سمجھتی تھیں؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... '' نازی نے آہستہ آواز میں جواب دیا اور اس کی آواز میں اس کے آنسوؤں کی آمیزش سنائی دینے لگی۔

یہ کیسے ممکن ہے...... کہ جس سے اس قدر شدید محبت کی جائے اور پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ آپ بتاتی ہیں کہ آپ نے طلاق بھی خود ہی لی۔ پھر ایسا کیوں کیا؟

تیمور نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ ممکن ہے، محبت بھی...... اور...... نفرت بھی۔'' نازی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

کیا...... آپ...... اب بھی اس شخص سے محبت کرتی ہیں؟ تیمور نے پوچھا۔

'معلوم نہیں...... مگر میں اس سے نفرت بھی نہیں کر سکی'

نازی نے ڈوبتے نارنجی سورج کی جانب نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ...... بہت عجیب انسان ہیں...... اور......'' تیمور کچھ کہتے ہوئے رکا اور اس کے خوبصورت چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اور......

کیا......؟ نازی نے چونک کر پوچھا۔

''بہت...... خوبصورت......'' تیمور نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سب کچھ بے معنی ہے......'' نازی نے افسردگی سے جواب دیا۔

کیوں......؟

''میری خوبصورتی...... میرا وجود...... میری محبت اسے کبھی نظر نہیں آئی'' نازی نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ...... کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا وہ شخص اندھا تھا۔ جسے آپ دکھائی نہیں دیں۔ آپ تو اندھیرے میں بھی بیٹھی دکھائی دیتی ہیں'' تیمور شوخ لہجے میں بولا۔

شاید اس کی آنکھوں میں کوئی اور سما گیا تھا؟ نازی نے کہا۔

'کیا...... کوئی اور...... عورت؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

نہیں......

'پھر...... کون......؟ تیمور نے چونک کر پوچھا'

تھا......کوئی......؟ نازی نے آسمان کی جانب بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا جہاں پرندے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے شاید اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

''مجھے تو وہ شخص پاگل لگتا ہے جس نے آپ کو چھوڑ دیا......'' تیمور نے کہا۔

''شاید......میں پاگل تھی'' نازی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہیں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' نازی نے جواب دیا۔

''پھر......اتنی افسردہ کیوں رہتی ہیں؟''

''یقین نہیں آتا......کہ یہ سب کیسے ہوگیا......'' نازی نے تیمور کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جو......ہونا تھا......وہ......ہو چکا......ممکن ہے......زندگی پھر آپ پر خوشیوں کے دروازے کھول دے'' تیمور نے کہا۔

''مجھے......اب......کوئی امید نہیں رہی اور نہ ہی میں اس کی منتظر ہوں'' نازی نے جواب دیا۔

''ہر......مایوس انسان یہی کہتا ہے......مگر جب زندگی خود اسے رنگین راستوں پر ڈالتی ہے تو انسان کی سوچ بدل جاتی ہے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

نازی اس کی بات سن کر خاموش ہوگئی اور دونوں آہستہ آہستہ واک کرنے لگے۔

تیمور بہت محبت، چاہت اور محنت سے اسے آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لا رہا تھا۔ وہ ثروت کا جڑواں بھائی تھا۔ ثروت اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی گارمنٹس کی فیکٹری بہت کامیابی سے چلا رہی تھی اور وہ بہت زیادہ مصروف رہتی......تیمور کو بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کمپیوٹر انجینئر تھا۔ زیادہ تر امریکہ میں رہا تھا اور نازی کے آنے سے چند روز پہلے وہ واپس آیا تھا۔ اتنے بڑے محل نما گھر میں ثروت، اس کی ماں، تیمور اور چند ملازمین رہتے تھے۔ ثروت......نازی کی کالج فرینڈ تھی اور اس پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ باسط علی سے شادی کرانے میں ثروت نے اس کی بہت مدد کی تھی اور باسط علی کو چھوڑنے کے بعد بھی اسے ثروت کے علاوہ کوئی اور اپنا ہمدرد نظر نہ آیا جس کے پاس وہ دوبارہ جاتی۔ وہ گاؤں میں اپنی حویلی میں نہیں جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا اور ممکن تھا کہ حشمت خان اسے گولی سے ہی اڑا دیتا۔ ثروت نے اس کا بہت خیال رکھا، اس کی ہر طرح سے دلجوئی کی اور سب سے زیادہ تیمور نے......اسے نازی کے حالات سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ بہت سادہ مزاج اور پرخلوص انسان تھا۔ اس میں عام لڑکوں جیسی مکاریاں اور چالاکیاں نہیں تھیں۔ وہ ہر بات بہت صاف گوئی سے دوستانہ انداز میں کرتا......بعض اوقات نازی کو وہ......ثروت سے بھی زیادہ پرخلوص اور ہمدرد لگتا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ ہر بات کھل کر کرتی تھی۔ تیمور نے اس کا ہاسپٹل میں بھی بہت خیال رکھا تھا اور ہاسپٹل سے گھر واپس آنے پر بھی وہ اس کی خوراک، واک اور میڈیسنز کے بارے میں بہت محتاط رہتا اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتا۔ اس کی بھرپور دلجوئی کرتا، اسے محبت بھرے......سلجھے ہوئے نرم لہجے میں بہت کچھ سمجھاتا وہ کبھی خاموشی سے اسکی باتیں سنتی

رہتی تو کبھی اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیتی۔

''نازی...... کیوں نا...... آئس کریم کھانے چلیں'' تیمور نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کے دل کے لئے کیا کیا جائے کہ وہ پھر کچھ چاہنے لگے۔ میرا مطلب ہے...... وہ دوبارہ زندہ ہو جائے'' تیمور نے کہا۔

''شاید...... اب یہ کبھی نہیں ہو سکے گا''۔

''چیلنج مت کریں...... میں آپ کے دل کو پھر سے زندہ کر سکتا ہوں'' تیمور نے مسکرا کر کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔

''اپنی...... محبت سے'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''خدا کے لئے...... محبت کا نام مت لو...... مت لو'' وہ ایک دم چلانے لگی اور چلاتے ہوئے بھاگتی ہوئی تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بیڈ پر گرتے ہی سسکنے لگی۔ تیمور اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور دروازہ کھول کر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

''نازی...... میرا یقین کریں...... میں آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں......'' تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لئے...... خدا کے لئے...... اب محبت کا نام مت لینا...... میں پہلے ہی بہت ٹوٹ چکی ہوں۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں۔ نازی نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''تیمور...... آپ کو ٹوٹنے نہیں دے گا......'' تیمور نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور امید تھی۔

''نہیں...... اب میں کسی کو آزمانا نہیں چاہتی...... میں جیسی ہوں، ٹھیک ہوں...... آپ یہاں سے چلے جائیں'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''کیسے چلا جاؤں...... آپ کو تنہا چھوڑ کر...... اب ہم ہر راستے پر اکٹھے چلیں گے'' تیمور نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''میری آنکھوں نے خواب دیکھنا چھوڑ دیے ہیں'' وہ بولی۔

''اور میں آپ کی آنکھوں کو خواب بھی دکھاؤں گا اور ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھی بھروں گا'' تیمور نے جواب دیا۔

''اتنے بڑے دعوے مت کریں...... میں نے اپنے دعوؤں کو خود ذرہ ذرہ خاک ہوتے دیکھا ہے...... تیمور...... آپ کے اور میرے راستے جدا جدا ہیں...... میں آپ سے کبھی نہیں مل پاؤں گی اور نہ ہی ملنا چاہتی ہوں۔ میں کل ہی آپ کے گھر سے چلی جاؤں گی'' نازی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا۔

''اگر آپ میری لاش پر سے گزر کر جا سکتی ہیں تو ضرور چلی جایئے گا......'' تیمور نے پرعزم لہجے میں کہا تو نازی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''آپ...... کیوں مجھ پر میری زندگی تنگ کر رہے ہیں؟''

''نہیں...... میں تو آپ کو زندگی کی جانب لانا چاہتا ہوں۔ آپ کو پراعتماد زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں...... کیونکہ آپ زندگی

کے بارے میں بہت مایوس ہو چکی ہیں اور مایوس انسان کے اندر زندگی کی خواہش پیدا کرنا بہت بڑا کام ہے'' تیمور نے جواب دیا۔

''کیا آپ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......شاید......اسے آپ ہمدردی، ترس، رحم، محبت اور پیار بھی کہہ سکتی ہیں......اور یہ سب کچھ آپ کے لئے میرے دل میں ہے''۔ تیمور نے جواب دیا۔

''خدا کے لئے مجھے اتنا ذلیل مت کریں'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''ذلیل......؟ کون آپ کو ذلیل کر رہا ہے......کیا انسان......انسانوں سے محبت، پیار اور ہمدردی نہیں کرتے۔ کیا ایک دوسرے پر ترس کھانا بری بات ہے؟ آپ مجھ پر بھی تو ترس کھا سکتی ہیں......اور میں کبھی بھی برا نہیں مناؤں گا'' تیمور نے صاف گوئی سے کہا تو نازی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''میں بہت پریشان ہوں......آپ یہاں سے چلے جایئے''۔ نازی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا اور نازی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

زندگی کیسے رخ بدل رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاہ زیب......باسط علی اور اب تیمور......اُف خدایا۔ یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے تو صرف ایک شخص کی تمنا کی تھی اور اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے۔ باسط علی کی خاطر میں نے شاہ زیب کو چھوڑا اور اب تیمور......مجھے باسط علی کے بدلے میں مل رہا ہے......یہ کیسا گورکھ دھندا ہے......میں......یہ نہیں چاہتی......میں محبت کا کھیل دوبارہ نہیں کھیل سکتی......اب مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے......بہت زیادہ خوف آتا ہے۔

یا اللہ! مجھے محبت کے شر سے بچا......وہ سسکنے لگی اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بلند آواز سے رونے لگی۔

☆

ماسٹر باسط علی سکول کی گراؤنڈ میں بچوں کی کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ سنہری، چمکیلی دھوپ نے بہت دنوں سے چھائی دھند کو نگل لیا تھا اور ہر طرف پھیلی دھندلاہٹ چھٹ گئی تھی اور نکھرے نکھرے صاف شاف نیلے آسمان تلے ہر چیز واضح اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ماسٹر باسط علی نے کتاب سے سبق پڑھانا شروع کیا۔

''اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی تمام مخلوق سے محبت کرتے ہیں......اور اپنے جیسے انسانوں کی عزت کرتے ہیں......انہیں دھوکا نہیں دیتے......اور......انہیں کوئی تکلیف نہیں دیتے۔'' ماسٹر باسط علی نے جیسے ہی الفاظ ادا کیے ان کا دل کسی بھاری بوجھ تلے دبنے لگا......اور اس بوجھ کی وجہ سے اضطراب ان کے اندر پھیلنے لگا۔

''ماسٹر صاحب......اگلی لائن بھی تو پڑھائیں'' ایک ہونہار طالب علم نے ماسٹر صاحب کو اچانک خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں......وہ......'' انہوں نے کتاب کی جانب دیکھا مگر انہیں الفاظ دکھائی نہ دیئے۔ ان کی آنکھوں میں اچانک دھندسی بھر گئی تھی......نمی

سی ابھرنے لگی تھی۔

''آج...... اتنا ہی کافی ہے۔تم لوگ اسی سبق کو دہراؤ، ماسٹر باسط علی نے کہا اور بچے اسی سبق کو دہرانے لگے مگر ماسٹر باسط علی کا یہ فیصلہ اپنے لیے ہی وبال جان بن گیا۔بچوں کا ان لائنوں کو بلند آواز میں بار بار دہرانا اور ان الفاظ کی بازگشت ان کے سر میں ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگی...... وہ گھبرانے لگے...... اوران کا چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا...... وہ ان الفاظ کی بازگشت سے فرار چاہتے تھےان کا دل انتہائی بے قراری سے بے قابو ہونے لگا۔اس کا مطلب ہے''جو انسان دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اللہ اس سے محبت نہیں کرتا''۔ماسٹر باسط علی نے سوچا اور کھلے آسمان کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ان کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

''یا اللہ! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا...... پھر...... نجانے کیوں مجھ سے یہ سب ہو گیا...... شاید میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے جس کی سزا مجھے مل رہی ہے''۔ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر سوچا اوران کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔چھٹی کی گھنٹی بجی اور سب بچے اپنی کتابیں اور بستے اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ماسٹر باسط علی کرسی پر بیٹھے مسلسل آسمان کو دیکھتے رہے۔

''ماسٹر جی...... چھٹی ہو گئی ہے،ایک چھوٹا لڑکا ان کے قریب آکر بہت معصومیت سے بولا تو ماسٹر صاحب ہڑ بڑا گئے۔''ہاں...... ہاں...... میں جا رہا ہوں''ماسٹر باسط علی نے بوکھلا کر جواب دیا۔

اور وہاں سے اٹھ کر سکول سے باہر چلے گئے۔ان کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسا خاموش اور پرسکون گوشہ ملے جہاں وہ چند ساعتوں کے لئے بیٹھ سکیں۔

ہر طرف لوگوں کی چہل پہل تھی۔خوشگوار موسم کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت گھروں سے باہر آ گئی تھی اور اپنے اپنے کام نمٹانے میں مصروف تھی۔آبادی سے کافی دور پہاڑوں کے درمیان ایک آبشار بہتی تھی۔وہ علاقہ بہت خوبصورت سرسبز وشاداب اور پرسکون تھا۔ناوانستہ ماسٹر باسط علی کے قدم اس آبشار کی جانب اٹھ گئے اور وہ آبشار کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔آبشار سے تھوڑا تھوڑا پانی نکل رہا تھا۔ماسٹر باسط علی اس کے قریب پتھروں پر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

''یا اللہ! میرے اندر کی بے چینی کو کم کر دے۔نجانے کیوں میرا دل اتنا پریشان رہتا ہے؟''ماسٹر باسط علی نے دل میں سوچا۔

''اس سے جو...... تو...... پوچھ رہا ہے...... نا...... اس کا جواب بھی وہی ہے...... جو...... میں تجھ سے کہتا ہوں...... کاہے کو وقت برباد کر رہا ہے...... جا...... ایک بار اس سے مل...... سائیں مٹھا ایک دم اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے بتانے لگا۔ماسٹر باسط علی ایک دم چونک گئے اور بوکھلا کر انہیں دیکھنے لگے۔ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی یوں جیسے کسی نے اچانک ان کی چوری پکڑ لی ہو۔''

''ماسٹر...... گھبرا کیوں رہے ہو؟ ارے...... میں سب جانتا ہوں...... جو کچھ تیرے دل میں ہوتا رہتا ہے۔اگر تو بولے...... تو...... سب بتا دوں''سائیں نے قہقہہ لگا کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''آ...... آپ کو کیسے پتہ چل گیا؟''ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا...... پوچھ رہے ہو۔ کیسے...... کیسے......؟ پتہ چل جاتا ہے...... ویسے ہی جیسے آنکھ دیکھ کر بتا دیتی ہے کہ سامنے کیا ہے؟'' سائیں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''آنکھ......؟'' ماسٹر باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

''ارے...... ماسٹر جی ہے تو...... تو...... ماسٹر مگر بالکل ان پڑھ...... کاہے کو کتابیں پڑھ پڑھ کر ڈھیر لگایا، بس ایک کلمہ ہی پڑھ لیتا تو تیرا کام ہو جاتا''۔

''کلمہ...... وہ تو میں روز ہی پڑھتا ہوں'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

''صرف پڑھتے ہی ہو...... کیا اس طرح کبھی پڑھا ہے؟''

اندر	کلماں	کل	کل	کروا	،	عشق	سکھایا	کلماں ہو
چودہ	طبق	ئیں	کلمے	اندر	،	چھوڑ	کتاباں	کلماں ہو
کانے	کپ	کپ	قلم	بناون،	لکھ	نہ	سکن	کلماں ہو
کلماں	پیر	پڑھایا	باہو،	ذرا	نہ	رہیاں	الماں	ہو

''سنا...... ماسٹر...... ایسا کلمہ کبھی پڑھا ہے...... یا کسی نے تجھے پڑھایا ہے؟'' سائیں نے پوچھا تو ماسٹر باسط علی گھبرا کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''ماسٹر...... جب دل کی آنکھ کھلتی ہے نا تو سب کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے...... چاہے وہ شے سات پردوں میں چھپی ہو...... تو ہی بتا بھلا کیا مجھے تیرا دل نظر نہیں آتا۔ تیرے دل کے اندر کیا کیا جنگ ہو رہی ہے مجھے سب معلوم ہے...... اسی لئے تو کہتا ہوں...... جا...... اس کے پاس چلا جا...... پھر...... دیکھنا...... تجھے اس کے پاس سے کیا کچھ ملے گا''۔ سائیں نے مسکرا کر کہا۔

''سائیں جی...... آپ ہی بتاؤ...... کیا میں نے اس کے ساتھ کوئی دھوکہ کیا ہے......؟ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ جس کی اتنی بڑی سزا مجھے مل رہی ہے۔ نہ دن کو چین آتا ہے اور نہ رات کو نیند...... پچھلے کئی سالوں سے میں رات بھر نہیں سویا...... میرا دل ہر وقت پریشان رہتا ہے...... میں کیا کروں......؟ وہ سسکنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''

''ماسٹر...... رب کے راز، رب ہی جانتا ہے...... اور...... رب بھی یہی چاہتا ہے کہ تو اس کے پاس چلا جا...... تو...... نہیں جانتا...... کہ وہ...... کون ہے......؟'' سائیں نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں...... اسے جا کر کیا کہوں......؟ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ مجھ سے روٹھ گیا...... تو پھر...... کہاں جاؤں گا؟'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

''ارے...... ماسٹر...... کبھی دنیا کو دل کی آنکھ سے بھی دیکھنے کی کوشش کر...... ان آنکھوں میں کیا رکھا ہے......؟ یہ تجھے کیا دکھائیں گی...... دیکھنا ہے...... تو...... اس آنکھ سے دیکھ...... پھر...... تو...... خود ہی حیران رہ جائے گا۔ جو کچھ وہ تجھے دکھائے گی''۔ سائیں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے

آسمان کی وسعتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سائیں...... جی...... میرے لئے دعا کریں...... کہ......'' ماسٹر باسط علی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''نہ...... بابا...... دعا...... تو اللہ والے لوگ کرتے ہیں...... ہم فقیر تو بھیک مانگنے والے لوگ ہیں...... رزیل...... کمینے...... ہماری دعائیں کہاں پوری ہوتی ہیں...... جا...... اس کے پاس...... تیری سب دعائیں پوری ہو جائیں گی''۔ سائیں نے اپنی کشکول اٹھا کر کلام پڑھنا شروع کر دیا۔

اول حمد، ثنا الہٰی، جو مالک ہر ہر دا
اس دا نام چتارن والا، ہر میدان نہ ہردا
رحمت دا مینہ پا خدایا، باغ سُکا کر ہریا
بوٹا آس، امید میری دا، کر دے میوے بھریا
رب جبار قہار سِتیدا، خوف، بھلا اس بابوں
ہے ستار، غفار ہمیشہ، رحم، امید جنابوں
(میاں محمد بخش)

اور وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماسٹر باسط علی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

☆

سلگتے چہرے

ضوباریہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول...... اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن پر سجی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لو دے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرم نجل جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

بہرام خان...... اناج سنبھال لو...... بہت تیز آندھی آنے والی ہے'' شاہ زیب نے صبح سویرے بہرام خان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... گٹھے تو سارے کھیتوں میں پڑے ہیں...... میں ابھی جاتا ہوں'' بہرام خان گھبرا کر اٹھا۔

''اور...... سنو...... خرم خان کو آج سکول مت جانے دینا'' شاہ زیب نے کہا تو بہرام خان نے رک کر اسے دیکھا۔

''کیوں...... کیا...... کوئی......؟'' بہرام خان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

ہاں...... کہہ دیا نا، شاہ زیب نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے جواب دیا تو بہرام خان بہت کچھ سمجھ گیا اور جلدی سے حویلی کے گیٹ پر پہنچا جہاں ڈرائیور کھڑا گاڑی صاف کر رہا تھا۔

''آج ...... خرم خان سکول نہیں جائے گا'' بہرام خان نے ڈرائیور سے کہا۔

''کیوں...... خان جی ......'' ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

''کہہ دیا نا......'' بہرام خان نے کہا اور جلدی سے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شہر بانو...... خرم خان کو سکول کے لئے تیار کر رہی تھی۔

''شہر بانو...... آج خرم خان کو سکول نہیں بھیجنا'' بہرام خان نے بیوی سے کہا۔

''کیوں...... آج تو اس کا پہلا پرچہ ہے'' شہر بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''کہا...... نا......'' بہرام خان نے پرزور الفاظ میں کہا۔

''مگر...... کیوں...... کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے...... بچے کے امتحان شروع ہو رہے ہیں...... اور آپ اسے سکول جانے سے روک رہے ہیں'' شہر بانو نے خفگی سے کہا۔

''شہر بانو...... میں نے ایک بار کہہ دیا...... نا...... کہ خرم خان سکول نہیں جائے گا تو وہ نہیں جائے گا، بحث مت کرو''۔ بہرام خان غصے سے بولا۔

''کوئی...... وجہ بھی تو ہونی چاہیے اس کے سالانہ امتحان ہیں، پرچہ نہ دیا تو فیل ہو جائے گا'' شہر بانو نے غصے سے کہا۔

''ہو...... جائے...... فیل...... مگر میں اسے سکول نہیں جانے دوں گا'' بہرام خان انتہائی غصے سے چلاتے ہوئے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور ڈرائیور کے ساتھ ڈیرے پر چلا گیا۔ شہر بانو کو بھی انتہائی غصہ آ گیا...... اور اس نے زبردستی خرم خان کو تیار کر کے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیا۔ ڈرائیور پریشان ہو گیا اور خرم خان کو ڈیرے پر بہرام خان کے پاس لے گیا۔ اس نے خرم خان کو ڈیرے پر ہی روک لیا اور اسے سکول نہ جانے دیا۔ اور خود گندم کو گوداموں میں بھیجنے لگا...... ابھی وہ کام سے فارغ ہوا تھا کہ انتہائی تیز آندھی چلنے لگی۔ گرد و غبار کا طوفان اٹھنے لگا۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بجلی کے کھمبے گر گئے۔ پورا گھنٹہ انتہائی زوردار آندھی چلتی رہی۔ اس نے سارا کچھ درہم برہم کر دیا، کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس کے بعد انتہائی تیز بارش شروع ہو گئی۔ تمام مزارع اور کارندے بہرام خان کو سراہنے لگے۔

''خان جی...... آپ نے بڑا اچھا کیا۔ اناج سنبھال لیا ورنہ بہت زیادہ نقصان جاتا'' سب مزارع بہرام خان کی تعریفیں کرنے لگے اور وہ

خاموشی سے سنتا رہا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

وہ شاہ زیب کا کوئی حکم نہیں ٹالتا تھا کیونکہ اس نے اس بات کا بہت اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ اپنی باطنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا ہے اس میں کبھی جھوٹ نہیں ہوتا اور وہ اس کا بہت بڑا عقیدت مند ہو گیا تھا۔ اس کی ہر بات کو بہت توجہ سے سنتا اور حکم بجالاتا۔

شہر بانو بہت پریشانی سے ساری حویلی کا چکر لگا رہی تھی۔ کبھی کسی ملازم کو بلاتی کبھی کسی کو……

''بیٹی کیا بات ہے……؟ کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'' اچانک زیتون بانو نے اپنے کمرے میں سے اسے یوں چکر لگاتے دیکھا اور باہر آ کر پوچھا۔

''خالہ جان……خرم خان کے سکول کی چھت گر گئی ہے اور بہت بچے اس کے نیچے آ گئے ہیں۔ خرم خان کا کچھ پتہ نہیں چل رہا…… مجھے بہرام خان نے صبح بہت روکا تھا کہ اسے سکول نہ بھیجوں مگر میں نے زبردستی بھیج دیا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے'' شہر بانو بلند آواز میں رونا شروع ہو گئی۔

''اللہ……خیر کرے گا……تم فکر نہ کرو……میں ابھی شہباز کو سکول بھیجتی ہوں'' زیتون بانو نے ڈرائیور کے بارے میں کہا۔

''شہباز……بھی……نجانے کہاں چلا گیا ہے۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا'' شہر بانو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا……؟'' شاہ زیب اپنی لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا ادھر آیا اور شہر بانو کے رونے کی آواز سن کر بولا۔

''خرم……خان……'' وہ پھر سسکنے لگی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے……آپ پریشان مت ہوں'' شاہ زیب نے پرسکون لہجے میں کہا تو زیتون بانو اور شہر بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

''آپ……کو……کس نے بتایا ہے……؟ شہر بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے کہا……نا……آپ پریشان مت ہوں……وہ ٹھیک ہے'' وہ کہہ کر پھر اپنے کمرے میں چلا گیا اور دونوں حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد خرم خان ڈرائیور کے ساتھ گھر آ گیا تو شہر بانو نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ خرم خان سے سکول کی چھت اور بچوں کے بارے میں سوال کرنے لگی۔

''میں تو بابا کے پاس ڈیرے پر تھا……بابا نے مجھے سکول جانے ہی نہیں دیا تھا'' خرم خان نے مسکرا کر جواب دیا تو شہر بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

بہرام خان شام کو گھر آیا تو اسے بھی سکول کے بارے میں جان کر بہت حیرت ہوئی۔

''شاہ زیب بھائی……آج تو اللہ کا بڑا کرم ہو گیا۔ اناج بھی بچ گیا اور ہمارا بچہ بھی……اگر اناج تباہ ہو جاتا تو ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو جاتا اور اگر خرم خان کو کچھ ہو جاتا تو شاید ہم میاں بیوی جیتے جی ہی مر جاتے'' بہرام خان نے نم آنکھوں سے کہا۔

''بہرام خان...... یہ اللہ کی نظر کرم ہے، جب وہ کسی کو بچانا چاہتا ہے تو سمندر کی گہرائیوں اور زمین کی تہوں سے بچالاتا ہے''۔شاہ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شاہ زیب...... بھائی ...... آپ کو اس بات کی خبر کیسے ہوگئی؟'' بہرام خان نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''جب وہ کچھ بتانا چاہتا ہے تو اس کے پاس ہزار ذریعے ہیں......'' شاہ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آپ...... کیا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو ایسی باتوں کی خبر دے دیتا ہے...... کیا خوابوں کے ذریعے...... یا پھر؟'' بہرام خان نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''بہرام خان...... راز چھپے رہیں...... تو...... راز رہتے ہیں۔ظاہر کردیں تو وہ باتیں بن جاتی ہیں اور ایسی باتیں کسی کی سمجھ میں آتی ہیں اور کسی کی نہیں...... اور جب سمجھ میں نہیں آتیں تو لوگ مشکوک ہوکر پریشان ہو جاتے ہیں۔اس لئے راز کو راز ہی رہنے دو'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا آپ پر بہت کرم ہے'' بہرام خان نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اس کے کرم کی کوئی حد نہیں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''میں نے اس سے پہلے کبھی ایسے معجزے نہیں دیکھے'' بہرام خان نے حیرت سے کہا۔

''بہرام خان...... انسان...... خود اس دنیا کا بہت بڑا معجزہ ہے...... مگر ہم اپنے آپ کو ہی نہیں جان پاتے...... اور اپنے اردگرد کے معجزوں کی میں رہتے ہیں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں......'' بہرام خان نے جواب دیا اور خاموش ہوگیا۔

شہربانو...... خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حیران بھی تھی۔خرم خان کے ساتھ جو واقعہ رونما ہوا تھا۔وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔خرم خان کے واپس آنے کے بعد وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔رات کو بہرام خان کمرے میں آیا تو وہ استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے......؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' بہرام خان نے اس کی آنکھوں میں استفہام دیکھ کر پوچھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے...... جیسے آپ کو سکول کی چھت گرنے کی پہلے ہی خبر ہوگئی تھی...... اسی لئے آپ خرم خان کو سکول جانے نہیں دے رہے تھے'' شہربانو نے حیرت سے پوچھا۔

''اب...... کیا...... مسئلہ ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''بہرام...... آپ کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ......'' شہربانو نے پھر پوچھا۔

''مجھے خواب آیا تھا'' وہ زچ ہوکر بولا۔

''واقعی......'' شہربانو ایک دم بیڈ سے اُچھل کر بیٹھ گئی۔

''بھئی...... مذاق کر رہا ہوں...... میں نے تو یونہی روکا تھا۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ سکول جائے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ آنے والی مصیبت کے بارے میں دل اور دماغ کو پہلے ہی خبر دے دیتا ہے'' بہرام خان نے جواب دیا۔

''وہ...... کیسے......؟ شہر بانو نے چونک کر پوچھا۔

''انسان کی چھٹی حس...... اس کے خواب اور...... بہت سی ایسی باتیں اسے یہ سب بتا دیتی ہیں'' بہرام خان نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''میں...... خدا کا بہت شکر ادا کر رہی ہوں۔ اگر آپ خرم خان کو سکول جانے سے نہ روکتے...... تو نجانے کیا ہو جاتا...... میں تو مر ہی جاتی'' شہر بانو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اور...... میں...... بھی'' بہرام خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' شہر بانو نے چونک کر پوچھا۔

''خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ بہت اناج تباہ ہونے سے بچ گیا اور خرم خان بھی محفوظ رہا'' بہرام خان نے کہا۔

''ہاں......'' شہر بانو نے آہستہ آواز میں کہا اور خاموش ہو گئی۔ بہرام خان بھی کمرے کی چھت کو دیکھنے لگا جس میں اسے شاہ زیب کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''شاہ زیب...... بیٹا...... میں سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔ شہر بانو کی چھوٹی بہن مہر بانو...... بہت اچھی اور نیک لڑکی ہے...... شہر بانو کی بہت خواہش ہے کہ تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے......'' زیتون بانو نے رات کو شاہ زیب سے کہا تو وہ چونک گیا اور خاموش ہو گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' ''تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ زیتون بانو نے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

''اماں جان...... میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ آپ کو کیا جواب دوں......؟ کیا آپ نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے......؟ جب میں ٹھیک تھا...... اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا تھا۔ کسی کا محتاج نہیں تھا...... تو اس نے مجھے تب قبول نہیں کیا اور اب میں کتنا بے بس اور محتاج ہوں۔ آپ مجھے ایک بار پھر ایسی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہیں''۔ شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''مہر بانو...... تمہارے بارے میں سب جانتی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں'' زیتون بانو نے کہا۔

''مگر مجھے بہت اعتراض ہے...... میں اپنی بے بسی اور معذوری کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔ ویسے بھی اب مجھے شادی کی نہ خواہش ہے نہ ضرورت......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا...... تم ساری زندگی...... یونہی......؟'' زیتون بانو نے نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''زندگی ہے...... ہی...... کتنی؟'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اور...... جتنی ملتی ہے...... اسے ہر صورت میں گزارنا پڑتا ہے'' زیتون بانو نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں'' شاہ زیب نے کہا۔

''اسی لئے کہتی ہوں کہ اگر کسی کا اچھا ساتھ مل جائے تو زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔ مہر بانو بہت نیک لڑکی ہے''۔ زیتون بانو نے کہا۔

''وہ یقیناً اچھی ہوں گی...... اور اچھے انسانوں کو اچھی چیزیں اور اچھے انسان نہ ملیں تو وہ بہت دکھی ہو جاتے ہیں...... مجھ جیسا محتاج انسان ان کے دکھوں میں اضافہ ہی کرے گا...... اماں جی...... میں نہیں چاہتا کہ وہ تنہائی میں آہیں بھرے اور یہ سوچے کہ خدا نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ اماں جی...... آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اس کے دل میں ضرور یہ خیالات پیدا ہوں گے...... میری محتاجی کو بہت سے لوگوں کی حسرت اور دکھ مت بنائیں'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو زیتون بانو اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔

شاہ زیب کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ زیتون بانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... انہیں نازی یاد آنے لگی، اگر وہ شاہ زیب کو یوں دھوکہ دے کر نہ جاتی تو آج شاہ زیب کی زندگی بہت مختلف ہوتی اس کا گھر بسا ہوتا...... اور اس کے بچے ہوتے...... اس کی محرومی...... بے بسی اور محتاجی نے اسکے چہرے کے تاثرات کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

''خدا کرے...... تم کبھی خوش نہ رہو...... تمہارے چہرے پر بھی ایسے دکھوں کا رنگ نظر آئے...... تم ہی اس کی بربادی کی ذمہ دار ہو......'' زیتون بانو نے دکھ بھرے انداز میں سوچا اور ان کے دل سے نازی کے لئے بد دعائیں نکلنے لگیں۔

☆

نازی...... تیمور کی والہانہ اور شدید محبت سے پریشان ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی محبت میں اس قدر جنونی ہو رہا تھا کہ بعض اوقات نازی کو اس سے خوف آنے لگتا...... وہ جس محبت کی باسط علی سے توقع رکھتی تھی اور جس کی شدید خواہش اس کے اندر طوفان برپا رکھتی تھی ویسی ہی محبت کا طوفان تیمور کے اندر برپا رہتا اور وہ اس سے چھپی رہتی۔ تیمور اس کا اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ بعض اوقات ثروت کو بھی اس پر شک اور حیرت ہونے لگتی۔

''نازی...... یہ تیمور کو کیا ہوتا جا رہا ہے...... ؟ یہ ایسا تو ہرگز نہیں تھا، اب بہت اسٹوپڈ حرکتیں کرنے لگا ہے''۔ ثروت نے ایک شام نازی کے ساتھ تیمور کے بدلتے ہوئے رویے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہا تو نازی ایک دم بوکھلا گئی۔

''کیوں...... کیا ہوا ہے؟'' نازی نے گھبرا کر پوچھا۔

''معلوم نہیں...... لیکن کچھ گڑبڑ ضرور ہے، کبھی کھویا کھویا رہتا ہے اور کبھی ایک دم ہڑبڑا جاتا ہے...... پہلے تو بہت سوشل تھا۔ اب اپنے آپ میں اور اپنے کمرے میں گم سم رہتا ہے...... میں تو بزنس کی وجہ سے بہت مصروف رہتی ہوں...... نازی...... تم معلوم کرنا...... کہ تیمور کے ساتھ مسئلہ کیا ہے...... امی بھی بہت پریشان ہیں'' ثروت نے کہا تو نازی خاموش ہو گئی۔

''آج کل...... میں بہت مصروف ہوں...... کام بہت زیادہ ہے، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں اس سے تفصیلاً بات کر سکوں۔ ایک دو بار میں نے کوشش بھی کی ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نجانے اسے کیا ہوتا جا رہا ہے'' ثروت نے فکر مندی سے کہا۔

نازی خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔

''اب...... میں چلتی ہوں...... امی کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جانا ہے۔ تیمور سے اتنی بار کہا ہے کہ امی کو ہی ڈاکٹر کے پاس لے جائے مگر

اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔اب میں کتنی ذمہ داریاں پوری کروں۔اسے ذرا بھی خیال نہیں آتا'' ثروت نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''نازی کو یوں محسوس ہوا جیسے ثروت اس سے شکایت کر رہی ہو...... یا پھر جیسے اسے کوئی خبر مل گئی ہو''۔

''تم......اس سے ضرور بات کرنا...... مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہاری بات سنتا ہے'' ثروت نے معنی خیز انداز میں اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''م......میری......'' نازی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں......'' ثروت نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

نازی کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔اسے ثروت کے الفاظ سے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔اسے یوں لگا جیسے ثروت بلاواسطہ انداز میں اسے تیمور کے یوں بدلنے کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہو۔نازی کو غصہ آنے لگا۔اسے اپنی تذلیل سی محسوس ہونے لگی۔وہ بلا کی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔حشمت خان کی حویلی میں کسی کو جرأت نہ تھی کہ کوئی اس سے اونچی آواز میں بات کرتا اور وہ کسی کی تلخ بات سن کر خاموش ہو جائے وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی عادی تھی۔ثروت کے الفاظ اس کے کانوں میں سیسے کی طرح چبھ رہے تھے، غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا اور وہ قدرے مشتعل ہو کر تیمور کے کمرے میں گئی۔وہ بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور حلیہ بھی بے حد بگڑا ہوا تھا ورنہ وہ بہت خوش لباس اور باذوق انسان تھا۔گھومنے پھرنے اور زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کا شوقین۔

نازی کو یوں اپنے کمرے میں اچانک دیکھ کر وہ چونک گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تیمور......تم نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے'' نازی نے غصے سے کہا۔

''کونسا......تماشا؟'' تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''گھر والوں سے تمہارا رویہ کیوں خراب ہو رہا ہے......اور جانتے ہو......اس کا ذمہ دار مجھے سمجھا جا رہا ہے'' نازی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''جس نے بھی یہ سمجھا ہے۔ٹھیک سمجھا ہے'' تیمور نے کہا۔

''کیا......کیا......؟میں......؟'' نازی غصے سے بولی۔

''ہاں......تم......اور......صرف تم اس کی ذمے دار ہو......تم جب تک میری محبت کو قبول نہیں کرو گی......میں یونہی پڑا رہوں گا'' تیمور نے آہ بھر کر کہا۔

''ٹھیک ہے......میں یہاں سے جا رہی ہوں'' نازی نے غصے سے کہا اور واپس مڑنے لگی۔

''پھر میری موت کی ذمہ دار تم ہو گی'' تیمور اونچی آواز سے بولا۔

''دھمکی لگا رہے ہو؟'' نازی نے خفگی سے کہا۔

''نہیں......حقیقت بتا رہا ہوں'' اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''تم......چاہتے کیا ہو؟'' نازی نے غصے سے پوچھا۔

''تم کو پانا چاہتا ہوں...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' تیمور اٹھ کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی؟'' نازی نے اس کی جانب دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا...... صرف تمہیں پانا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں...... کاش میں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھا سکتا'' تیمور نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے جذباتی انداز میں کہا اور اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ نازی اس کے سینے کے ساتھ لگ کر سسکنے لگی۔

''میں...... بہت تھک گئی ہوں'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے سارے غم سمیٹ کر تمہیں پرسکون کر دوں گا'' وہ اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے کسی آزمائش میں مت ڈالنا'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے'' تیمور نے محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

نازی اس سے سرگوشیاں کرتی رہی اور وہ وعدے کرتا رہا۔

نازی کی محبت کو پا کر تیمور بہت پرسکون ہو گیا تھا۔ اس کا دل ہر وقت سرشار رہتا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہونے لگی تھی۔ ایک شریری مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچلتی رہتی۔ وہ نازی کو دیکھ دیکھ کر جیتا۔ وہ نظر آتی تو یوں مسکرانے لگتا جیسے خوبصورت پھول کو دیکھ کر کسی کے اندر خوشی اور طراوت کا حسین احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ جس طرف جاتی...... اس کی نگاہیں اس کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ کھل گیا تھا...... اور نازی بھی ایسی ہی جنونی اور طوفانی محبت کی خواہشمند تھی۔ جس کی تپش کو وہ دور سے ہی محسوس کر پائے۔ محبت بھری نگاہوں سے جھلسا دینے والی چنگاریاں دور سے ہی بھسم کر دیں...... اور اس کے جادوئی سحر کا طلسم کبھی ٹوٹ نہ پائے۔ وہ اکثر اپنے آپ پر...... اپنی قسمت پر اور قدرت پر حیران ہوتی تھی۔ وہ جس کی محبت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور جسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی، اس کے چھن جانے پر اپنی جان کو ختم کر دینے کی دعائیں کرتی تھی۔ وہ محبت اب کہیں گم گئی تھی۔ وہ شخص اسے اجنبی اور بے وفا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ باسط علی کے علاوہ بھی کوئی اور شخص بھی اسکی زندگی میں آئے گا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ اس سے محبت کرنے لگے گی۔ اور وہ شخص باسط علی سے بھی زیادہ شدید محبت اس سے کرے گا...... کیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ شاہ زیب اور باسط علی اس کی زندگی میں آئے اور چلے بھی گئے...... پھر تیمور نجانے کہاں سے آ گیا اور اس کے دل کے اندر سما گیا۔ تیمور کی محبت اسے ان دونوں سے زیادہ منفرد اور قیمتی محسوس ہونے لگی۔ شاہ زیب کی محبت میں نرمی، لطافت اور ٹھہراؤ تھا۔ باسط علی کی محبت میں جذباتیت غالب تھی اور تیمور کی محبت میں ہر جذبہ اور احساس اپنے عروج پر تھا...... اور وہ ایسی ہی محبت کو پانا چاہتی تھی...... اور قدرت اب اس کی خواہش پوری کر رہی تھی۔ اسے نواز رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے قدرت اس کے سابقہ دکھوں اور غموں کا ازالہ کر رہی ہو۔ اس کے ساتھ جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں ان کا نقصان پورا کر رہی ہو اور محبت کا یہ احساس اسے روز بروز پرسکون کر رہا تھا۔ وہ مسرور بھی ہو رہی تھی اور مغرور بھی...... اس کے اندر ہر جانب تیمور چھا گیا تھا...... اور تیمور کے اندر نازی......

تنہائی میں بھی تیمور کے لبوں سے نازی کا نام نکلتا اور وہ خود ہی اس سے سرگوشیاں کر کے مسکراتا رہتا...... نازی اسے اپنے تصور میں اپنے بہت قریب پا کر مسکراتی رہتی...... محبت کے خوبصورت اور پرلطیف احساس نے دونوں کو اپنے سحر میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ باسط علی کی محبت کو پانے کے لئے وہ جتنا تڑپتی رہتی تھی...... تیمور سے بن مانگے وہ محبت مل رہی تھی وہ اس کی محبت کو پا کر سرشار اور شاداں ہو گئی تھی۔

☆

تیمور کے چچا اچانک گاؤں سے آئے تھے۔ وہ انتہائی امیر اور بارعب زمیندار تھے۔ ان کے ساتھ محافظوں سے بھری ایک پوری جیپ آئی تھی جو جدید اسلحے سے لیس تھی۔

''بھابھی جان...... تیمور بیٹا آیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شہزادی اور تیمور کی شادی جلد از جلد کر دی جائے'' اس کے چچا دبیر الحسن نے بارعب انداز میں کہا۔

تیمور ان کی بات سن کر چونک گیا۔ ثروت، مسز وقار، تیمور اور دبیر الحسن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ نازی اپنے کمرے میں موجود تھی بلکہ ثروت نے ہی اسے نیچے آ کر کھانا کھانے سے منع کیا تھا۔

''ہاں...... ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں...... وہ تیمور کی بچپن کی منگیتر ہے...... تیمور کے والد نے ہی یہ رشتہ طے کیا تھا...... ہمیں تو خوشی ہو گی کہ شہزادی میری بہو بن کر اس گھر میں آتی ہے'' مسز وقار نے مسکرا کر کہا تو تیمور کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

''لیکن...... میں ابھی شادی نہیں کر سکتا''۔ وہ بمشکل بولا۔

''کیوں......؟'' دبیر الحسن نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے...... ابھی واپس جا کر کچھ ادھورے کام مکمل کرنے ہیں'' وہ بہانہ بناتے ہوئے بولا۔

''مگر...... بھابھی جان اور ثروت تو بتا رہی تھیں کہ تم تعلیم مکمل کر کے آئے ہو۔ اب وہاں کیا کام ہے؟'' اس کے چچا نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

''میرے کچھ پراجیکٹس ہیں'' اس نے جلدی سے کہا۔

''وہ کام بھی ہوتے رہیں گے۔ شادی کے بعد چلے جانا، شہزادی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی...... اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا'' دبیر الحسن نے خفگی سے کہا۔

''تو...... پھر...... آپ کہیں اور اس کی شادی کر دیں'' تیمور نے بھی غصے سے جواب دیا

''کیا...... کیا، کیا کہا......؟ تم اپنی بچپن کی منگیتر کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو۔ تم کس قدر بے غیرت ہو گئے ہو۔ تمہیں یہ بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے'' چچا نے غصے سے کہا۔

''اس میں شرم کی کیا بات ہے...... آپ کو شادی کی جلدی ہے تو آپ کہیں اور کر لیں...... مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی'' تیمور نے غصے سے کہا۔

''ان باتوں کا مطلب کیا ہے......؟ کیا تم شہزادی سے شادی کے لئے انکار کر رہے ہو......یا پھر......؟'' دبیر الحسن نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اس کا جو مطلب بھی سمجھیں'' تیمور نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تیمور...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' مسز وقار نے غصے سے کہا۔

''جو سچ ہے......وہی ان کو بتا رہا ہوں'' تیمور نے جواب دیا۔

''تیمور...... یہ رشتہ بابا نے طے کیا تھا'' ثروت بھی غصے سے بولی۔

''اور...... بابا......اب اس دنیا میں نہیں...... مگر میں اس دنیا میں ہوں......اور مجھے اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے'' تیمور غصے سے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

سب حیرت سے اسے اوپر جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔

''دبیر بھائی...... آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں'' مسز وقار نے پریشانی سے کہا۔

''یہ...... سمجھ جائے تو اچھا ہے......ورنہ'' چچا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ثروت اور مسز وقار سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

''ثروت...... تیمور کو کیا ہو گیا ہے۔ جاؤ......تم ہی اسے سمجھاؤ...... کہ یہ شادی کتنی ضروری ہے۔ ورنہ دبیر الحسن ہم سب کو تباہ و برباد کر دے گا۔ اگر تیمور رشتہ توڑتا ہے تو دبیر...... شہریار سے تمہارا رشتہ توڑ دے گا۔ یہ گھر......اس کی شان و شوکت...... دبیر الحسن کی وجہ سے ہی تو ہے'' مسز وقار نے روہانسی آواز میں کہا۔

''امی...... تیمور سب جانتا ہے۔ اسے کس بات کی خبر نہیں...... کیا وہ شہزادی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا یا پھر اسے یہ معلوم نہیں کہ شہریار سے میرا نکاح ہو چکا ہے'' ثروت نے غصے سے کہا۔

''خدا کے لئے......اسے کچھ تو سمجھاؤ'' مسز وقار نے کہا تو ثروت ان کے کہنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

☆

''نازی میں شادی کروں گا تو صرف تم سے...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' تیمور نے نازی سے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''چاہے......اس کے لئے تمہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے؟'' نازی نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''میری جان سے بڑھ کر قیمتی شے تو کوئی نہیں نا...... میں وہ بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔ تمہاری خاطر'' تیمور نے کہا تو دروازے کے ساتھ کھڑی ثروت غصے سے اندر داخل ہوئی۔

''اچھا......تو......اس کی خاطر...... تم سب کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہو...... مجھے پہلے ہی شک تھا...... مگر یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی اس قدر

بھی احسان فراموش ہوسکتا ہے۔تم اتنی ذلیل بھی ہوسکتی ہو...... مجھے یقین نہیں آ رہا'' ثروت نے غصے سے نازی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''خبردار...... ثروت...... جو نازی کو کچھ کہا...... نازی میری محبت ہے اور میں اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں'' تیمور نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تیمور...... تمہارا دماغ اس نے خراب کر دیا ہے...... شاید تمہیں معلوم نہیں کہ محبت کے جس جال میں اس نے تمہیں پھنسایا ہے یہ اس کا مشغلہ ہے'' ثروت نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ثروت...... یہ...... تم...... کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' نازی نے چلاتے ہوئے کہا۔

''شاید...... تیمور تمہاری حیثیت سے واقف نہیں...... کہ تم کس کس طرح محبت کے کھیل کھیلتی رہی ہو...... جو عورت اپنے شوہر کے گھر میں رہ کر اس سے غداری اور بے وفائی کرتی رہی ہو...... اور اس کے ہی گھر میں رہ کر محبوب پر محبت نچھاور کرتی ہو وہ کتنی قابل اعتماد ہوسکتی ہے'' ثروت نے غصے سے کہا۔

''ثروت...... میں نازی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں...... تمہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں'' تیمور ٹھوس لہجے میں نازی کا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

''تیمور...... اس نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے...... یہ گرگٹ ہے...... تمہارا خون چوس لے گی...... اور پھر تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دے گی'' ثروت غصے سے چلاتی رہی۔

نازی اس کی باتیں سن کر تلملاتی رہی اور روتی ہوئی پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے بھاگ گی۔

''ثروت...... اگر نازی میری زندگی سے چلی گئی تو میں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا'' وہ قدرے جذباتی انداز میں بولا اور نازی کے پیچھے بھاگا۔نازی اپنے کپڑوں کا بیگ لے کر نیچے چلی گئی اور تیمور بھی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور دونوں گھر سے چلے گئے۔

''ثروت...... یہ کیا ہو گیا ہے؟'' مسز وقار نے اپنی وئیل چیئر کو تیزی سے چلاتے ہوئے...... قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''امی...... وہ سب کچھ لوٹ کر چلی گئی ہے'' ثروت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''کون...... نازی......؟'' مسز وقار نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' ثروت نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''یہ کون لڑکی ہے...... اور تم اسے کہاں سے لے آئی۔اف خدایا......! یہ ہم پر کیسا عذاب نازل ہو گیا ہے۔ہم نے تو اس پر ترس کھا کر اسے پناہ دی...... اور اس نے ہمیں یہ صلہ دیا'' مسز وقار نے روتے ہوئے کہا۔

''ہم کیسے کیسے دھوکے کھاتے ہیں...... جن لوگوں پر اعتبار کرتے ہیں وہی ڈس لیتے ہیں'' ثروت نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ثروت...... کچھ کرو...... تیمور کو گھر واپس لاؤ...... ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا'' مسز وقار نے کہا۔

''ہاں...... میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گی'' ثروت کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے چمکنے لگے۔

☆

''نازی میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا...... یہ میرا وعدہ ہے'' تیمور نے نازی سے کہا۔

''مجھے تمہاری محبت پر پورا اعتماد ہے مگر ثروت میرے بارے میں بہت بدگمان ہو گئی ہے۔ میں کبھی نہیں چاہتی کہ وہ......'' نازی نے پریشان ہو کر کہا۔

''تم اس کی فکر چھوڑو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں صرف اپنی محبت کو پانا ہے...... تمہارے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے...... میں اس کو دہرا کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا......'' تیمور نے کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو...... اب مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا ہے کہ مجھے تم جیسے خوبصورت انسان کی محبت ملی ہے'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اور...... میں اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ تم جیسی خوبصورت عورت میری زندگی میں آئی۔ نازی میں تم کو اتنی محبت دوں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی'' تیمور نے بہت محبت سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''مجھے تم پر پورا یقین ہے...... مگر ہم کب تک تمہارے دوست کے گھر رہیں گے......؟ ہم کب شادی کریں گے؟'' نازی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''بس چند روز کی بات ہے...... میں نے دوسرے شہر میں نوکری کے لئے درخواست دی ہے جیسے ہی نوکری ملتی ہے ہم وہاں چلے جائیں گے اور وہیں جا کر کورٹ میرج کر لیں گے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''دوسرے شہر میں......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... یہاں شادی کرنا اور پھر اسی شہر میں رہنا مناسب نہیں'' تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' نازی نے چونک کر سوال کیا۔

''کچھ نہیں...... چھوڑو...... اس بات کو...... کوئی اور بات کرتے ہیں'' تیمور نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' نازی نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''محبت کی باتیں...... مستقبل کی باتیں...... خوشیوں سے بھرے دنوں کی باتیں...... جب میں...... اور تم خوب ہنسیں گے...... ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ پائیں گے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''وہ...... تو...... ہم ایک دوسرے کے بغیر اب بھی نہیں رہ پاتے'' نازی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

''ہاں..... مگر یہاں تو مجھے تم سے ملنے کے لئے بہت تھوڑا وقت ملتا ہے۔ شعیب کے گھر والے ہمارا یوں ملنا پسند نہیں کرتے۔ شعیب نے مجھے جلد شادی کا مشورہ دیا ہے اور اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم یہاں سے جلد چلے جائیں'' تیمور نے نازی کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''کیا ثروت نے کوئی رابطہ کیا؟'' نازی نے اچانک پوچھا۔

''نہیں.....'' تیمور نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے..... اس روز تو ثروت بہت ہنگامہ کر رہی تھی..... اور اب اتنے روز گزر گئے ہیں۔ اس نے کوئی خبر ہی نہیں لی۔ کیا تمہارے چچا نے بھی کوئی.....'' نازی نے حیرت سے پوچھا اور جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں.....'' تیمور نے آہ بھر کر جواب دیا اور نازی سے نظریں چرانے لگا۔

''کیا بات ہے.....؟ کیا مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟'' نازی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جب کہنے کو کچھ نہیں..... تو..... کیا بتاؤں؟'' تیمور نے جواب دیا تو نازی خاموش ہوگئی مگر تیمور کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اور چہرے پر پھیلے تاثرات اسے بہت کچھ بتا رہے تھے۔

''تیمور..... تم مجھ سے شادی کر کے کبھی پچھتاؤ گے..... تو نہیں؟'' نازی نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

''تم سے شادی نہ کر کے ساری زندگی ضرور پچھتاتا'' تیمور نے جواب دیا۔

''کبھی کبھی بہت بڑے بڑے دعوے بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں'' نازی نے کہا۔

''دعوے وہ کرتے ہیں جنہیں اپنے آپ پر یقین نہیں ہوتا اور مجھے اپنے آپ پر بہت یقین اور اعتماد ہے'' تیمور نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''کیسا اعتماد..... اور..... کیسا یقین؟'' نازی نے حیرت سے سوال کیا

''جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت میرا راستہ نہیں روک سکتی'' تیمور نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''کیا..... خدا بھی نہیں.....؟'' نازی نے حیرت سے سوال کیا۔

''شاید نہیں.....'' تیمور نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''تم اپنی سوچ، ارادے اور عمل میں اس قدر پختہ ہو سکتے ہو..... مجھے یقین نہیں آ رہا'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا..... تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا..... میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کرنا چاہا..... حاصل کر کے رہا..... جو خواہش کی..... وہ پوری ہوئی..... کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم مجھ سے کتنی متنفر تھی اور میری محبت پر یقین ہی نہیں کرتی تھی مگر میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوا..... اور تمہیں پانے کے لئے چچا دبیرالحسن جیسے بارعب اور جاہ و جلال والے انسان کے سامنے ڈٹ گیا۔ تیمور کسی سے نہ ڈرنے والا ہے اور نہ پیچھے ہٹنے والا، تیمور کے مقابلے میں جو آیا..... اسے ہمیشہ شکست ہی کھانا پڑی ہے'' تیمور نے قدرے فخریہ انداز میں کہا تو نازی اس کے ارادے اور عزم کی قائل ہوگئی۔

''میں نے تم جیسا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا'' نازی نے مسکرا کر کہا۔

''اور میں نے بھی تم جیسی خوبصورت نازنین کبھی نہیں دیکھی'' تیمور نے محبت سے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''تم...... جب میرے اتنے قریب ہوتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کائنات کا سارا حسن سمٹ کر میری آغوش میں آ گیا ہو اور رفتہ رفتہ میرے وجود میں سما رہا ہو'' تیمور نے محبت سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

''اور...... تم نے کبھی میرے دل کا حال نہیں پوچھا'' نازی نے سرگوشی کی۔

''وہ...... میں جانتا ہوں'' تیمور نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا......؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی نہیں...... پھر کبھی بتاؤں گا'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں...... تم...... کبھی نہیں بتا سکتے'' نازی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور...... اگر...... میں بتا دوں...... تو......؟'' تیمور نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''تو......؟ تو......؟ نہیں...... تم بتا ہی نہیں سکتے'' نازی نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک انسان کبھی بھی دوسرے انسان کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان چاہے ہزار کوشش کر لے'' نازی نے جواب دیا۔

''مجھے چیلنج مت کرو...... چیلنج کرنے والے کبھی مجھ سے جیت نہیں سکتے'' تیمور نے جواب دیا۔

''اچھا...... تو...... بتاؤ...... کیا ہے میرے دل میں؟'' نازی نے پوچھا۔

''میں...... اور میری محبت'' تیمور نے جواب دیا۔

''اور......'' نازی نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''اور......؟'' تیمور نے کچھ کہنا چاہا...... کہ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ تیمور نے صوفے سے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا، اس کے سامنے شعیب کھڑا تھا۔

''یار...... تم لوگ کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ میرے والدین بہت ناراض ہو رہے ہیں'' شعیب نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''کیا...... اس وقت...... ؟ شام ہو رہی ہے......'' تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اسی وقت...... آئی ایم سوری'' شعیب کہہ کر چلا گیا اور تیمور نے دروازہ بند کر کے نازی کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں اسی وقت یہاں سے جانا پڑے گا'' تیمور نے جواب دیا۔

''کیا...... اس وقت؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' تیمور نے جواب دیا اور دونوں اپنی چیزیں سمیٹنے لگے۔

(۱۷)

''ارسلان کو کسی نامعلوم شخص نے گولی ماردی ہے......اورزل......کومے میں رہی ہے'' اسامہ نے شہیر کو بتایا۔

''کب......؟'' شہیر نے چونک کر پوچھا۔

''پچھلے ہفتے......وہ اپنے نئے گھر گئے تھے......وہیں کسی نے ارسلان کو گیٹ پر بلا کر گولی ماردی۔ اٹس وری ٹریجک، ارسلان بہت اچھا انسان تھا۔ بہت پیارا......جانتے ہو، جب میں نے اسے تمہاری ڈسٹربڈ میریڈ لائف کے بارے میں بتایا تو وہ بہت پریشان ہوگیا۔ مجھے کہنے لگا......اسامہ......شہیر کو میرے پاس لاؤ......اسے ہماری محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ وہ ہر ایک سے پیار کرنے والا......سب کا ہمدرد اور بہت انسان دوست تھا۔ انسانیت سے محبت کرنے والا......ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ نجانے کیوں قدرت انہیں جلد اپنے پاس بلا لیتی ہے......ایسے انسانوں کی دنیا والوں کو بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ سچ......مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا......کہ......ارسلان ہم کو چھوڑ کر چلا گیا ہے......اتنا خوبصورت دل رکھنے والا انسان کیسے آناً فاناً سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے......میں تو سوچتا ہوں زل اس کے بغیر کیا کرے گی......؟ وہ تو اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی......اور......وہ......Pregnant بھی ہے''۔

اسامہ نے بتایا تو شہیر کے چہرے کے تاثرات بننے لگے۔

''کب......؟ مجھے تو نہیں معلوم......'' نادانستہ شہیر کے منہ سے نکلا۔

''کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ شاید ارسلان کو بھی نہیں۔ زل اب ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئی ہے تو ڈاکٹر نے ابھی بتایا ہے، اٹس وری شاکنگ......تم نہیں جانتے انہوں نے کتنی محبت اور چاہت سے اپنا گھر بنایا ہے مگر......افسوس......!'' اسامہ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ معلوم ہو سکا......کہ......کس نے ارسلان کو گولی ماری ہے؟'' شہیر نے پوچھا۔

''نہیں......FIR تو لکھوائی ہے......مگر یہی لگتا ہے کہ کسی نے پلاننگ سے یہ سب کیا ہے......مگر......ارسلان کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اس بات پر یقین نہیں آتا'' اسامہ پریشانی سے بولا۔

''کیا......کہا جا سکتا ہے۔ مجھے تو خود یہ سب کچھ جان کر بہت افسوس ہوا مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے کسی سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو سکا'' شہیر نے افسردگی سے کہا۔

''ہاں......میں نے تمہیں فون کیا تھا مگر تمہارا فون آف تھا'' اسامہ نے کہا۔

''زیادہ تر میڈیسنز کھا کر سویا رہتا ہوں۔ اس لئے موبائل بھی آف رکھتا ہوں......'' شہیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... تم...... ریسٹ کرو...... پھر ملیں گے'' اسامہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''زل...... اب کیسی ہے؟ گھر میں ہے...... یا ہاسپٹل میں؟'' شہیر نے پوچھا۔

''اب تو گھر شفٹ ہو چکی ہے...... مگر ہر وقت خاموش رہتی ہے یا پھر روتی رہتی ہے'' اسامہ نے بتایا۔

''میں کچھ بہتر ہو جاؤں تو پھر اس سے ملنے جاؤں گا'' شہیر نے اسامہ کو رخصت کرتے ہوئے کہا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

زل کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی دنیا خالی ہو گئی ہو۔ اس کا گھر کسی نے توڑ دیا ہو...... اس کے سر سے چھت چھین لی ہو۔ اس کا دل ہر وقت شدت غم سے پھٹنے کو بے تاب رہتا...... اور آنکھیں ہر وقت برسنے کو تیار...... ارسلان ہر لمحہ، ہر پل اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا...... اور وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی۔

''میں تمہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں...... ارسلان...... نجانے کس کی نظر ہماری خوشیوں کو کھا گئی ہے...... ہماری محبت کی زندگی اتنی مختصر کیوں نکلی...... ہم نے تو بہت سے دن...... بہت سے لمحے اور بہت سا وقت اپنے گھر میں ایک ساتھ گزارنا تھا۔ ہمارا ''محبت کدہ'' تو ہمارے وہاں جانے سے پہلے ہی 'ماتم کدہ' بن گیا...... '' وہ اپنے دل میں ہی اس سے باتیں کرتی رہتی، اس سے شکوے کرتی...... اور جب بہت بے تاب ہو جاتی تو سسکیاں بھرنے لگتی۔

اس کے والدین اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اسے اس گھر سے ارسلان کے وجود کی، اس کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ اس گھر میں گزارا ایک ایک پل اس کے لئے قیمتی سرمایہ تھا...... اور وہ اپنے قیمتی سرمائے کو کسی بھی طرح چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

اس گھر کو چھوڑنے کا مطلب ارسلان کو چھوڑنا تھا۔

اور اس کے پاس ارسلان کی نشانی بھی تھی۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ماں باپ کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

روشنی بہت دنوں کے بعد اپنی ماں سے ملنے گھر آئی تو اس نے اسامہ کو فون کیا۔ اسامہ کے منہ سے ارسلان کی موت کا سن کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ ارسلان اور زل کی محبت کو دیکھ کر وہ رشک کرتی تھی۔ زل کی قسمت پر حیران ہوتی تھی جس کو قدرت نے ہر شے فراوانی سے دی تھی۔ نجانے دونوں کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔

روشنی زل سے ملنے اس کے گھر گئی تو زل کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ ایک مرجھایا ہوا زرد پتہ لگ رہی تھی جس پر خزاں نے بری طرح حملہ کیا تھا اور اس کی شادابی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا تھا۔ اسامہ بھی روشنی کے ہمراہ تھا۔ اسامہ نے شہیر کو بھی فون کیا تو وہ بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گیا...... زل ایک مجسمے کی مانند ان کے سامنے بیٹھی آہیں بھرتی رہی اور روتی رہی...... روشنی، شہیر کو دیکھ کر حیران رہ گئی...... وہ بہت بیمار پژمردہ اور بوڑھا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی اور ویرانی تھی۔ وہ روشنی کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا، جواب میں روشنی نے سرد آہ بھری...... اس کے بعد دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ روشنی ارسلان کی باتیں کرتی رہی اور زل خاموشی سے سن کر روتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد سب اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

روشنی، شہیر کو دیکھ کر بری طرح ڈسٹرب ہو گئی تھی۔اس کا دل پھر بے چین ہونے لگا تھا۔شہیر کی حالت دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ اور......اپنا دل اسے کھول کر نہ دکھانے کا رنج......

ہم دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں......روشنی نے افسردگی سے سوچا اور اپنی نم آنکھوں کو ملنے لگی۔

''ہماری کیا خطا ہے......؟ یہ......کہ ہم ایسی محبتوں میں گرفتار ہوئے......جو ہمارے مقدر میں نہیں لکھی گئیں......'' روشنی سوچتی رہی اور روتی رہی۔

شہیر سے محبت نہ کرنے پر اس کا دل تیار نہیں تھا۔نجانے اس کے دل نے اس کو کسی خود فریبی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اس کی محبت ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو گی اور شہیر اس کا ہو گا......جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ شہیر کی اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں......تو اس کے دل نے پھر اس کی امید کو یقین میں بدل دیا تھا وہ ضرور میرا ہو گا......اور وہ اس دن کی آس میں نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔

☆

زل کو بہت مشکل سے اسامہ اور ارسلان کے گھر والوں نے آرٹ اکیڈمی جانے پر اصرار کر کے منایا تھا تا کہ وہاں جا کر اس کا دل بہل جائے۔ورنہ وہ سارا وقت گھر میں بیٹھ کر روتی رہتی۔

''ارسلان کے بغیر کیسے اس آفس میں بیٹھوں گی؟'' زل نے روتے ہوئے اسامہ سے کہا۔

''اکیڈمی چلانا......ارسلان کا خواب تھا......کیا تم اس کے خوابوں اور خواہشوں کو ادھورا چھوڑ دو گی......ارسلان جیسے اچھے انسان کا نام تم نے روشن کرنا ہے......اس کے خوابوں کو تم نے پورا کرنا ہے......وہ تو تاریکی میں امید کی کرن تھا......کیا تم اس کی کرنوں سے دنیا کو روشن نہیں کرو گی......؟'' اسامہ قدم قدم پر اسے سمجھاتا۔اس کی مدد کرتا،اس کو حوصلہ دیتا......بہت لوگوں کے قائل کرنے پر اس نے اکیڈمی جانا شروع کر دیا تھا۔وہاں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ارسلان ہر پل یاد آتا......اس کی باتیں ہر موقع پر یاد آتیں تو وہ سب کچھ چھوڑ کر ان گزارے ہوئے لمحوں کو یاد کرنے میں مصروف ہو جاتی جو اس نے ارسلان کے سنگ گزارے تھے۔

شہیر کی طبیعت سنبھلنے لگی تو اس نے بھی اکیڈمی جانا شروع کر دیا۔زل کو اس کا آنا ناگوار لگتا تھا مگر اسے ارسلان کی بات بار بار یاد آتی کہ شہیر کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ارسلان کے کہے کو وہ ٹال نہ سکی تھی اس لئے شہیر کے آنے پر خاموش رہتی۔ارسلان کو فوت ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے مگر نہ تو اس کے قاتل پکڑے گئے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی سراغ ملا تھا۔شہیر آفس میں زیادہ تر وقت زل کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا۔بات بے بات اس سے مشورہ کرنے کیلئے کافی دیر بیٹھ کر ارسلان کو ڈسکس کرتا۔زل اور ارسلان کی تعریفیں کرتا،زل کو ہر بات میں حوصلہ دیتا......زل اس کے رویے میں گہری تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ارسلان کی زندگی میں وہ اکثر اس سے اپنی کھوئی ہوئی محبت کا ذکر کرتا......اکثر دلبرداشتہ ہو کر مایوسی سے باتیں کرتا مگر ارسلان کے جانے کے بعد وہ قدرے محتاط انداز میں گفتگو کرتا......بات کرتے ہوئے زل کے تاثرات دیکھتا......انہیں محسوس کرتا اور پھر بات آگے بڑھاتا......زل رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی تھی......اور شہیر پر پہلے سے زیادہ بھروسہ کرنے لگی تھی......شہیر اکثر گھر آنے لگا تو اس کے

سسرال والوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''شہیر...... پلیز آپ گھر مت آیا کریں۔ میرے سسر آپ کے آنے جانے کو پسند نہیں کرتے'' ایک روز زمل نے اسے آفس میں کہا۔

''کیوں......؟ کیا انہیں معلوم نہیں...... کہ میں ارسلان کا بھی دوست تھا۔'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''جانتے ہیں...... مگر اب ارسلان اس دنیا میں نہیں'' زمل نے آہ بھر کر کہا۔

شہیر بغور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''شکر ہے آج آپ نے اس بات کا اقرار اپنی زبان سے کیا۔ کوئی اور کہتا تو شاید آپ اس کی بات نہ مانتیں'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب......؟'' زمل نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''زمل...... ارسلان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ آپ کے پاس صرف اس کی یادیں ہیں اور یادوں کے سہارے کب تک زندگی گزاری جا سکتی ہے'' شہیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے رکا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' زمل نے حیرت سے پوچھا۔

''زمل...... میری زندگی میں جو خلا ہے...... جو کمی ہے...... وہ آپ کی وجہ سے ہے...... میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کی محبت کو اپنے دل سے نکال سکوں...... مگر یہ محبت ہر روز بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہ محبت نہیں...... عشق ہے...... میں آپ سے کتنی محبت، کتنا عشق کرتا ہوں...... کاش آپ جان سکیں......'' شہیر بے بسی سے رونے لگا۔

پلیز...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں......؟'' زمل گھبرا کر بولی۔

''میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں...... کہ...... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا...... میری زندگی...... میری سانسیں...... آپ کے بغیر ادھوری ہیں...... میرا دل آپ کے بغیر اداس اور بے چین رہتا ہے اور روح پیاسی...... میں کیا کروں......؟ کیا میں اتنا برا ہوں کہ آپ نے مجھے کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا...... کہ میرے بارے میں سوچتیں...... کیا میری محبت اتنی گھٹیا ہے کہ آپ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتیں...... کیا میں واقعی اس قابل نہیں کہ آپ کی زندگی میں کبھی آ نہیں سکتا، زمل...... میں...... میں...... آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا...... اور اگر آپ نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا'' شہیر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ زمل اس کی باتیں سن کر گھبرانے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا کہے...... اس کے بہتے آنسوؤں کی صداقت کو جھٹلائے یا اس کے کہے ہوئے الفاظ کی سچائی پر یقین نہ کرے...... وہ مخمصے کا شکار ہونے لگی۔

''شہیر...... اب یہ ممکن نہیں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''کیوں ممکن نہیں......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ارسلان ایک بہت بڑی ذمہ داری مجھ پر ڈال گیا ہے۔ مجھ پر اس کی ہونے والی اولاد کی ذمہ داری ہے۔ پلیز آپ ایسا سوچنا چھوڑ دیں'' زمل نے اسے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''میں آپ سے کچھ نہیں چھیننا چاہتا۔ میں جو چاہتا ہوں وہ صرف آپ ہی مجھے دے سکتی ہیں۔ میں ارسلان کی اولاد کو اپنے سینے سے لگا کر پالوں گا۔ پلیز آپ مجھے اس قابل تو سمجھیے'' شہیر بے بسی سے التجائیں کرنے لگا تو زمل خاموش ہو گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا...... وہ اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہی اور وہ اس خاموشی سے پر امید ہونے لگا...... زمل شدید الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ قدرت اسے کسی آزمائش میں ڈال رہی تھی۔ نہ تو وہ ارسلان کی محبت سے دستبردار ہونا چاہتی تھی...... اور...... نہ ہی شہیر کے ٹوٹے دل کو مزید توڑنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں شہیر کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی محبت نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ کالج کے زمانے کے شہیر اور آج کے شہیر کا موازنہ کرتی تو چونک جاتی۔ وہ اس شہیر جیسا بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔ اس کی مبہم سی شبیہ لگتا تھا...... اس کا بیمار...... مضمحل عکس...... اس کی نیم مردہ تصویر...... وہ اس کی وجہ سے بیمار ہوا تھا۔ اس کے دل کو روگ اس نے لگایا تھا...... اس کی زندگی سے خوشیاں اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اس نے چھینی تھی...... اس کو اتنا مضطرب کر دیا تھا کہ اسے کسی پل بھی سکون نہیں آتا تھا۔ جو اس کی نام نہاد شادی شدہ زندگی میں تھوڑا سا سکون لے آئے۔'' زمل نے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دل پر بہت حیران ہوتی۔ جب شہیر نے پہلی بار اس سے اظہار محبت کیا تھا تو اس کا دل شہیر کے نام سے ہی بدکتا تھا اور اب وہ جیسے جیسے اس کے بارے میں مثبت ہو کر سوچتی تو دل بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ وہ دل کی دوغلی پالیسی پر حیران ہوتی تھی...... مگر جو بھی تھا اب دل شہیر کے بارے میں اسے مثبت جواب دے رہا تھا۔

''زمل...... ہم کب شادی کریں گے؟'' ایک روز شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آف کورس...... بی اے کے بعد......'' زمل نے مسکرا کر جواب دیا۔

''زمل...... اور وہ دن...... میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا دن ہوگا جب تم میری زندگی میں آؤ گی۔ میرا دل چاہتا ہے میں تمہارے قدموں تلے اتنے پھول بچھاؤں...... کہ...... تمہارا کوئی قدم زمین پر نہ پڑے...... تمہاری آنکھوں کو خوشی کے جگنوؤں سے بھر دوں...... زمل تم سوچ نہیں سکتی...... کاش تم میرا دل کھول کر دیکھ سکتی......'' شہیر فرط جذبات سے بولا۔

''اس میں ہر طرف خون ہی خون نظر آئے گا'' زمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... آپ کی محبت کے زخم کھا کر خون کے آنسو روتا ہے'' شہیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا ابھی بھی روتا ہے......؟'' زمل نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

نہیں...... اب تو بہت خوش ہے...... بات بے بات مسکراتا رہتا ہے۔ نجانے محبوب کی نظر میں کیا جادو ہوتا ہے کہ دل قابو میں ہی نہیں رہتا...... محبوب کے اک جلوے پہ سب کچھ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے...... آپ کو اس دل کی کیا کیا خرابیاں بتاؤں؟ شہیر شوخ لہجے میں بولا۔

''بس...... بس...... اب سارا الزام دل کو مت دو......'' زمل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''کیا آپ کو واقعی یقین نہیں آتا کہ دل کیا کیا چار سو بیسیاں کرتا ہے...... محبوب روٹھ جائے تو یہ بیمار...... محبوب خوش تو یہ خوشی سے دیوانہ...... اور...... اگر محبوب کوئی تمنا کرے تو آسمان کے تارے اس پر قربان...... محبوب کی ابرو کے اشارے پر جان فدا اور تخت و تاج محبوب کے

قدموں پر نچھاور...... آپ نہیں جانتی ...... یہ دل کس حد تک مجبور اور بے بس کر دیتا ہے مگر پھر بھی بے گناہ ...... بندے کو پھنسا کر ...... خود معصوم بن کر لاتعلق ہو جاتا ہے...... سب کو چھوڑیے...... مجھ سے پوچھیں ...... مجھ پر کیا بیتی ...... ساری دنیا ویران اور سونی لگتی تھی ...... اور اب تو جھاڑیوں میں بھی پھول کھلے نظر آتے ہیں ...... پہلے مسکراتے لوگوں کو دیکھ کر بھی غصہ آتا تھا اور اب خود بخود مسکراہٹ لبوں پر پھیلتی ہے......'' شہیر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''مطلب واضح ہے ...... یہ محبت کا اثر ہے ...... اور ...... جو اس کا اسیر ہو جاتا ہے وہ اسی طرح دیوانہ ہو جاتا ہے...... اسی لئے تو کہتے ہیں ...... محبت چھپائے نہیں چھپتی ...... اس میں کسی کو ڈیل کرنے کے کافی سے زیادہ چانسز ہوتے ہیں'' شہیر ہنسا ...... تو اسے خود محسوس ہوا جیسے وہ برسوں بعد دل سے ہنس رہا ہو۔

''زل ...... میں پورے پانچ سالوں بعد آج ہنس رہا ہوں ...... اور یہ ہنسی ...... یہ مسکراہٹ آپ کی وجہ سے ہے ...... ورنہ ...... ہم تو سوکھے پھول کی طرح جھڑتے ہی رہتے تھے'' شہیر نے کہا تو زل اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

☆

حرا ...... شہیر میں واضح تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ڈرنک کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا اور موڈ بھی قدرے خوشگوار رہتا ...... حرا سے کوئی قریبی تعلق تو نہیں تھا ...... لیکن اب حرا سے وہ خود ہی کوئی نہ کوئی بات کرنا شروع ہو گیا تھا ...... کبھی اس کی مصروفیت کا پوچھتا ...... کبھی ہاسپٹل کا ...... کبھی اس کی جاب کا ...... کبھی اس کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کو کہتا تو وہ چونک کر اس کی جانب حیرانگی سے دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی۔

شہیر اب زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے...... اسے میں نظر آنے لگی ہوں ...... وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے...... اس کا مطلب ہے اس کا دل میری طرف مائل ہو رہا ہے ...... وہ خوش بھی رہنے لگا ہے...... اور ...... اس کی آنکھوں میں ٹھہری اداسی اور نمی بھی کم ہونے لگی ہے۔ وہ کمرے میں لیٹ کر چھت کو گھورتا نہیں رہتا ...... وہ اچھا میوزک سننے لگا ہے اور کئی سالوں کے بعد اس نے اپنے اسٹوڈیو میں جا کر پینٹنگز بنانا شروع کی ہیں ......

اسے شہیر کی ہر بات اور ہر حرکت پر حیرانگی ہوئی مگر اس کے ساتھ خوشی کا گہرا احساس اس کا دل سرشاری سے بھر دیتا ...... اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی اذیت کے دن ختم ہونے والے ہوں جب سمیر کو شہیر کے بارے میں معلوم ہوگا تو وہ کس قدر خوش ہوگا ...... اس نے مجھے جس آزمائش میں ڈالا تھا میں اس آزمائش میں سرخرو ہو جاؤں گی ...... وہ شہیر کی صحت مند زندگی تو چاہتا تھا ...... اسے نارمل زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ سمیر یہ سب جان کر کتنا خوش ہوگا۔ حرا شہیر کے بارے میں مثبت سوچ کر خوش ہو جاتی۔

حرا شام کو ہاسپٹل سے لوٹی تو شہیر اپنے سٹوڈیو میں ایک پینٹنگ بنانے میں مصروف تھا۔ چائے، کباب اور فرنچ فرائز بنا کر اس کے اسٹوڈیو میں لے گئی۔ شہیر اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ حرا نے ٹرے اس کے قریب ٹیبل پر رکھا اور چائے بنانے لگی۔

''چائے پی لیں......'' حرا نے مسکرا کر اسے کہا۔

شہیر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

''تھینک یو......اس وقت بہت دل چاہ رہا تھا......آپ خود ہی چائے لے آئیں......''شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم تھا......آپ کو چائے کی طلب ہو رہی ہوگی''حرا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیسے......آپ کو کیسے پتہ چلا......؟شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''جن کے قریب رہتے ہیں......ان کی بہت سی باتوں کا خود بخود پتہ چل جاتا ہے''حرا نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

شہیر اس کی بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''چائے بہت اچھی ہے''وہ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔

''تھینک یو......جب انسان کا دل مطمئن اور خوش ہوتا ہے تو ہر چیز اچھی لگتی ہے''حرا نے جواب دیا۔

''آپ ہاسپٹل سے کب آئیں؟''شہیر نے پوچھا۔

''ایک گھنٹہ ہو گیا ہے......شیف چائے بنا رہا تھا......تو میں اس کے ساتھ بنانے لگی اور آپ کے لئے اوپر لے آئی......شہیر......ایک بات پوچھوں......''حرا نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں......''شہیر نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''آج کل آپ بہت خوش لگ رہے ہیں......کیا......؟''حرا نے سوال ادھورا چھوڑا تا کہ وہ خود جواب دے۔

''ہاں......یونہی......ایسی کوئی بات نہیں''اس نے بات گول کی اور خاموش ہو گیا۔

حرا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کا جواب نہ دینا چاہتا ہوں......اس لئے اس نے مزید پوچھنا پسند نہ کیا اور برتن ٹرے میں رکھ کر باہر نکل آئی''

شہیر اپنی پینٹنگ بنانے میں پھر مصروف ہو گیا۔

☆

زل اپنے نئے گھر کو بیچنا چاہ رہی تھی......اس نے اس کا ایک ایک کونہ ارسلان کے ساتھ مل کر ڈیکوریٹ کیا تھا۔اس میں رہنے اور بسنے کا خواب دونوں نے اکٹھے دیکھا تھا۔مگر اب ارسلان کے بغیر وہ گھر اسے اچھا نہیں لگتا تھا......گیٹ پر قدم رکھتے ہی اسے ارسلان کی لاش نظر آتی تھی......ارسلان کے قتل کے بعد وہ دوبارہ کبھی اس گھر کی طرف نہیں گئی تھی۔اس کے ساس سسر اس کو بہت سمجھاتے مگر وہ کوئی دوسری بات سننے کو تیار نہیں تھی......شہیر نے بھی اسے بہت سمجھایا......شہیر یہ گھر اس سے خرید کر اسے ہی گفٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ کسی بات پر نہیں مانتی تھی۔

''نہیں......شہیر......میں وہاں نہیں رہ سکوں گی''زل نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیوں......؟''شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں......مجھے ارسلان بہت یاد آئے گا......اور......میں شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاؤں گی......''زل بے بسی سے بولی۔

شہیر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''میں کبھی نہیں چاہوں گا۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔میرے اور تمہارے درمیان کوئی تیسرا آئے''شہیر نے دل میں سوچا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔انسان کا ماضی۔۔۔۔۔اس کے حال اور مستقبل کو بھی اذیت ناک بنا دیتا ہے۔۔۔۔۔اور میں آپ کو کسی قسم کی اذیت میں دیکھنا نہیں چاہوں گا۔۔۔۔۔''شہیر نے جواب دیا تو زِل بھی خاموش ہو گئی۔

''شہیر۔۔۔۔۔شادی کے بعد ہم کہاں رہیں گے؟''اچانک زِل نے پوچھا تو شہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میرے گھر میں۔۔۔۔۔''شہیر نے بے ساختہ جواب دیا۔

''اور آپ کی بیوی۔۔۔۔۔کیا وہ بھی وہاں رہے گی؟''زِل نے پوچھا۔

''میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔۔۔۔۔''شہیر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب۔۔۔۔۔؟''آپ نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا۔

''بے بی کی برتھ نزدیک آ رہی ہے۔۔۔۔۔''زِل نے کہا تو شہیر سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔کیا حرا اس گھر میں رہے یا پھر آپ کسی اور گھر میں شفٹ ہونا پسند کریں گی۔۔۔۔۔''شہیر نے پوچھا۔

''کیا آپ اس شادی کے بارے میں حرا کو بتائیں گے؟''زِل نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اس کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔۔۔۔کیونکہ وہ جیسی زندگی میرے ساتھ گزار رہی ہے۔۔۔۔۔اس سے بہت بہتر وہ تنہا زندگی گزار سکتی ہے''شہیر نے کہا تو زِل خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔اسے کیا کہے۔۔۔۔۔اور کس موضوع پر۔۔۔۔۔؟

☆

''ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔۔۔ایک ایکسیڈنٹ کیس ہے۔وہ ایمرجنسی روم میں ہے''سٹاف نرس نے ڈاکٹر حرا کو آ کر گھبراہٹ میں بتایا۔

حرا جلدی سے اٹھی۔۔۔۔۔اور اس کے ہمراہ چلی گئی۔

مریضہ کی حالت بہت خطرناک تھی۔۔۔۔۔حرا نے اسے چیک کیا۔

''اس کا آپریشن بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔اس کی فیملی کہاں ہے۔۔۔۔۔ان کو جلدی سے بلاؤ۔۔۔۔۔''حرا نے جلدی جلدی کہا۔

ایک نرس نے پیپرز تیار کیے اور زِل کی ساس اور سسر کو بلا لائی اس کے پیرنٹس ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

''مریضہ کا کیا نام ہے۔۔۔۔۔؟''حرا نے جلدی سے پوچھا۔

''زِل۔۔۔۔۔زِل۔۔۔۔۔ارسلان''اس کا سسر بولا۔

حرا کو جھٹکا لگا۔۔۔۔۔اس کا پین،لکھتے لکھتے رک گیا۔۔۔۔۔اس نے چونک کر حرا کی ساس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کرتی ہیں؟''حرا نے تصدیق کرنے کے لئے پوچھا۔

''تصویریں بناتی ہے۔۔۔۔۔''اس کی بوڑھی ساس بولیں۔

''آرٹ اکیڈمی میں کام کرتی ہے'' اس کے سسر نے کہا۔

''اوران کے شوہر کہاں ہیں......؟'' حرا نے پوچھا۔

''اب وہ اس دنیا میں نہیں......'' اس کے سسر نے بتایا۔

''اوہ......ویری سوری......زل کی حالت بہت خطرناک ہے ان کا آپریشن ہوگا......لیکن ایک بات بتانا بہت ضروری ہے......کہ مریضہ کی جو حالت ہے......اس کے پیش نظر یا بچے کی جان بچائی جا سکتی ہے......یا......ماں کی......آپ لوگوں کا کیا خیال ہے......'' حرا نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

زل کی ساس اور سسر نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

''میرے بیٹے کی نشانی......؟'' ساس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا اور رونا شروع ہو گئی۔

''ڈاکٹر......کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ دونوں کو بچا لیں......'' اس کے سسر نے پوچھا۔

''ظاہر ہے......میں اپنی پوری کوشش کروں گی مگر......کچھ کہہ نہیں سکتی'' حرا نے کہا۔

''آپ جو مناسب سمجھیں'' اس کے سسر نے کہا۔

''ٹھیک ہے......یہاں دستخط کر دیں'' حرا نے پن اور کاغذ اس کے سسر کو تھماتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خاموشی سے دستخط کر دیئے، حرا کاغذات لے کر اندر چلی گئی۔

اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا......زل کو آپریشن تھیٹر میں لایا گیا۔ اس دوران حرا اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر پسینہ آ رہا تھا......اس نے زل کی طرف دیکھا، سوچا اور ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔

''یہ وہ ہے......جس کی وجہ سے شہیر مجھ سے دور ہے اور مجھے محبت، ہمیشہ اس کے صدقے میں ملی ہے......اگر یہ ہم دونوں کے درمیان نہ ہو......تو......شہیر میرے قریب آ سکتا ہے......وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہا ہے......اگر یہ نہ ہو......تو......تو......؟'' حرا نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔

''ڈاکٹر صاحب......آ جائیے......آپریشن تیار ہے'' سٹاف نرس نے آ کر اسے اطلاع دی۔

''قدرت مجھے کیسے کیسے آزما رہی ہے......کیا کروں......؟ مجھے کیا کرنا چاہیے......میرے ہاتھ میں کسی ایک کو بچانے کا اختیار دے کر مجھے اس نے کس قدر ذہنی اذیت میں ڈال دیا ہے'' آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔

اس نے زل کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اس کے دل میں اس کے لئے کوئی اچھے جذبات نہیں تھے۔ اس نے بچے کو بچانے کا سوچ لیا تھا۔

اس نے آپریشن شروع کیا......تو وابریشن پر آن اس کا موبائل بجا......اس نے چونک کر موبائل کی طرف دیکھا......جو ایک نرس کے پاس تھا۔

''کس کا فون ہے؟'' حرا نے پوچھا۔

''کسی سمیر صاحب کا فون ہے'' نرس نے دیکھ کر جواب دیا۔

''فون آف کر دو'' حرا نے کہا۔

''سمیر نے مجھے اس وقت کیوں فون کیا ہے......؟ اس نے تو کبھی مجھے فون نہیں کیا......پھر......کیوں؟'' وہ چونکی مگر اس کے خیال کو جھٹک کر آپریشن کرنے میں مصروف ہوگئی۔

''محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ جب وہ صرف اپنی ذات، اپنی خوشیوں اور تمناؤں کے بارے میں سوچتا ہے اور جب اس کی محبت میں سب کا دکھ، درد شامل ہوتا ہے تو وہ مسیحا بن جاتا ہے......حرا تم خوش قسمت ہو......قدرت نے تمہیں مسیحا بنایا ہے'' سمیر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ الجھنے لگی...... اس کا دل پریشان ہونے لگا...... مگر وہ آپریشن کرنے میں مصروف رہی۔

''کیا ہے......؟'' نرس نے پوچھا۔

''بے بی......بوائے'' حرا نے سرگوشی کی۔

سب نے حرا کی طرف دیکھا۔ سب کی نظروں میں استفہام تھا......حرا کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے اندر شدید کشمکش جاری تھی۔

''تم......مسیحا ہو......تم خوش قسمت ہو......الفاظ پھر گونجے''۔ حرا کو اچانک اپنا ارادہ بدلنا پڑا......اس نے جو سوچا پھر اس پر مطمئن ہوگئی۔

اس نے زل کو بچا لیا......اس کے ذہن سے بوجھ اتر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سمیر نے اسے اس خاص مقصد کے لئے فون کیا تھا۔

سمیر کے فون میں کوئی پراسرار حکمت موجود تھی۔ سمیر کے فون کے بعد حرا نے اپنا ذہن بدلا تھا۔ اور سمیر نے کبھی بھی اسے ہاسپٹل کے اوقات میں فون نہیں کیا تھا۔ پھر آج کیوں......؟ اور اس وقت ہی کیوں......؟ شاید اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں کیا کرنے جارہی تھی......اور وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے کبھی اس کا کہا نہیں ٹالا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی۔ زل کے والدین بھی پہنچ چکے تھے۔ سب نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''بچے کو بچانا ممکن نہیں تھا......ماں ٹھیک ہے'' وہ جلدی سے کہہ کر اپنے کمرے میں گئی......اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی......اس کا دل سرشار بھی تھا اور مضطرب بھی۔ مطمئن بھی......اور......بے قرار بھی......جیسے کوئی صاحب دل اپنی پلیٹ میں پڑا سارا کھانا خیرات میں دیتا ہے......یہ سوچتے ہوئے کہ مانگنے والے کو اس کھانے کی زیادہ ضرورت ہے اور سب کچھ دے کر اس کا دل خوش بھی ہوتا ہے مگر اسے اپنی بھوک کی بھی فکر ہوتی ہے......یہی حال اس کا بھی تھا۔ وہ مطمئن بھی تھی مگر زل کے بچ جانے کی صورت میں بہت سے خدشات اور وسوسے بھی تھے۔ اس نے آہ بھری۔

نرس اس کا موبائل لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحبہ......آپ اپنا موبائل آپریشن تھیٹر میں بھول آئیں'' نرس نے اسے موبائل پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......''اس نے موبائل پکڑ کر آن کیا۔نرس کمرے میں سے باہر نکل گئی۔اسی لمحے اس کا موبائل بجنے لگا۔اس نے موبائل دیکھا، سمیر کا فون تھا۔

''ہیلو......''حرا نے آہستہ آواز میں کہا۔

''حرا......کیسی ہو......؟تم ٹھیک ہو نا......''سمیر قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں......کیوں......کیا بات ہے؟''حرا نے پوچھا۔

کل رات میں نے تمہیں خواب میں بہت پریشان دیکھا۔اس وقت سے میں بہت اپ سیٹ ہوں......اور تمہارا نمبر ملا رہا ہوں......مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی''سمیر نے بتایا۔

''تھینکس فار یور کال......آئی ایم فائن''وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''شہیر تو ٹھیک ہے نا......وہ تمہارے ساتھ''سمیر نے پوچھا۔

''ہاں......سب ٹھیک ہے''حرا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا''سمیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور وہ موبائل کو پکڑے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

محبت بھی کیسا عجیب رشتہ ہے......جس میں دل ایک دوسرے سے برقی تاروں سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑے ہوتے ہیں......جو اَن کہی باتیں......اَن دیکھے دکھ اور ان کہے خیالات ایک دوسرے تک بغیر کسی رکاوٹ اور ذریعے کے پہنچا دیتے ہیں......سمیر ایک روز پہلے ہی جان گیا کہ آج کا دن میرے لئے بہت مشکل ہوگا اور ان بھاری لمحوں میں اس کا فون آنا......اور میرے ارادے کو بدلنا......اسے سب کچھ بہت پراسرار لگا۔

''محبت بہت پراسرار ہوتی ہے......پیاز کے مہین چھلکوں کی مانند پرت در پرت اسراروں سے مزین......ہر پرت خوبصورت، نازک اور جاذب نظر آتا ہے مگر اس کے کھلنے پر ایک اور پرت......ایک اور اسرار سے آشنائی ہوتی ہے۔محبت بہت عجیب کھیل ہے......جس میں جیت کر بھی ہار کی سی کیفیت ہوتی ہے اور ہار کر جیت کا لطف ملتا ہے''وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''ڈاکٹر صاحبہ......باہر آپ کا ڈرائیور کافی دیر سے انتظار کر رہا ہے''انٹر کام پر اسے کسی نے اطلاع دی اور وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆

زحل کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔وہ ہوش میں تھی اس کے پاس اس کی ماں اور ساس تھیں۔جب حرا راؤنڈ پر آئی تو اس کے آنے سے پہلے نرس نے سب لوگوں کو کمرے سے باہر بھیجا۔حرا کمرے میں داخل ہوئی......اور زحل کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

''کیسی ہیں آپ......؟''حرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......''زحل آہستہ آواز میں بولی۔

حرا اس کا چیک اپ کرنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب......کیا واقعی آپ میرے بچے کو نہیں بچا سکیں؟'' زل نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''نہیں......میں نے ہر ممکن کوشش کی......مگر ایک کو ہی بچایا جا سکتا تھا......آپ کو......یا......آپ کے بچے کو'' حرا نے جواب دیا۔

''تو......آپ اسے بچا لیتیں......وہ میرے شوہر کی محبت کی نشانی تھی......'' زل روتے ہوئے بولی۔

''آپ پریکٹیکل ہو کر سوچیں......بن ماں باپ اولاد کا جو حال ہوتا ہے......وہ شاید آپ نہیں جانتی......اور......آپ کے شوہر کی محبت کی نشانی وہ صرف آپ کے لئے ہوتا......اور کسی کے لئے نہیں......اس لئے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں......جو قدرت کو منظور ہوتا ہے......وہی ہوتا ہے'' حرا نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ زل اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے......حرا کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

''حوصلہ رکھیں......انسان کبھی جذبوں کی وجہ سے آزمایا جاتا ہے اور کبھی رشتوں کی وجہ سے......کبھی محبت، کٹھن راہ بن جاتی ہے اور کبھی خون کے رشتے وبال جان بن جاتے ہیں......پلیز آپ پریشان مت ہوں......ہر بات کے پیچھے ایک گہرا راز ہوتا ہے......'' حرا نے اسے محبت بھرے لہجے میں سمجھایا۔

اسی لمحے شہیر خوبصورت سا بوقے لے کر کمرے میں داخل ہوا......حرا کو زل کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ حرا نے ایک نظر اسے اور پھر بوقے کو دیکھا......اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''یہ......یہ......تم سے کیا کہہ رہی تھی؟'' شہیر نے جلدی سے بولا۔

''کون......؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ......حرا تھی......'' شہیر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''تمہاری بیوی......؟'' زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' شہیر آہستہ آواز میں بولا۔

زل بری طرح چونکی اور پھر خاموش ہو گئی۔

''تم کیسی ہو......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''تمہارے بے بی کا جان کر بہت افسوس ہوا'' شہیر نے کہا۔

''ڈاکٹر بتا رہی تھی کہ کسی ایک کو بچایا جا سکتا تھا......مجھے یا اسے......اور......اس نے مجھے بچا لیا'' زل کہہ کر خاموش ہو گئی اور شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔

شہیر اس سے یوں نظریں چرانے لگا جیسے اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا......سوائے خاموشی کے۔

☆

حرا......شہیر کو زل کے کمرے میں دیکھ کر بہت پریشان ہوگئی تھی......اسے پچھلے کئی ماہ سے شہیر کے بارے میں جو خوش فہمی ہوئی تھی...... اس کی وجہ وہ اب جان گئی تھی......اس کا دل کرچی کرچی ہونے لگا۔ان کے نام نہاد رشتے میں جو جان پیدا ہونے لگی تھی۔اب وہ نیم جان رشتہ پھر دم توڑنے کے قریب تھا......اسے بار بار شہیر کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔جب وہ بوتے پکڑے کمرے میں داخل ہوا تھا۔اس کے چہرے پر انجانی سی خوشی تھی۔ جو صرف حرا کو ہی نظر آئی۔

''میں کچھ بھی کرلوں......شہیر میرے لئے وہ جذبات کبھی بھی نہیں محسوس کرسکتا جو وہ زل کے لئے کرتا ہے'' حرا نے آہ بھر کر سوچا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

''اب مجھے فیصلہ کرنا ہوگا......اب شہیر اور زل کے درمیان مجھے نہیں آنا چاہیے......میں پہلے بھی اس کی زندگی میں ایکسٹرا تھی......اب بھی ہوں......اور شاید ہمیشہ رہوں گی۔اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔حرا نے سوچتے ہوئے اپنے سامان کی پیکنگ شروع کردی اور ہاسپٹل سے کچھ روز کی چھٹی لے لی......مسز تہمینہ کو اس نے فون کر کے بتادیا کہ وہ ایمرجنسی میں اپنے والدین کے پاس جارہی ہے......وہ بھی مزید کچھ نہ پوچھ سکیں۔کیا تم نے شہیر کو بتایا ہے؟مسز تہمینہ نے پوچھا۔

''ان کو بتانے یا نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' حرا نے کہا تو مسز تہمینہ خاموش ہوگئی۔

شہیر رات کو دیر سے گھر لوٹا تو حرا کمرے میں موجود نہیں تھی......اسے اس کا بیگ،گاڑی کی چابیاں،موبائل کچھ بھی نظر نہ آیا۔اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔رات کے بارہ بج رہے تھے۔وہ عموماً اس وقت آجاتی ہے......اگر نائٹ ڈیوٹی ہوتو وہ ملازمہ کے ذریعے اسے انفارم کردیتی تھی لیکن اب شہیر نے ملازمہ سے بھی پوچھا تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنا ایک بیگ لے کر گئی ہے۔شہیر نے مسز تہمینہ کو فون کر کے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایمرجنسی میں اپنے والدین کے پاس چلی گئی ہے......شہیر کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے......وہ صبح والے واقعہ پر غور کرنے لگا اور اسے یقین ہونے لگا کہ حرا......اس کے اور زل کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہے......اسی لئے وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے......شہیر کے دل میں اک عجیب سا احساس پیدا ہونے لگا......کسی غلطی کا احساس یا کسی جرم کا......یا کچھ اور......؟اسے سمجھ نہیں آرہا تھا......مگر اسے کمرہ بہت سونا اور خالی محسوس ہو رہا تھا......یا پھر وہ حرا کو اس کمرے میں دیکھنے کا عادی ہوچکا تھا......گو کہ اسے اس کی ذات اور اس کے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ کبھی بھی اس کے لئے اہم نہیں تھی......اس نے کبھی اسے کسی بات پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا تھا۔اور اگر وہ کسی بات پر خفا بھی ہوتی تو اس نے کبھی اس کی ناراضگی اور خوشی کی پرواہ نہیں کی تھی......اس نے کبھی اسے نہیں منایا تھا......کبھی خوش کرنے کے لئے کوئی جملہ نہیں کہا تھا......اس نے تو کبھی اس کے موبائل پر کوئی میسج یا مس کال نہیں بھیجی تھی......وہ ہے،تو ٹھیک ہے،نہیں......تو......نہ سہی اگر وہ اپنی مرضی سے جاتی تو شاید اسے کوئی خلش محسوس نہ ہوتی مگر اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حرا اس سے ناراض ہو کر گئی ہے......''اب اگر وہ چلی گئی ہے تو میں اسے جانے سے کیسے روک سکتا ہوں'' ......وہ اپنے دل کو تسلی دیتا......مگر......پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی اور احساس اس کے دل کو مضطرب کرنے لگتا اور وہ بے چین ہونے لگتا...... لیکن زل کا خیال آتے ہی وہ پرسکون ہونے لگتا......زل کے بارے میں وہ اب بہت پرامید ہونے لگا تھا۔اگر اس کا بچہ زندہ رہتا تو ممکن ہے اس کے

سسرال والے اس سے بچہ چھیننے کی دھمکی دے دیتے......اور زنل مجبور ہوکر شادی نہ کرتی......مگر......اب تو قدرت نے خود بخود اس کے لئے سارے راستے صاف کر دیئے تھے۔اب زنل کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی......اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے قدرت اس پر نظر کرم کر رہی ہے......اس کے لئے ساری رکاوٹیں دور کر رہی ہے......اب زنل اور اس کے درمیان تیسرا کوئی نہیں......نہ ارسلان......نہ حرا......نہ ارسلان کا بچہ......صرف زنل......اور......وہ......'' وہ مطمئن ہونے لگتا۔

زنل کی حالت قدرے بہتر ہوگئی تھی۔ہاسپٹل میں جتنے روز وہ رہی......حرا کی بجائے ڈاکٹر مہوش ڈیوٹی پر آتی رہی......اس نے ایک دو بار نرس سے پوچھا تو اسے یہی بتایا گیا کہ ڈاکٹر حرا چھٹی پر ہیں......اور شہر سے باہر گئی ہیں......زنل سن کر بے چین ہوگئی تھی......اور اس کے دل میں بھی عجیب سا احساس پیدا ہونے لگا تھا......کہ کہیں وہ شہیر اور اس کے بارے میں کچھ جان تو نہیں گئی......زنل نے اس سے قبل حرا کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔وہ اسے اپنے اور شہیر کے درمیان کبھی بھی اتنا اہم اور اس قابل نہ سمجھتی کہ اس کے بارے میں کچھ سوچتی یا شہیر سے ڈسکس کرتی......مگر......اب......وہ اچانک اتنی اہم ہوگئی تھی کہ زنل کے ذہن میں ہر وقت سمائی رہتی اور وہ اس کی وجہ سے شدید الجھن کا شکار رہتی۔

انسان بھی بہت عجیب ہے......جب کسی کو اہمیت نہیں دیتا تو اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا......اور جب اچانک کسی کو اہمیت دیتا ہے تو پھر تمام سوچوں پر وہی حاوی ہو جاتا ہے......زنل اس کی وجہ سے الجھ رہی تھی۔

جس روز ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوکر گھر آئی تو اسے ڈاکٹر حرا بہت یاد آرہی تھی......اسے حرا کے کہے ہوئے الفاظ بار بار یاد آرہے تھے ''پلیز آپ اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔ہر بات کے پیچھے گہرا راز ہوتا ہے'' زنل نے گہری سانس لی۔زنل ہاسپٹل سے اپنے سسرال چلی گئی تھی......وہ ارسلان اپنے بچے......اور حرا کی وجہ سے اپنے اندر جو خالی پن محسوس کر رہی تھی......ارسلان کے گھر جا کر وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے اضطراب سے نجات پانا چاہتی تھی......شہیر اس کی صحت یابی کا منتظر تھا......اور اس موقع کا جب وہ اس کے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کرے۔

شہیر جب بھی زنل کو فون کرتا......تو......اس موضوع پر بات کرتے کرتے رک جاتا......زنل بھی اس کے ادھورے جملوں اور ان کہے الفاظ کا مطلب سمجھ کر خاموش رہتی۔زنل نے تین چار ماہ کے بعد آرٹ اکیڈمی جانا شروع کر دیا تھا......اور......شہیر اسی بات کا منتظر تھا۔جب وہ آرٹ اکیڈمی جوائن کرے اور وہ اس سے کھل کر بات کرے۔ ''زنل......جو کچھ بھی ہوا......مجھے افسوس ہے......مگر ہمیں اب مستقبل کا بھی سوچنا ہے......'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا انسان کو وہی ملتا ہے......جو......وہ سوچتا ہے'' زنل نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان کی زندگی لمحوں میں بدل جاتی ہے......اور انسان کو کیا معلوم کہ اگلے لمحے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟'' زنل نے جواب دیا۔

''ان باتوں میں حقیقت ہے......مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ مستقبل کے لئے پلاننگ کرنا پڑتی ہے......کچھ بننے کے لئے بچپن سے ہی ذہن بنانا پڑتا ہے......زنل......پلیز......اب میں تم سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا......میں کب......ممی اور ڈیڈی سے بات کروں......تم جیسے کہو گی......میں

ویسے ہی کروں گا...... مگر اب مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہوتا'' شہیر جذباتی لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے...... مجھے کچھ سوچنے دو...... لیکن...... پلیز...... اب تم یہاں مت آیا کرو...... جیسے ہی حالات سازگار ہوتے ہیں...... میں اپنے والدین سے بات کر کے تمہیں انفارم کروں گی...... میں کچھ روز تک اپنے پیرنٹس کے ہاں شفٹ کر رہی ہوں'' زمل نے بتایا۔

''کیوں......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''میں بے بی کی ڈیتھ کے بعد یہاں ایزی فیل نہیں کرتی...... اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ممی پاپا کے پاس چلی جاؤں'' زمل نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو شہیر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں انتظار کروں گا...... مگر...... پلیز...... مجھے جلدی انفارم کرنا...... میں بہت اپ سیٹ ہوں'' شہیر نے اٹھتے ہوئے کہا...... تو...... زمل اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

☆

ممی اور ڈیڈی بے حد پریشان تھے جب شہیر گھر لوٹا تو ان کو افسردہ دیکھ کر چونک گیا...... انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اہم بات ہوئی ہے۔

''شہیر...... ادھر آؤ......'' ڈیڈی نے اسے اپنے پاس بلایا۔

شہیر ان کی طرف آیا اور دونوں کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

''حرا...... اور...... تمہارے درمیان کیا بات ہوئی ہے......؟ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے......؟'' ڈیڈی نے پوچھا۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی'' شہیر نے جواب دیا۔

''پھر...... ایسی کیا بات ہوئی ہے...... کہ...... وہ طلاق مانگ رہی ہے......'' ڈیڈی نے رک رک کر کہا تو شہیر نے ایک دم چونک کر انہیں دیکھا...... ممی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر وہ خاموش رہیں۔

''آپ سے کس نے کہا ہے......؟ کیا حرا نے......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... منصور کا فون آیا تھا...... اور...... اس نے کہا تھا کہ حرا کا یہی فیصلہ ہے...... وہ اب شہیر کے ساتھ نہیں رہ سکتی'' ممی غصے سے بولیں۔

''ٹھیک ہے...... اگر...... وہ نہیں رہنا چاہتی...... تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے...... میں اسے طلاق بھیج دوں گا'' شہیر قدرے پرسکون لہجے میں بولا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا...... اتنی اچھی لڑکی کو تم نجانے کس بات کی سزا دے رہے ہو...... اس نے ہر مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دیا...... تمہاری بیماری میں تمہاری بے حد خدمت کی...... اور...... اب تم یہ بات کر رہے ہو...... شہیر تم نے ایک بار بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا'' ممی پھر غصے سے بولیں۔

''ممی...... اگر وہ میرے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتی تو میں کیسے اسے مجبور کر سکتا ہوں'' شہیر نے کہا۔

''شہیر...... وہ...... تمہاری بیوی ہے...... اور میاں بیوی میں اکثر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشتہ ہی ختم کر دیا جائے...... بہتر یہی ہے کہ تم حرا کو منا کر لے آؤ'' ڈیڈی نے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا......'' شہیر نے دوٹوک لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ممی اور ڈیڈی حیران ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

سمیر کو جب سے حرا کے فیصلے کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ وہ بار بار حرا کو فون کر رہا تھا مگر وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ سمیر نے تنگ آ کر تیمور ماموں کے موبائل پر فون کیا اور ان سے کہا کہ وہ حرا سے اس کی بات کرائیں...... حرا ان کی بات سن کر چونکی اور موبائل پکڑ کر بات کرنے لگی۔ منصور ماموں کمرے سے نکل گئے۔

''کہو...... کیا بات ہے؟'' حرا نے تنگ کر پوچھا۔

''تم گھر کیوں چھوڑ آئی ہو......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کون سا گھر...... اور...... کس کا......؟'' حرا نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''تمہارا گھر...... اور...... کس کا......؟'' سمیر نے کہا۔

''کس ناتے سے...... وہ میرا گھر ہے؟'' حرا نے پوچھا۔

''وہ تمہارے شوہر کا گھر ہے...... اس ناتے سے'' شہیر نے کہا۔

''سمیر...... وہ گھر...... اس ناتے کی طرح بہت کمزور ہے...... نہ وہ گھر مجھے پناہ دے سکتا ہے اور نہ شوہر'' حرا نے نم لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم طلاق مانگ رہی ہو؟'' سمیر نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... اس لئے کہ اب مزید وہاں رہ کر میں اپنے آپ کو تماشا نہیں بنا سکتی...... شہیر بہت جلد زل سے شادی کر لے گا......'' حرا نے کہا تو سمیر چونک گیا۔

''یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ زل اس سے کیسے شادی کر سکتی ہے...... شاید وہ......'' سمیر الجھتے ہوئے بولا۔

''اس کے شوہر کا قتل ہو گیا ہے...... اور...... اب...... وہ......'' حرا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''حرا...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے...... تمہیں کسی نے غلط بتایا ہوگا...... پلیز کسی پر یقین مت کرو'' سمیر نے اسے سمجھایا۔

''میری آنکھیں...... مجھے تو دھوکہ نہیں دے سکتیں...... سمیر اب کچھ کہنا سننا بیکار ہے...... رشتے تبھی قائم رہ سکتے ہیں جب ہم دل سے انہیں قائم رکھنا چاہیں...... جب ہم...... انہیں اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھنے لگتے ہیں...... تب وہ ہمیں صرف کھینچتے ہیں...... اور...... پھر تنگ آ کر ٹوٹ جاتے ہیں'' حرا افسردگی سے بولی۔

''پلیز...... کوئی ایسا اسٹیپ مت لینا جو......''

''جو...... کیا......؟'' حرا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جو......ہمیں مزید آزمائش میں ڈال دے" سمیر نے آہ بھر کر کہا۔

حرا نے فون بند کر دیا......اور......رونے لگی......

"میں......کس دوراہے پر کھڑی ہو گئی ہوں......سمیر مجھے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے اور شہیر نے مجھے یوں بے بس اور مجبور کر دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

☆

حرا کی طرف سے شہیر کو قانونی نوٹس کورٹ کی جانب سے بھجوا دیا گیا تھا......مسز فاخر اور فاخر حسین تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے......مسز فاخر رونا شروع ہو گئیں......شہیر گھر پر نہیں تھا......انہوں نے فون کر کے شہیر کو گھر بلایا اور اسے نوٹس دکھایا۔

"اسے کورٹ میں جانے کی کیا ضرورت تھی......مجھے فون کرتی میں خود اسے طلاق بھیج دیتا......" شہیر لاپروائی سے بولا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو......؟ اور تمہیں اپنے گھر ٹوٹنے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا" مسز فاخر نے کہا۔

"جو گھر بسا ہی نہیں......تو اس کے ٹوٹنے کا کیا دکھ ہوگا......اور ویسے بھی میں زل سے شادی کرنے والا ہوں" اس نے دوٹوک لہجے میں بتایا تو دونوں چونک گئے۔

"کون زل......؟" مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

"میری کلاس فیلو......میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں" شہیر نے بتایا اور زل کے نام پر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اگر محبت کرتے تھے تو پہلے ہی اس سے شادی کر لیتے" مسز فاخر خفگی سے بولیں۔

"تب میں نے اس سے شادی کیوں نہیں کی......؟ بات یہ نہیں......بات اب واضح اور کلیئر ہے......کہ میں اس سے جلد شادی کرنے والا ہوں......" شہیر نے قدرے ٹھوس لہجے میں الفاظ چبا چبا کر کہا۔

"تم ابھی حرا کو طلاق نہیں بھیجو گے......پہلے میں زل سے ملنا چاہوں گی" مسز فاخر نے کہا۔

"تاکہ آپ اسے حرا کے بارے میں بتائیں......اور......"

"نہیں......میں تمہاری موجودگی میں ہی یہ دیکھنا چاہوں گی......کہ وہ کتنی شدت سے تمہیں محبت کرتی ہے......یا پھر تم خواہ مخواہ اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو" مسز فاخر نے معنی خیز انداز میں کہا تو شہیر خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے میں زل سے بات کر کے آپ کو انفارم کرتا ہوں" شہیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا......اور زل کا نمبر ملانے لگا۔ زل کا موبائل آف تھا۔ وہ بار بار نمبر ملا کر تھک گیا تھا مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

"زل فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہی......کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہو......" شہیر نے پریشانی سے سوچا۔

رات بھر بھی وہ اس کا نمبر ٹرائی کرتا رہا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اگلے روز اس نے اٹھتے ہی اسے فون کیا تو اس کا نمبر مل گیا۔

''شکر ہے...... تمہارا نمبر مل گیا...... تم کہاں چلی گئی تھی...... میں کتنا پریشان ہو رہا تھا...... تم سوچ بھی نہیں سکتی'' شہیر بہت بے صبری سے بولا۔

''کیوں...... ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟'' زمل نے پوچھا۔

''زمل...... ممی...... تم سے ملنا چاہتی ہیں......'' شہیر نے بتایا۔

''کیوں......؟'' زمل نے حیرت سے پوچھا۔

''یونہی...... مگر آج...... یا کل......'' شہیر نے بتایا۔

''نہیں...... ابھی ممکن نہیں...... میں دو دن بعد تمہیں بتاؤں گی......'' زمل نے کہا۔

''او کے...... میں انتظار کروں گا'' شہیر نے کہا اور فون رکھ دیا۔

''ممی...... زمل دو دن بعد انفارم کرے گی'' شہیر نے مسز فاخر کو بتایا۔

''کیوں......؟ کیا وہ بزی ہے؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... ہو بھی سکتی ہے'' شہیر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... جب اس کا فون آئے تو مجھے بتا دینا'' ممی نے کہا اور شہیر 'او کے' کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق ۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ''حال'' سے غیر مطمئن ہونے اور ''شکر'' کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

شہیر کے لئے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہوگیا تھا......ایک ایک لمحہ، ایک ایک ساعت......اس پر یوں بھاری ہورہی تھی جیسے مجرم عدالت کے کٹہرے میں کھڑا جج کے فیصلے کا منتظر ہو......اور گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی ہم آواز ہوکر بے قراری سے اذن کی منتظر ہوں۔ وہ بھی دل کی گہرائیوں سے گڑگڑا کر زمل کے حصول کے لئے دعائیں کرتا......کبھی پرامید ہوکر مستقبل کے خواب دیکھتا، کبھی بے چین ہوکر موبائل کی طرف بڑھتا مگر پھر رک جاتا......دوسرا دن بھی انتہائی بے چینی کی نذر ہوگیا......ہر آنے والے لمحے کے بارے میں وہ پرامید ہوتا کہ ابھی کوئی پیغام آنے والا ہے......ابھی زمل فون کرے گی......مگر دوسری رات بھی گزر گئی......زمل کا کوئی فون نہ آیا اور منتظر لمحے کسی قیامت سے کم ثابت نہ ہورہے تھے۔

زمل نے فون کیوں نہیں کیا؟

کیا زمل مصروف ہے......؟

کیا اس کی طبیعت ٹھیک ہے......؟

ان تین سوالوں کے علاوہ کوئی اور سوال اس کے ذہن میں نہ آتا۔ وہ کسی اور بات کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اگلی صبح اس کے اٹھنے سے پہلے کوریئر مین ایک TCS خط اسے دے کر گیا۔ شہیر اس وقت سو رہا تھا مگر نیند میں بھی وہ زمل کا ہی منتظر تھا......اس نے اپنے کمرے میں جا کر خط کھولا اور بے صبری سے پڑھنے لگا۔

"شہیر......مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں اس لئے خط لکھ رہی ہوں......پلیز......جذباتی مت ہونا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا......میں نے پچھلی بار کی طرح اس بار بھی بہت کوشش کی کہ فیصلہ تمہارے حق میں کروں مگر قدرت نے انسان کو 'قسمت' کے ہاتھوں بڑا مجبور و بے بس کر دیا ہے......اور......بعض اوقات چاہتے ہوئے بھی انسان بہت سی مصلحتوں اور مجبوریوں کی خاطر وہ فیصلہ نہیں کر پاتا جس کی وہ آرزو کرتا ہے......پچھلی بار میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی......میرا دل تمہیں قبول نہیں کرتا تھا......اب دل نے قبول کیا......تو......ایک اور بہت بڑی مصلحت آڑے آگئی......میں نہیں جانتی کہ ہر بات میں خدا کا کیا راز اور کیا مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جو انسان کو اس وقت تو سمجھ میں نہیں آتی مگر بہت وقت گزرنے کے بعد اس کو تھوڑی بہت سمجھ آتی ہے جب سے میں حرا سے ملی ہوں......میں بہت بے چین ہوگئی ہوں......وہ بہت اچھی ہے مگر تمہیں اس کی اچھائی میری وجہ سے نظر نہیں آرہی......تم اس میں میرا عکس دیکھتے ہو اور بے قرار ہو جاتے ہو......شہیر......اس سے مل کر میں بہت پریشان ہوگئی ہوں اور سوچتی ہوں......کہ محبت ایسی خود غرض تو نہیں ہوتی جو کسی کا گھر اجاڑ کر اپنا بسانے کی کوشش کرے......محبت تو وفا، ایثار اور قربانی کا نام ہے......اور جو لوگ یہ کچھ نہیں کر سکتے وہ محبت نہیں کرتے......حرا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے......محبت کا فلسفہ اس کے راز اور اس کے داؤ پیچ سمجھ سے باہر ہیں۔ میں اپنے کزن سے منسوب تھی......ہمارا نکاح ہو چکا تھا مگر اس کو کاغذات کے حصول کے لئے کینیڈا میں شادی کرنا پڑی۔ اس بات کو میرے گھر والوں نے برا سمجھا اور مجھے طلاق ہوگئی......جس روز تم میرا پورٹریٹ بنا رہے تھے......میں اسی دکھ میں رو رہی تھی......کیونکہ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے منسوب تھے ہم نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کے بہت خواب اور منصوبے بنائے تھے......مگر اچانک سب کچھ بکھر گیا......میں ایسی ٹوٹی اور بکھری کہ مجھ سے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ اس مشکل وقت میں ارسلان نے میرا ساتھ دیا۔ اس نے تم سے پہلے مجھے شادی

کی آفر کی...... اور...... یہ آفر محبت کی وجہ سے نہیں تھی میرا دکھ شیئر کرنے کی وجہ سے تھی...... وہ بہت حساس اور اچھا انسان تھا...... مجھے یوں محسوس ہوا کہ زندگی کے ساتھی میں ارسلان جیسی خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ میرا دل اس کا معترف ہو گیا اور جب تم نے 'اظہار محبت' کیا تو تمہاری محبت ارسلان کی دلجوئی کے سامنے ہار گئی...... اس نے میرے ٹوٹے دل اور کرچی کرچی وجود کو سہارا دیا...... میں اسے کیسے نظر انداز کر سکتی تھی۔

ارسلان کو میں کبھی بھی نہیں بھول پاؤں گی...... وہ ایسا انسان تھا جس پر انسانیت حقیقی معنوں میں فخر کرتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ...... میں ساری زندگی ارسلان کی یادوں کے سنگ گزار دوں گی مگر اپنے لئے تمہاری شدید محبت کو دیکھ کر مجھے اپنی سوچ بدلنی پڑی...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو...... تمہارے دل کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا...... مگر قدرت کا نظام بہت عجیب ہے...... وہ انسان کو خود مشاہدہ کروا کے پھر اس سے فیصلہ کرواتا ہے...... میں ایکسیڈنٹ کے بعد اس ہاسپٹل میں لائی گئی جہاں حرا ڈاکٹر تھی...... اور حرا کے پاس اختیار تھا...... کہ...... یا وہ مجھے بچاتی یا...... میرے بچے کو...... مگر اس نے مجھے بچایا...... شہیر...... تم ہی بتاؤ...... جس مسیحا نے میری جان بچائی...... میں اس کی زندگی کیسے اذیت میں ڈال دیتی...... شہیر...... جب تم بوقے لے کر میرے کمرے میں آئے تھے تو حرا کے چہرے پر یاسیت اور آنکھوں میں ایسی ویرانی اتر آئی تھی جس نے مجھے اس کے دل کی ساری حالت بتا دی...... ہر انسان دوسرے کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت پڑھ سکتا ہے...... قدرت نے نجانے دل میں کیا چھپا رکھا ہے کہ اس کے راز تو عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں مگر کبھی ختم نہیں ہوتے...... ہر لمحہ...... ہر پل...... بدلتا دل...... انسان کو کیسی سوچوں اور جذبوں سے سرشار کرتا ہے...... کوئی نہیں جانتا...... ہر انسان کے دل کی اپنی کتھا ہے مگر ہر دل محبت کرتا ہے اور نفرت بھی...... بغض...... کینہ اور حسد بھی مگر...... جب ان سارے جذبوں پر محبت حاوی ہوتی ہے تو وہ دل خدا کا گھر بن جاتا ہے...... تمہاری بیوی کا دل خدا کا گھر ہے...... اس کے تقدس کو پامال نہ کرو...... اس کو وہ عزت دو...... جس کی وہ حقدار ہے...... میں اس شش و پنج میں تھی کہ کیا فیصلہ کروں...... مگر خدا نے 'نیت' کو بھی کہیں دل کے کسی خانے میں چھپا کر رکھا ہے...... یہی نیت جب بے لوث محبت سے ہوتی ہے تو اس محبت کے در و دیوار روشن ہونے لگتے ہیں۔ اس کے اندر دریچے کھلنے لگتے ہیں...... اس محبت کے سہارے انسان آہستہ آہستہ سفر کرتا ہوا اس خدا کی محبت پا لیتا ہے...... جو حقیقت میں ''دیارِ محبت'' ہے۔ پچھلے چند دن جس اذیت میں گزرے تم ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے...... ایک ایک لمحہ میرے لئے کسی اذیت سے کم نہیں تھا...... شہیر...... سچ مانو...... محبت بہت بڑی آزمائش ہے...... اور...... وہ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں جو اس آزمائش سے سرخرو ہو کر گزرتے ہیں۔ اچانک میرا کزن کینیڈا سے آ گیا اور وہ ہم سے ملنے آیا...... اس کو ارسلان اور میرے بچے کے بارے میں جان کر افسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے کیے پر نادم بھی تھا اور سب گھر والوں کے سامنے اس نے پھر مجھے پرپوز کیا۔ میرے سامنے دو راستے تھے...... ایک راستہ تمہاری طرف جاتا تھا...... مگر جس پر حرا کھڑی تھی اور مجھے حرا کو روند کر تم تک پہنچنا تھا۔ دوسرے راستے پر میرا کزن تھا جو تنہا تھا اور اپنی کینیڈین بیوی کو طلاق دے چکا تھا...... اور ہم دونوں کے درمیان ہمارا بچپن اور ہماری محبت تھی...... مجھے اس کی طرف لوٹنا زیادہ آسان لگا...... میں حرا کو روند کر نہیں گزر سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ خدا کا پہلے ہم دونوں کو جدا کرنے میں کیا راز تھا؟ پھر ارسلان سے شادی کرانے میں کیا حکمت تھی اور پھر ارسلان کے بعد پھر اس شخص سے ملانے میں کیا اسرار ہے...... یہ صرف وہی جانتا ہے ہم تو حیران ہو کر قدرت کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں...... جو ہمیں لمحہ بہ لمحہ آزماتا

رہتا ہے...... شہیر...... قدرت کو ہم دونوں کا ساتھ منظور نہیں...... یہی اس کا فیصلہ ہے اور ہمیں اس فیصلے کو ماننا ہوگا...... جب تمہیں یہ خط ملے گا...... میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی...... یہ مت پوچھنا کہاں......؟

تم حرا کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے کی کوشش کرنا...... یہی سوچ کر کہ محبت جہاں اذیت دیتی ہے وہاں سکون بھی دیتی ہے...... حرا کی محبت تمہیں سکون دے گی...... مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔ ہو سکے تو مجھے سمجھ کر معاف کر دینا کہ میں ہمیشہ تمہارے لئے ذہنی اذیت کا باعث بنی۔

فقط زمل

شہیر خط پڑھ کر زاروقطار رونے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ زمل اس سے دور چلی گئی ہے...... زمل اس کو پھر چھوڑ کر چلی گئی ہے...... اس کی محبت کا کاسہ پھر خالی رہ گیا ہے...... اس نے زمل کی محبت کو پانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے تھے...... اس نے ارسلان کو قتل کرایا کہ جب تک ارسلان زندہ رہے گا، زمل اسے نہیں مل پائے گی۔ اس کی محبت اتنی خودغرض ہوگئی کہ اسے ارسلان جیسے عظیم شخص کی اچھائیاں نظر ہی نہ آئیں...... وہ تو اسے رقیب کی صورت میں ہی نظر آتا رہا۔ اس نے اس کو قتل کرانے کے لئے کتنی بھاری رقم ادا کی تھی یہ وہی جانتا تھا...... کسی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ارسلان کو کس نے قتل کر دیا...... سوائے اس کے...... کیونکہ وہی اصل مجرم تھا، وہ اس بات کا پکا یقین کر بیٹھا تھا کہ ارسلان کے قتل کے بعد زمل، اس کی ہوگی مگر وہ یکسر بھول گیا کہ انسان کی تقدیر کو بدلنا اور اس پر حاوی ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں...... قدرت نے اسے ایسی شکست دی تھی کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر آ گیا تھا...... جس رازداری سے اس نے ارسلان کو قتل کرایا تھا...... ویسی ہی خاموشی اور رازداری سے قدرت نے زمل کو پھر اس سے چھینا تھا...... اسے ارسلان ہر طرف نظر آ رہا تھا...... کبھی روتا ہوا...... کبھی مسکراتا ہوا...... پہلے وہ صرف زمل کی جدائی کا صدمہ سینے میں چھپائے پھرتا تھا اب ارسلان کے قتل کا راز بھی اسے چھپانا تھا...... وہ دوہری اذیت میں مبتلا تھا اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا...... ممی اور ڈیڈی گھر پر نہیں تھے...... وہ ڈیڈی کے کمرے میں گیا اور ان کے خفیہ خانے کو چیک کیا۔ آج وہاں کوئی وہسکی، شیمپئن نہیں تھی...... وہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گیا اور شیمپئن واڈ کا اتنی زیادہ مقدار میں پی کہ اسے اپنی ہوش نہ رہی۔

کئی ماہ سے جس بیماری کا خطرہ ٹل گیا تھا...... اس بیماری نے پوری قوت سے اس پر حملہ کر دیا۔

☆

''حرا بیٹے...... جلدی آؤ...... تہمینہ کا فون ہے...... وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے'' منصور علی نے فون کا ریسیور حرا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ حرا کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہوئے مگر اگلے لمحے اس نے اپنے آپ کو قدرے نارمل کیا۔

''جی آنٹی......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''بیٹا...... جلدی گھر آ جاؤ...... شہیر کو شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے...... وہ ہاسپٹل میں ہے اس کی حالت بہت خراب ہے...... معلوم نہیں کیا ہوگا......؟ مسز تہمینہ روتے ہوئے بولیں۔

''کب...... یہ کب ہوا...... اور...... کیسے......؟'' حرا ایک دم پریشان ہو کر بولی۔

''کل رات کو ہمیں خبر ملی...... ہم لوگ گھر پر نہیں تھے اور...... وہ......؟ بس تم جلدی آ جاؤ، میں بہت پریشان ہوں...... شہیر کو تمہاری ضرورت ہے'' مسز تہمینہ نے بے بسی سے کہا تو حرا سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو......؟'' منصور علی نے حرا سے پوچھا۔

''شہیر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے...... اور؟'' حرا نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''تو...... کیا تم جاؤ گی......؟'' حرا کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے جواب دیا۔

''حرا...... تمہارا دماغ ٹھیک ہے...... ایک طرف تم کورٹ کے ذریعے اس سے طلاق مانگ رہی ہو...... اور...... دوسری جانب تم پھر وہاں جانا چاہتی ہو......'' اس کی ماں نے غصے سے کہا۔

''مما...... آنٹی بہت پریشان ہیں...... شہیر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے'' حرا نے آہ بھر کر کہا تو سب گھر والے خاموش ہو گئے۔

حرا شام تک ہاسپٹل پہنچ گئی...... شہیر icu میں تھا۔

''تھینک یو بیٹا...... کہ...... تم...... آ گئیں'' مسز فاخر نے اسے ملتے ہوئے کہا۔

''اب کیسی طبیعت ہے......؟'' حرا نے پوچھا۔

''بہت خطرناک ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ڈاکٹرز بہت پریشان ہیں......'' مسز فاخرہ سے بتاتے ہوئے رونا شروع ہو گئیں۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا......؟ کیا گھر پر کوئی جھگڑا ہوا تھا؟'' حرا نے پوچھا۔

''نہیں......'' مسز فاخر خاموش ہو گئیں جیسے وہ اسے بتانا نہ چاہ رہی ہوں...... حرا نے بھی مزید کریدنا پسند نہ کیا۔

''سمیر آ رہا ہے...... میں اس کے بغیر اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی......'' مسز فاخر نے بتایا۔

''کب......؟'' حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''صبح تک یہاں پہنچے گا......''

حرا ان کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

☆

مسلسل دو راتیں جاگنے سے حرا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ شہیر کی طبیعت اب قدرے سنبھلی تھی...... تو مسز فاخر نے اسے گھر بھیج دیا۔ اپنے کمرے میں گئی تو ہر شے یونہی بے ترتیب پڑی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ اٹھایا اور بیڈ پر لیٹ گئی...... لیٹتے ہی سو گئی۔ آنکھ کھلی تو طبیعت کافی بہتر تھی...... نہا دھو کر فریش ہوئی اور دوبارہ ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اس نے بیڈ روم کی دراز سے اپنی فون کی ڈائری نکالنا چاہی تو وہاں زل کا خط پڑا تھا...... وہ چونک گئی اور اسے پڑھنے لگی...... اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا...... خط پڑھ کر وہ پریشان

بھی ہوگئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''تو شہیر اس کی وجہ سے بیمار ہوا ہے...... اس بار اسے زل نہیں ملی...... اور اس کی وجہ میں بنی ہوں...... شہیر مجھے قصوروار سمجھتا ہوگا'' حرا کا دل پریشان ہونے لگا۔

اس کا موبائل بجنے لگا...... مسز فاخر کا فون تھا...... وہ اسے ہاسپٹل میں کچھ ضروری چیزیں لانے کو کہہ رہی تھیں۔ وہ سمیر کے ساتھ واپس چلی گئی۔ سمیر جب سے آیا تھا، مسلسل ہاسپٹل میں ان کے ساتھ تھا...... ڈاکٹروں کے ساتھ ساری ڈسکشنز بھی وہی کرتا...... ڈیڈی آتے اور چلے جاتے...... ممی، حرا اور سمیر ہر وقت ہاسپٹل میں رہتے۔ حرا گاڑی میں بیٹھی تو بہت پریشان تھی۔ اس کے ذہن میں زل کے لکھے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

''میرے سامنے دو راستے تھے...... ایک تمہاری طرف جاتا تھا...... مگر اس پر حرا کھڑی تھی اور مجھے اس کو روند کر تم تک پہنچنا تھا...... میں حرا کو نہیں روند سکتی''

زل کے الفاظ مسلسل اس کے تعاقب میں تھے...... اور وہ ان سے فرار چاہتی تھی۔

''کیا بات ہے......؟ تم اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' سمیر نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''کیا مجھ سے ناراض ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''نہیں''

''بتانا نہیں چاہتی؟'' شہیر نے پوچھا۔

حرا خاموش ہوگئی اور اسے کوئی جواب نہ دیا، سمیر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر خاموش ہوگیا۔

حرا کو خوف پیدا ہوگیا تھا کہ شہیر اسے دیکھ کر کہیں ہائپر نہ ہو جائے اور اسے اپنی بیماری اور ساری اذیتوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی...... وہ کئی روز بعد روم میں شفٹ ہوا تھا...... مسلسل خاموش اور سب کی طرف یوں دیکھتا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو...... مگر کہہ نہ پا رہا ہو...... اس نے حرا کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا...... حرا کو اس کی نظروں سے خوف محسوس ہونے لگا...... اسے لگا وہ اس کے ان گنت سوالوں کا کوئی جواب نہ دے پائے گی...... کافی دیر دیکھنے کے بعد اس نے منہ موڑ لیا...... حرا پریشان ہوگئی۔ سمیر اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آیا...... مگر وہ اس کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیتا۔

''شہیر سب سے کچھ خفا خفا لگتا ہے'' سمیر نے علیحدگی میں حرا اور ممی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... جھگڑا تو کسی سے نہیں ہوا'' ممی نے بتایا سب لوگ پھر خاموش ہوگئے۔

☆

شہیر کی حالت قدرے بہتر ہوگئی تھی...... کچھ روز بعد وہ گھر شفٹ ہوگیا تھا۔ حرا اس کا بہت زیادہ خیال رکھ رہی تھی...... وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ شہیر ٹھیک ہو کر گھر شفٹ ہوگا تو وہ والدین کے پاس گھر چلی جائے گی مگر جب سے اس نے زل کا خط پڑھا تھا اس نے اپنا فیصلہ بدل لیا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی اس بربادی کی ذمہ دار وہ ہے اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا...... وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی...... شہیر بھی دوائیں کھا کر سو رہا تھا جب وہ بھی بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھی اور وہیں سو گئی۔

اچانک اسے عجیب سی آواز سنائی دی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... اور ادھر ادھر دیکھنے لگی...... شہیر صوفے پر گرا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا...... وہ بری طرح رو رہا تھا...... حرا گھبرا گئی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کر رہے ہیں؟'' حرا نے خفگی سے کہا۔

''میں جینا نہیں چاہتا......'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''اس لئے کہ زل چلی گئی ہے......'' حرا نے پوچھا۔

شہیر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش ہوگیا۔

''کیا...... آپ کی زندگی میں صرف زل ہے...... اور کوئی نہیں...... سمیر...... ممی اور ڈیڈی'' حرا نے پوچھا۔

تو شہیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''زل...... تو...... ارسلان کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہے...... اس لئے کہ وہ جینا چاہتی ہے...... شہیر انسان تب تک زندہ رہتا ہے...... جب تک خدا چاہے...... انسان مرنے کی لاکھ کوشش کرے...... مگر وہ مر نہیں سکتا...... جب تک خدا نہ چاہے...... پلیز پازیٹو ہو کر سوچیں...... زل نہ تو آپ کی زندگی ہے اور نہ ہی آپ کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے...... جب وہ آپ کے بغیر زندہ ہے تو آپ کو بھی اس کے بغیر زندہ رہنا ہے...... اپنے اردگرد کے لوگوں کے لئے...... جو آپ سے محبت کرتے ہیں...... اور...... آپ کو زندہ، صحت منداور خوش دیکھنا چاہتے ہیں'' حرا نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''اسی لئے تو میں مرنا چاہتا ہوں...... میرا بیمار وجود ان کے لئے اذیت بنتا جا رہا ہے'' شہیر نے نم آنکھوں سے کہا۔

''اگر آپ جیسی سوچ ہر بیمار شخص کی ہو جائے...... تو...... پھر کوئی بیمار ٹھیک نہ ہو...... شہیر آپ کو ٹھیک ہونا ہے...... اپنی will power کو مضبوط بنائیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں......'' حرا نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ایک بیمار شخص کے ساتھ کہاں تک چل پاؤ گی...... پلیز...... تم اپنی زندگی کے بارے میں سوچو...... تم نے divorce مانگی تھی...... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اس اذیت بھری زندگی سے دور چلی جاؤ...... اپنے مستقبل اور اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچو...... میں تمہیں کچھ نہیں دے سکا...... اور...... نہ ہی دے پاؤں گا......'' شہیر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں نے آپ سے کبھی کچھ مانگا ہے......؟'' حرا نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''بے فکر رہیے......اب بھی کچھ نہیں مانگوں گی......محبت بھی نہیں'' حرا نے آہ بھر کر معنی خیز انداز میں کہا اور شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔ شہیر کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے......جیسے اچانک کوئی کسی سے اس کی سب سے قیمتی چیز مانگے......اور دینے والا نہ اسے دینا چاہے اور نہ ہی انکار کرنا چاہے......سوال سن کر شش و پنج میں پڑ جائے۔ حرا اس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتی رہی اور وہ نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگا...... حرا اس سے کچھ سننے کی توقع کر رہی تھی......مگر وہ کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔

حرا نے گہری سانس لی......اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے کمرے سے باہر جانے لگی۔

''حرا............'' شہیر نے بمشکل کہا۔

حرا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''آئی......ایم......سوری......شہیر اس کے قریب آکر بولا اور نظریں جھکا لیں۔ شہیر نے بمشکل اپنے آنسو روکے مگر آنسو بہت کوشش کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے نکل پڑے۔ شہیر ہماری زندگیوں اور قسمتوں کے فیصلے اوپر ہوتے ہیں......اور ہمیں ان فیصلوں کو ماننا پڑتا ہے......ہم چاہیں یا نہ چاہیں......'' حرا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نم آنکھوں سے کہا تو شہیر اس کی جانب دیکھ کر سسکنے لگا اور حرا کو اپنے گلے کے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بھی شدت سے رونے لگی۔ آج وہ حرا کو پہلی بار محسوس کر رہا تھا۔ آج حرا اور اس کے درمیان زل نہیں تھی۔ صرف وہ دونوں تھے......اور دونوں ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں سن رہے تھے ان کے دلوں کا غبار آنسوؤں کی صورت میں خارج ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کو پانے میں انہیں بہت کٹھن سفر طے کرنا پڑا تھا۔

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول......مقید خاک......سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا......یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار رہا تھا......یوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا......مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاکی میں مقید تھی......شیلندر رائے ہریجہ:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی......مہر جی:- پرکالۂ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی......ایکشن، سسپنس اور تھرل کا ایک نہ رکنے والا طوفان......

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آرہا ہے، جسے ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

(۱۸)

نذیر حسین صبح سویرے ہاسپٹل میں ڈاکٹر دانش کے کمرے کے سامنے بنچ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ دو روز سے ڈاکٹر دانش کی تلاش میں کئی ہاسپٹلز میں اخبار پکڑے مارا مارا پھر تا رہا تھا۔ وہ رات کو بہت دیر سے مطلوبہ ہاسپٹل میں پہنچا مگر سکیورٹی گارڈ نے اسے گھسنے نہ دیا اور صبح آنے کو کہا۔ وہ ساری رات ہاسپٹل کے باہر لان میں بیٹھا رہا اور صبح سویرے اندر داخل ہوا۔ خاکروب ابھی صفائیاں کر رہے تھے اور اسے بار بار بنچ سے اٹھاتے۔ کبھی وہ ایک بنچ سے اٹھ کر دوسرے پر بیٹھتا اور کبھی زمین پر بیٹھ جاتا۔ اسے کئی باتوں پر غصہ آ رہا تھا مگر بیٹے کی محبت اور سب سے زیادہ زینب کی پر امید دعاؤں کی خاطر آنا پڑا تھا۔ زینب کی سفید بوڑھی آنکھیں صرف ایک ہی امید سے روشن تھیں کہ اس کا بیٹا کب اس سے آ کر ملے گا۔ زینب نے کس طرح رو رو کر نذیر حسین کو منایا تھا کہ وہ پچھلی ساری تلخ باتوں کو بھول جائے اور بیٹے کو منا کر گھر لے آئے۔ وہ ضرور آ جائے گا...... اور اس کی یقین دہانی پر نذیر حسین اسے دوسرے شہر ڈھونڈنے آ گیا تھا۔ بے شمار وسوسوں اور خدشات کے علاوہ اس کے اندر ایسی امید بھی تھی جو اسے ہمت نہ ہارنے دے رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن اسے امید تھی کہ جیسے ہی اس کا بیٹا اسے گلے ملے گا اس کی ساری تھکن اور بھوک مٹ جائے گی۔ وہ کیسے اسے ملے گا......؟ اسے دیکھ کر کیا کہے گا......؟ کیسے اسے بتائے گا کہ اس کی ماں اس کی جدائی میں کس قدر بے تاب اور بیمار ہو گئی ہے۔ اتنی بہت سی باتوں کے خود ہی جوابات دے کر وہ مسکرانے لگتا۔ اس کے اندر امید اور خوشی کے دیئے اور روشن ہونے لگتے۔ وہ گھر سے دھلا ہوا سفید جوڑا پہن کر نکلا تھا مگر دو روز سے وہ جگہ جگہ خوار ہو رہا تھا اور اس کا سفید جوڑا گندا ہو گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے کی ملگجی رنگت سیاہ ہو رہی تھی۔ تھکن کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے ایک رومال میں اخبار کو اچھی طرح لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ بار بار کاؤنٹر پر جا کر ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھتا کہ ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے......؟

''کون ڈاکٹر دانش......؟'' ریسپشنسٹ پوچھتی تو وہ سوچ میں پڑ جاتا۔

''ہاں......'' وہ جلدی سے بوکھلا کر کہتا۔

''وہ بہت دیر سے آتے ہیں...... انہوں نے صرف چند مریض چیک کرنے ہوتے ہیں...... اور...... آپ......؟'' ریسپشنسٹ لڑکی نے حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''کیا آپ ان کی فیس دے سکتے ہیں...... ان کی فیس بہت زیادہ ہے...... اور غریب لوگوں کا وہ مفت علاج نہیں کرتے'' لڑکی نے رک رک کر کہا۔

''میں......میں......مریض نہیں ہوں......مجھے ان سے ذاتی کام ہے'' نذیر حسین نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ٹھیک ہے آپ انتظار کریں ،لڑکی نے کہا تو نذیر حسین مایوسی سے بینچ پر بیٹھ گیا۔

''اس نے تو ہمارا رکھا ہوا نام بھی بدل لیا ہے......اسے تو ہم سب سے نفرت تھی......نجانے کیوں اس کے دل میں ہمارے لئے اتنی نفرت بھر گئی۔اتنی نفرت تو ہم سے چھوٹو، نے بھی نہیں کی جس کو ہم ڈھنگ سے پال نہیں سکے۔زبیدہ نے اپنی ساری محبت اس پر نچھاور کر دی......خود نہ کھایا اور اسے کھلایا......رات رات بھر اس کی خاطر جاگتی رہتی تھی مگر اس نے تو زبیدہ کی محبت کو بھی اہمیت نہ دی......ہوسکتا ہے اب وہ بدل گیا ہو......اب تو وہ بھی بوڑھا ہو رہا ہے......امید و نا امیدی کی باتیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا۔

ڈاکٹر دانش دن ڈھلے بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہاسپٹل تشریف لائے۔رنگت اور نقوش ویسے ہی تھے مگر اچھے لباس نے شخصیت کو نکھار دیا تھا۔نذیر حسین انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا مگر انہوں نے اس کی جانب ایک بار بھی نہ دیکھا۔نذیر حسین فرط جذبات میں لبریز ان کے پیچھے ہی ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ایک نوجوان لڑکے نے اسے روکنا چاہا مگر وہ زبردستی اندر گھس گیا۔

ڈاکٹر دانش نے مڑ کر حیرت سے نذیر حسین کی جانب دیکھا،''کون ہیں آپ؟''ڈاکٹر دانش نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اقبال حسین......میں ہوں......تمہارا باپ......کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا......اپنے باپ کو نہیں پہچانا؟نذیر حسین نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''کون اقبال حسین......میں نہ آپ کو جانتا ہوں اور نہ ہی کسی اقبال حسین کو،میں ڈاکٹر دانش ہوں،صرف ڈاکٹر دانش،ڈاکٹر دانش نے بے رخی سے جواب دیا تو نذیر حسین کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

''کیا تم اپنی ماں زبیدہ کو بھی بھول گئے ہو......جو تمہاری جدائی میں رو رو کر اندھی ہو گئی ہے؟''نذیر حسین نے آہ بھر کر پوچھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔میرے والدین تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے''ڈاکٹر دانش نے قدرے بے باکی سے کہا تو نذیر حسین نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ گئی۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے لب ساکت ہو گئے۔اس نے پتھرائی نگاہوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں نمی بھرنے لگی۔

''اب آپ جاسکتے ہیں......میرا وقت بہت قیمتی ہے......میرے مریض میرا انتظار کر رہے ہیں''ڈاکٹر دانش نے قدرے ترش لہجے میں کہا تو نذیر حسین کو اپنی انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی اور وہ اپنی نم آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے باہر نکلنے لگا اور بے بسی وحسرت سے ڈاکٹر دانش کی جانب آخری بار دیکھا۔

''اور......بیٹے......کسی سے تعلق بنانے سے پہلے اپنی اوقات ضرور یاد رکھا کریں''ڈاکٹر دانش نے انتہائی کراہت سے نذیر حسین کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''انسان اپنی اوقات ہی تو بھول جاتا ہے''نذیر حسین نے انتہائی ضبط کرنے کے بعد مجبوراً کہا۔

''اگر یہاں آنے سے پہلے آپ اپنی حیثیت یاد رکھتے تو آپ کے لئے بہت بہتر ہوتا'' ڈاکٹر دانش نے خفگی سے کہا۔

''غلطی ہو گئی...... میں بھول گیا کہ میں سرکس میں کام کرنے والا جوکر...... کس کو ملنے جا رہا ہوں...... اتنے بڑے انسان کو...... جسے صرف اپنی حیثیت اور اوقات کا پتہ ہے...... باقی سب اس کے سامنے رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہیں...... معاف کرنا صاب غلطی ہو گئی'' نذیر حسین نے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ڈاکٹر دانش نے نخوت سے اس کی جانب دیکھا اور دروازہ کھول کر اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ نذیر حسین نے آخری بار اس کی جانب دیکھا اور رومال میں لپٹی اخبار کو نکال کر اس کے پرزے پرزے کر کے وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر دانش نے اخبار کے ایک پرزے کو اٹھا کر دیکھا، اس میں اپنی تصویر دیکھی اور گہری سانس لی۔

''رَبش'' وہ زیرِ لب بڑبڑائے اور باہر بیٹھے ایک سویپر کو بلایا کہ وہ کمرے کی صفائی کر دے اور جیب میں سے سگار نکال کر اسے سلگایا اور اس کے گہرے کش لگانے لگے۔ نذیر حسین کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے اندر 'امید' کے سارے دیئے بجھ چکے تھے۔ بیٹے سے ملنے کی آس اور خوشی دم توڑ چکی تھی۔ اس کا دل ایسے غم اور دکھ سے بھر گیا تھا جس کو برداشت کرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا...... اس کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ وہ اپنی ہچکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا مگر ایک دم اس کے منہ سے چیخ سی بلند ہوتی اس کا کلیجہ شدتِ غم سے پھٹ رہا تھا۔ ایسی تذلیل...... اور وہ بھی اپنی سگی اولاد کے ہاتھوں...... اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میری ہی غلطی تھی...... میں یہاں کیوں چلا آیا...... زینبے کی باتوں میں آ گیا اور بھول گیا کہ وہ یہی الفاظ آج سے کئی سال پہلے بھی ان سے کہہ چکا تھا...... پھر بھی وہ پر امید رہا......؟ اس نے کیوں امید باندھی......؟

اقبال حسین بالکل بھی نہیں بدلا تھا...... وہ پہلے کی طرح ہی بد لحاظ، اکھڑ اور ترش رو تھا...... اس نے پہلے بھی ماں باپ کا کوئی لحاظ نہ کیا تھا اور نہ ہی اب بھی...... نجانے کیوں وہ ایسا تھا؟ انہوں نے تو اسے ساری اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اس کی بدتمیزیاں برداشت کی تھیں۔ اس کے سامنے ماضی کے وہ دن گزرنے لگے...... جب وہ بچپن میں ہر کلاس میں فرسٹ آیا کرتا تھا اور انعامات لے کر آتا تھا تو زینب اور وہ اس کی تعریفیں کر کر کے اسے اپنے سر پہ بٹھاتے تھے۔

''اقبال حسین تو ہماری اولاد نہیں لگتا...... نجانے کیوں قدرت نے اسے ہمارے گھر پیدا کر دیا...... اتنا سمجھدار...... عقل والا...... پڑھنے لکھنے والا...... ہم غریبوں کے گھر...... جیسے گدڑی میں لعل'' زینب چپکے چپکے نذیر حسین کو کہتی اور دونوں نظریں چرا کر اسے دیکھتے اور وہ اکثر ان کی باتیں سن کر انہیں حیرت سے دیکھتا...... جب بھی دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتا تو ماں باپ ہمیشہ اس کی طرف داری کرتے...... رفتہ رفتہ اس میں سرکشی اور ضدی پن آ گیا تھا۔ وہ بہن بھائیوں اور ماں باپ پر حکم چلانے لگا تھا...... ذرا ذرا سی بات پر ماں باپ کی بے عزتی کر دیتا اور وہ خاموش ہو جاتے۔ جوں جوں وہ جوان ہوتا گیا۔ قدرت اس پر مہربان ہوتی گئی اس پر کامیابیوں کے دروازے کھلنے لگے...... پہلے اسے اپنے باپ کے پیشے سے نفرت ہونے لگی پھر ماں باپ اور بہن بھائیوں سے...... اس کا سوشل اسٹیٹس بڑھنے لگا اور اپنی فیملی اس کی نظروں میں بے وقعت اور حقیر ہونے لگی...... جیسے ہی وہ ڈاکٹر بنا...... اس نے گھر چھوڑ دیا اور جب شادی کی تو ماں باپ اور گھر والوں سے سارے تعلقات توڑ دیئے۔ اسے ان کے جسموں سے بدبو آتی تھی اور ان کے وجود سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے پیشے سے اسے بے عزتی محسوس ہوتی تھی اور ان سے نسبت باعث

ذلت و رسوائی تھی۔ اس میں خود بینی، تکبر اور خود نمائی نے تمام نرم جذبات اور دوسروں کے لئے لطیف احساسات چھین لئے تھے۔ اسے نہ دوسروں کا دکھ درد محسوس ہوتا تھا اور نہ اپنوں سے جدائی کا احساس کبھی تکلیف دیتا تھا...... اسے صرف اپنی ذات اور اپنی خوشیاں عزیز تھیں...... نہ وہ کسی کا سہارا بن سکا تھا اور نہ ہی اسے کسی کی ضرورت تھی...... وہ اپنی زندگی...... اپنے لئے جیو کے فارمولے پر عمل پیرا تھا۔

نذیر حسین کا سارا سفر روتے ہوئے کٹا...... اسے سب سے زیادہ اسی بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ اس کے علم والے، نام اور شہرت والے بیٹے نے کس طرح اسے ذلیل کیا تھا...... اور یہ سوچ سوچ کر اسے مزید پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ اس کی ماں کو کیا بتائے گا...... جو پندرہ سالوں سے اس کے انتظار میں ایک ایک لمحہ کتنی اذیت سے کاٹ رہی ہے...... جس کی زندگی میں صرف ایک ہی 'امید' ہے اور وہی 'امید' اسے زندہ رکھے ہوئے ہے...... بیٹے سے ملنے کی امید...... وہ کیسے اس 'امید' کو توڑ پائے گا اور زینب کیسے یہ سب کچھ سہہ پائے گی...... میں کیسے اسے بتا پاؤں گا......؟ مجھے اسے نہیں بتانا چاہیے ورنہ وہ مر جائے گی...... اور اگر زینب مر گئی تو میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہ پاؤں گا......؟

''نہیں مجھے اسے کچھ نہیں بتانا چاہیے'' نذیر حسین نے ہچکی لی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنا رومال اپنے منہ پر رکھ لیا اور چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کتنی ہی آنکھوں نے اسے حیرت سے گھورا...... اس نے بے بسی سے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا...... وہ خیالات کا تانا بانا بننے لگا...... وہ رات کو دیر سے گھر پہنچا تو زینب اس کی منتظر تھی۔ وہ دو راتوں سے بالکل بھی نہ سوئی تھی۔ یہی سوچ کر...... کہ...... اگر اقبال حسین اچانک آ گیا تو اسے سوتا ہوا پا کر اسے انتظار نہ کرنا پڑے...... یا...... پھر...... اسے سویا ہوا دیکھ کر واپس ہی نہ چلا جائے...... وہ...... تھا...... بھی جلد باز اور اکھڑ...... زینب کی اپنی سوچیں تھیں اور وہ سوچ سوچ کر زیر لب مسکراتی۔ ذرا سی آہٹ پر اس کا دل دھڑکنے لگتا...... اسے نظر کچھ نہ آتا تھا مگر وہ دروازے کی طرف چہرہ کر کے بیٹھی رہتی۔

اقبال حسین آئے گا...... تو اس کے گلے لگ کر بہت روئے گا...... اور...... وہ بھی بہت روئے گی۔ وہ اسے کہے گا کہ اماں میں تیرے بغیر بہت اداس تھا اور میں بھی اسے بتاؤں گی کہ اس کے انتظار اور جدائی میں تو ایک رات بھی سکون سے نہیں سوئی...... کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی ہنس کر کسی سے بات نہیں کی۔ اس کے انتظار میں کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا...... میں اس کو وہ سب باتیں بتاؤں گی جو میں اسے یاد کر کر کے سوچتی رہی ہوں۔ زینب کا دماغ اتنے سوالات اور جوابات سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔

دروازہ کھلا، نذیر حسین دبے قدموں سے گھر میں داخل ہوا مگر زینب اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی تھی۔

''نذیر حسین کیا تم آ گئے......؟ وہ دیوار کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک جانے لگی۔ اسے دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور ہر بار اسے ٹھوکر لگتی تھی مگر وہ اس کی عادی نہ ہو پا رہی تھی۔ نذیر حسین نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''اقبال حسین...... میرا بیٹا کہاں ہے...... اور...... تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ اس نے نذیر حسین کے چہرے پر اپنا ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ نذیر حسین نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔ زینب اس کی خاموشی سے گھبرا رہی تھی۔

تم بولتے کیوں نہیں......؟ کیا ہوا ہے......؟ دیکھو سچ سچ بتانا...... وہ تمہیں ملا ہے کہ نہیں؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں……'' نذیر حسین نے آہ بھر کر کہا۔

''نہیں…… یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے…… تم دو دن بڑے شہر میں رہ کر آئے ہو…… اور وہ تمہیں نہیں ملا…… میں نہیں مانتی…… تم جھوٹ بول رہے ہو……'' زینب نے غصے سے کہا۔

''رات بہت ہوگئی ہے…… تم سو جاؤ'' نذیر حسین نے اسے بوسیدہ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''پندرہ سالوں سے میں نہیں سوئی…… اور…… آج کیسے سو جاؤں…… تم مجھے بتاؤ…… اس نے کیا کہا؟ کیا تم نے اسے میری آنکھوں کے بارے میں بتایا اور یہ…… کہ…… میں اسے کتنا یاد کرتی رہتی ہوں'' زینب نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں……'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کچھ بھی نہیں بتایا…… تو…… پھر تم وہاں کیا کرنے گئے تھے'' زینب غصے سے منہ بنا کر بولی۔ نذیر حسین اس کی بات سن کر خاموش رہا اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی بے نور آنکھوں کو دیکھنے لگا جس میں آس اور امید کے جگنو ٹمٹما رہے تھے۔

''کیسے بتاؤں تجھے…… کیسے تجھ سے تیری امید چھین لوں…… کیسے اس انتظار کو ختم کر دوں جو تو ہر وقت اس کا کرتی رہتی ہے…… کیسے سب……؟ نذیر حسین پریشانی سے اپنا ہونٹ چبانے لگا۔

''تم بولتے کیوں نہیں……؟ مجھے صاف صاف بتاؤ…… اس نے کیا کہا…… کیا وہ بہت مصروف تھا…… اس لئے تمہارے ساتھ نہیں آیا''

''وہاں وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اس کے پاس وقت کہاں ہوگا؟'' زینب نے خود ہی سوالات گھڑنے شروع کر دیئے۔

''ہاں…… وہ بہت مصروف تھا'' نذیر حسین نے آہ بھر کر کہا۔

''پر…… میں نہیں مانتی…… کیا تو نے اسے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا…… دیکھ…… سچ سچ بتانا…… یہ…… یہ…… اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ…… تجھے میرے سر کی قسم…… مجھے سچ بتا'' زینب نے اس کا ہاتھ ٹٹول کر مضبوطی سے پکڑا اور اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ نذیر حسین گھبرا گیا اور ہاتھ چھڑانا چاہا مگر زینب نے دونوں ہاتھوں سے گرفت مضبوط کر لی۔ نذیر حسین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''بول…… اس نے کیا کہا تھا……؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

نذیر حسین نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور اپنی ہچکی کو روکنا چاہا۔

''تو…… بولتا کیوں نہیں'' زینب نے غصے سے کہا اور ایک ہاتھ سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا…… اس کے ہونٹوں پر اور پھر اس کی آنکھوں پر…… اسے روتا ہوا محسوس کر کے اس کا دل بے قرار ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سانس بند ہونے لگی ہو۔

''وہ بتا…… جو…… اس نے کہا…… تجھے میری قسم…… ورنہ میں مر جاؤں گی'' زینب نے انتہائی مضطرب ہو کر کہا۔

''اس نے کہا…… کہ…… کہ……'' نذیر حسین رکا۔

''کیا……؟'' زینب کی سانس گویا تھمنے لگی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

''اس کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے ہیں'' نذیر حسین نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ زینب کی گرفت اس کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا دل اور سانسیں اچانک تھم گئیں۔ اس کی پتھرائی آنکھوں سے آنسو اک جھڑی کی مانند بہنے لگے۔ لب خاموش ہو گئے...... جسم میں گویا نہ حرکت رہی نہ حرارت...... وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

نذیر حسین سسکیاں بھرتا رہا اور روتا رہا...... زینب کے اندر کیا کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی اسے خبر نہ تھی۔ اس کے اندر کئی سالوں کی 'امید' ختم ہو رہی تھی۔ آس کے ٹمٹماتے جگنو دم توڑنے لگے تھے۔ انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ آس امید...... ملنے کی خوشی...... دید کی تڑپ...... انتظار کا کرب، وصل کی بے قراری سب کچھ اس کے اندر دم توڑ رہا تھا۔ اس کا دل، دماغ سے سب کچھ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ اس کا اندر خالی ہو رہا تھا...... وہ محض مٹی کا بے جان مجسمہ بنی بیٹھی تھی...... ساکت...... خاموش...... بے زبان...... اور نیم مردہ......

جب انسان کے اندر سے 'امید' کا آخری دیا بھی بجھ جاتا ہے تو...... وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔

نذیر حسین رو رہا تھا...... سسک رہا تھا...... آہیں بھر رہا تھا...... سانس لے رہا تھا...... اور سوچ رہا تھا...... مگر اس کے وجود میں حرکت بھی تھی اور حرارت بھی تھی...... اسے اقبال حسین سے ایسی ہی 'امید' تھی...... وہ جانے سے پہلے امید اور ناامیدی کی وجہ سے اتنا مضطرب نہیں ہوا تھا جتنا زینب کو دیکھ کر اب ہو رہا تھا۔

زینب کچھ نہ بولی...... خاموشی سے نذیر حسین کی سسکیاں سنتی رہی اور ان سسکیوں سے اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹتا رہا...... کیا کچھ ختم ہوتا رہا...... وہ نذیر حسین کو نہ بتا سکی...... شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی...... شاید کوئی انسان بھی نہیں جانتا کہ کس طرح...... اس کے اندر سے کیا کچھ کیسے ختم ہوتا جاتا ہے۔

☆

ڈاکٹر رمیض کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اور وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے...... ڈاکٹر محسن زیدی خصوصی طور پر ان کا علاج کر رہے تھے...... ڈاکٹر رمیض کے ماں باپ گاؤں سے آ گئے تھے اور اپنے جوان، قابل فخر بیٹے کو یوں بیمار پڑے دیکھ کر ہر وقت روتے رہتے تھے...... ڈاکٹر رمیض اوپر تلے دو انتہائی گہرے صدموں سے دوچار ہوئے تھے۔

دریہ نے ان سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اس پر کسی بھی قسم کا کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں تھی...... دو ماہ سے دونوں میں جو ذہنی تناؤ اور ایک دوسرے میں جتنا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دونوں میں پہلی جیسی محبت اور چاہت کی امید نہ رہی تھی۔ دریہ ہر وقت گہری سوچوں میں گم رہتی...... اس کی آنکھیں اندر ہی اندر کتنے آنسو پیتی رہتیں اور دل ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتا...... ایک جملہ اس کے تن بدن میں ہر وقت آگ لگائے رکھتا۔

''مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا''

دریہ کے منہ سے آہیں بلند ہوتیں...... کاش ڈاکٹر رمیض کوئی اور بات کہتے تو میں اس پر کمپرومائز کر لیتی...... اس کو بھلا دیتی...... مگر جس

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رشتے کی نیاد ہی اعتبار پر ہو...... وہی ختم ہو جائے تو پھر کیسا رشتہ باقی رہ جاتا ہے؟

دریہ اندر ہی اندر سلگتی رہتی...... ڈاکٹر رمیض نے کئی بار اسے منانے کی کوشش کی مگر دریہ کے ایک سوال پر وہ ہر بار خاموش ہو جاتے۔

''جب اگر میری ذات ہی آپ کے لئے ناقابل اعتبار ٹھہری ہے تو پھر کسی بات پر کمپرومائز کروں؟

دونوں میں روز بروز شدید تناؤ پیدا ہونے لگا تھا...... ڈاکٹر دانش نے ایسی آگ لگائی تھی جس نے ان کے محبت بھرے آشیانے کو آگ لگا دی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اتنا مشکوک کر دیا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے بارے میں بدل ہو گئے تھے...... اور...... پھر دریہ نے پکا فیصلہ کر لیا تھا...... اور ڈاکٹر رمیض سے طلاق مانگی تھی...... ڈاکٹر رمیض کو اس بات کی قطعی توقع نہ تھی۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

''دریہ...... یہ تم نے کیسے سوچ لیا...... کہ میں تمہیں طلاق دوں گا...... ہرگز نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے پریشان ہو کر کہا۔

''کیوں...... طلاق نہیں دیں گے...... ایسے بے اعتبار رشتے کو ہم کب تک کھینچیں گے...... کچے دھاگے سے بھی کمزور اس رشتے کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے'' دریہ نے قطعیت سے جواب دیا۔

''پلیز...... ایسا مت کرو...... میرا سب کچھ ختم ہو جائے گا......'' ڈاکٹر رمیض نے کہا تو دریہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر رمیض نے تم سے شادی مفادات کی خاطر کی ہے...... جتنی جلدی ممکن ہو اس سے پیچھا چھڑا لو......'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اسے ان کی باتوں پر یقین آنے لگا۔

''میرے پاس اس کا ثبوت ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ نے اسے مضطرب کر دیا۔

''میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا...... تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے...... پلیز......'' ڈاکٹر رمیض اس کے سامنے گڑگڑائے۔

''اب کچھ بھی ممکن نہیں'' دریہ نے آہ بھر کر کہا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم دونوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں...... ان میں محبت کی جگہ نفرت اور شکوک و شبہات نے لے لی ہے اور جن دلوں میں ایک دوسرے کے لئے شک پیدا ہوتا ہے وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے 'سچی محبت' نہیں کر پاتے...... وہ ہمیشہ دور ہی رہتے ہیں۔ اس لئے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہی بہتر ہے......'' دریہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

''مجھے طلاق کے کاغذات جلدی بھجوا دیجئے گا...... ورنہ مجھے کورٹ جانا پڑے گا...... اور...... یہ...... نہ آپ کے لئے بہتر ہو گا نہ میرے لئے'' دریہ نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے اسے روکنا چاہا مگر روک نہ سکے...... بہت کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے...... بہت سی باتیں سمجھانا چاہیں مگر کچھ بھی نہ سمجھا سکے۔

دریہ چلی گئی...... ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ کر...... کتنی محبت اور چاہت سے دونوں نے اس گھر کو سجایا تھا...... دونوں کتنی محبت سے رہتے

تھے......دونوں کے دل ایک دوسرے کی چاہت اور محبت سے سرشار تھے...... کیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ دریہ نے ٹھیک کہا تھا جب دل ایک بار دور ہو جائے تو پھر رشتے کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔

''تمہاری بیوی بھی بہت بے وفا ہے......اور میرے پاس اس کا ثبوت ہے'' ڈاکٹر دانش نے کتنے پر اعتماد لہجے میں اسے یقین دلایا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان الفاظ کے حصار سے نہیں نکل پائے تھے...... دریہ انہیں واقعی ہی مشکوک لگتی وہ جیسے ہی اس کے پاس جاتے۔ ڈاکٹر دانش کے الفاظ کی بازگشت انہیں دریہ کے قریب نہ آنے دیتی...... واقعی دونوں کے رشتے میں ایسی دراڑ پیدا ہو گئی تھی جو انہیں ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتی تھی...... دریہ نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا...... ایسے رشتے کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے...... اور انہوں نے بہت ٹوٹے دل اور بہت سے آنسوؤں کے ساتھ طلاق کے کاغذات پر سائن کر کے انہیں دریہ کو بھجوا دیئے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسا بھیانک اور تکلیف دہ موڑ آیا تھا جس نے انہیں اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زندگی میں بہت کچھ کر گزرنے کا جذبہ ماند پڑ گیا تھا۔ ہر قدم پر کامیابیاں سمیٹنے والا انسان زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا تھا...... دریہ کے جانے سے ان کی زندگی خالی ہو گئی تھی...... کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس کے وجود کو اندر سے خالی کر دیتے ہیں...... اور انسان ساری زندگی اس خالی پن کی کسک اپنے اندر کس کس طرح محسوس کرتا ہے یہ صرف وہی جانتا ہے کبھی دنیا کی نعمت اور ہر شے پاس ہوتے ہوئے بھی دنیا خالی لگتی ہے...... کبھی ساری جدوجہد بے معنی اور فضول لگتی ہے...... اور کبھی...... خوشیوں سے خالی مسکراہٹیں...... اس خالی پن کی چبھن میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔

ڈاکٹر محسن زیدی کی کوششوں اور ڈاکٹر رمیض کے والدین کی دعاؤں اور خدمت نے انہیں جلد صحت یاب کر دیا۔ ڈاکٹر محسن زیدی کی حوصلہ افزا باتوں نے ان کی بہت ہمت بندھائی۔ ان کی دلجوئی نے انہیں بہت سہارا دیا۔ ڈاکٹر رمیض انہیں اپنا دکھ بتاتے ہوئے اکثر رو دیتے...... اور وہ بھی ان کی باتیں سن کر پریشان ہو جاتے...... مگر وہ رفتہ رفتہ قدرے نارمل ہو گئے تو ڈاکٹر محسن زیدی نے انہیں زندگی کو دوبارہ اسی جذبے اور جوش سے گزارنے کی تلقین کی۔ انہیں اپنی ریسرچ پر مزید کام کرنے کو کہا تو انہیں ڈاکٹر دانش یاد آ گئے جو وہ کسی لمحہ بھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتے تھے۔

کیا ڈاکٹر دانش کی کوئی خیریت معلوم ہوئی ہے......؟ وہ آج کل کہاں ہیں...... اور کس کے پاس؟ ڈاکٹر رمیض نے پوچھا تو ڈاکٹر زیدی نے گہری سانس لی اور اس کی جانب دیکھنے لگے۔ اپنی بیوی کے پاس'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''بیوی...... کے...... پاس...... امپاسبل'' ڈاکٹر رمیض اپنی سیٹ سے قدرے اچھلتے ہوئے بولے۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'' ڈاکٹر رمیض بڑبڑائے۔

''ویسے ہی ممکن ہے جیسے ڈاکٹر دانش کا...... ڈاکٹر جالب کے ہاسپٹل میں جاب کرنا'' ڈاکٹر زیدی نے اپنے حریف ڈاکٹر جالب کے بارے میں بتایا جن کے ساتھ سرد جنگ جاری رہتی تھی۔

''ڈاکٹر جالب کے پاس......او......تو......'' ڈاکٹر رمیض پھر چونکے۔

''ہاں......'' ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آئی ڈونٹ بلیواٹ......کیا ڈاکٹر دانش سب کچھ بھول گئے کہ آپ نے......اور میں نے کس کس طرح ان کے لئے......'' ڈاکٹر رمیض جملہ ادھورا چھوڑ کر پریشانی سے ڈاکٹر زیدی کی طرف دیکھنے لگے۔

''اپنی ذات کے زعم میں محصور انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، اسے صرف اپنا نفس......اپنی خواہشات اور اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں......'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر دانش کو کچھ تو یاد رکھنا چاہیے تھا'' ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے کہا۔

''انسان بہت عجیب مخلوق ہے......وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو تو یاد رکھتا ہے اور جو زیادتیاں وہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے، اس کی justfications کے لئے 101 جواز دے گا۔ ڈاکٹر دانش نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے زیادہ تر دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے......وہ بہت آسانی سے دوسروں کے دلوں، زندگیوں اور جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے عادی ہیں......'' ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا تو ڈاکٹر رمیض گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دریا اور ان کی زندگی میں دراڑ پیدا کرنے والے بھی وہی تھے۔ ڈاکٹر رمیض کا دل دھڑکنے لگا۔ کاش......انہیں معلوم ہو سکے کہ انہوں نے دوسروں کا کتنا نقصان کیا ہے؟ ڈاکٹر رمیض نے نم آنکھوں سے کہا اور ایک دم خاموش ہو گئے۔

''بہت سے انسان کتنی آسانی سے دوسروں کی زندگیوں سے امیدیں، خوشیاں اور سکون چھین لیتے ہیں اور انہیں اس بات کا ذرا سا احساس بھی نہیں ہوتا'' ڈاکٹر زیدی نے بھی گہری سانس لے کر کہا۔

ڈاکٹر دانش کا کریہہ چہرہ ڈاکٹر رمیض کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب وہ دریا اور انہیں ہنستے ہوئے دیکھ کر کمرے سے باہر نکلے تھے اور ان پر چلانے لگے تھے۔

''اوہ......مائی گاڈ'' ڈاکٹر رمیض کے منہ سے نادانستہ نکلا۔

''ڈاکٹر رمیض......ہم انسان کی سرشت......اور اس کی فطرت نہیں بدل سکتے......اس کا خمیر کس مٹی سے گندھا ہے اور اس کے خمیر میں کیا کچھ شامل کیا گیا ہے......کوئی نہیں جانتا'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض ان کی بات سن کر افسردہ ہو گئے۔

''ڈاکٹر رمیض......زندگی میں قدم قدم پر ایسے کردار ملتے ہیں......جو اپنی ذات کے زعم اور انا کے حصار سے باہر نہیں نکلتے......جنہیں اپنے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا جو جیتے ہیں تو اپنے لئے......اور......جب مر جاتے ہیں تو خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں......ہمیشہ کے لئے......ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ انسانیت کی فلاح کے بارے میں سوچنے والے عظیم انسانوں میں سے ایک ہیں......جو شخص اپنے خیر خواہوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں مصروف رہے وہ کس طرح انسانیت کا خیر خواہ ہو سکتا ہے......ڈاکٹر رمیض آپ اپنی ریسرچ پر دوبارہ کام شروع کریں......میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا......کرائسز زندگی کا حصہ ہوتے ہیں مگر ان کو روند کر گزر جانے والے ''پُرعزم'' اور ایسے لوگوں پر آنے والی نسلیں بھی فخر کرتی ہیں......آپ اپنی ہمت کو یکجا کیجئے......حوصلہ بلند رکھیے......کامیابیاں آپ کی منتظر ہیں'' ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی محبت سے ڈاکٹر رمیض کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی تو ان کے رگ و پے میں ایسی لہر دوڑ گئی جس نے ان کے خون کی گردش کو تیز کر دیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

انہیں اپنے اندر کوئی برقی توانائی سی محسوس ہونے لگی جس نے ان کے پریشان اور مردہ دل کو ایک بار پھر متحرک کر دیا۔ کچھ کرنے کا جذبہ پھر سے جوش پکڑنے لگا۔ ڈاکٹر رمیض کی آنکھیں خوشی سے چمکیں اور انہوں نے مسکرا کر ڈاکٹر محسن زیدی کی جانب دیکھا۔

''یس مائی ڈیئر...... میں ان آنکھوں میں 'امید' کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں...... آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں...... آپ جیسے انسان سالوں میں نہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں...... قدرت آپ پر بہت مہربان ہے جس نے آپ کو عقل سلیم اور قلب سلیم عطا کیے ہے...... اور جن انسانوں میں یہ خصوصیات موجود ہوں وہ لوگ قدرت کے شاہکار اور خاص منظور نظر ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے پرودگار نے ان کو کیا معجزاتی قوتیں عطا کی ہیں...... مگر ارد گرد کے صاحب نظر لوگ ان کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ ان خصوصیات کی کشش انہیں ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے...... مجھے آپ سے بہت اچھی امیدیں ہیں...... آئی ایم شیور...... آپ میری اور بہت سے لوگوں کی امیدوں کو پورا کریں گے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

''تھینک یو...... سر...... آپ کی باتوں نے میرے مایوس دل میں پھر سے زندگی کی حرارت پیدا کر دی ہے...... تھینک یو ویری مچ'' ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر محسن زیدی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر مشکورانہ انداز میں کہا اور فرط جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''بیسٹ آف لک...... مائی ڈیئر'' ڈاکٹر زیدی نے ان کے کندھے کو ایک بار پھر تھپتھپایا تو وہ مسکرا گئے۔

انہوں نے گھر آ کر نئے جذبے، نئے عزم اور نئے جوش کے ساتھ اپنے تمام ریسرچ پیپرز نکالنے چاہے مگر ان کی اہم دستاویزات اور تمام ریسرچ پیپرز غائب تھے...... وہ گھبرا گئے...... کمپیوٹر آن کر کے تمام data چیک کرنے کی کوشش کی مگر سارا data ڈیلیٹ کر دیا گیا تھا۔ کمپیوٹر خالی تھا اور ان کی لیب کے خفیہ خانے نکلے پڑے تھے۔ ان کی اتنے سالوں کی کاوش...... تجربوں ریسرچ کا نچوڑ غائب تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے...... ان کی سانسیں رکنے لگیں۔

''کیا دریہ نے یہ سب کیا ہے؟'' وہ اس قدر ظالم بھی ہو سکتی ہے کہ میری اتنے سالوں کی محنت کو آگ لگا گئی......'' ڈاکٹر رمیض کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ کی بیوی بہت بے وفا عورت ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ ان کے کانوں میں گونجے۔

''کیا...... کوئی اس حد تک بھی بے وفائی کر سکتا ہے کہ کسی سے اس کی زندگی کی 'امید' بھی چھیننے کی کوشش کر سکتی ہے۔ ان کا سارا جوش و جذبہ ماند پڑنے لگا۔ دل ڈوبنے لگا...... آسمان پر اڑنے والے پرندے کی طرح جس کی امید اور خوشی کو اس کے پر کاٹ کر ختم کر دیا جائے تو وہ کتنا دکھی اور مغموم ہوتا ہے...... یہ صرف وہی جانتا ہے اور ڈاکٹر رمیض بھی ایسی کیفیت میں سے گزر رہے تھے۔ وہ زندگی کی ایک بازی پہلے ہار گئے تھے اور اب دوسری نے بھی انہیں بری طرح مات دی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر زیدی کو فون کیا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

''اوہ...... نو...... ڈاکٹر دانش اس حد تک......'' ڈاکٹر زیدی نے انتہائی تاسف سے کہا اور خاموش ہو گئے۔

''کیا یہ سب ڈاکٹر دانش نے کیا ہے؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر زیدی نے وثوق سے جواب دیا۔

''آپ...... کیسے یہ سب...... جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''آج کی نیوز کی اہم خبر ہی یہی تھی کہ ڈاکٹر دانش بہت جلد اپنی latest ریسرچ کے سلسلے میں پریس کانفرنس کرنے والے ہیں اور ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر دانش کسی بھی ریسرچ پر کام نہیں کر رہے تھے......اور کوئی بھی ریسرچ چند دنوں میں نہیں ہو سکتی......'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض کو انتہائی شدید جھٹکا لگا اور اس کا فون بند ہو گیا۔ ڈاکٹر زیدی پریشان ہو گئے اور بار بار ان کا نمبر ملاتے رہے مگر ان کے موبائل پر بیلز ہوتی رہیں...... کسی نے بھی فون اٹینڈ نہیں کیا...... ڈاکٹر زیدی گھبرا گئے اور جلدی سے ان کے گھر پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رمیض اپنے کمرے کے فرش پر اوندھے منہ گرے تھے اور بے ہوش ہو چکے تھے۔ ڈاؤن ہو گیا تھا...... ڈاکٹر زیدی نے بہت کوشش اور توجہ سے ان کا علاج کیا...... وہ چند روز بعد قدرے بہتر ہو گئے تھے مگر وہ ایسے خاموش ہوئے تھے کہ کچھ بھی نہ بولتے تھے ان کے لب گویا سل گئے تھے یا ان کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہ رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی بھی بہت افسردہ تھے...... وہ انہیں دبے دبے الفاظ میں دلاسا دینے کی کوشش کرتے ان کی ہمت بندھاتے تو ڈاکٹر رمیض یوں خالی نظروں سے ان کی جانب دیکھتے جیسے انہیں ان کی کسی بات پر بھی یقین نہ رہا ہو...... ان کی آنکھیں ایسی ناامید اور سونی ہو گئی تھیں جیسے ان سے ان کی زندگی کا نور ہی چھین لیا ہو...... دل اور دماغ خالی ہو گئے تھے۔ ہر طرف 'خالی پن' دکھائی دے رہا تھا اور اس 'خالی پن' سے جنم لینے والی کسک اندر ہی اندر انہیں کتنا تڑپا رہی تھی اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ پرعزم زندگی گزارنے والے جب 'خالی پن' کا شکار ہوتے ہیں تو کس طرح یاسیت ان کو مضطرب رکھتی ہے...... یہ کوئی نہیں جان پاتا۔

☆

ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رمیض کے ریسرچ پیپرز کی مدد سے ایسی ویکسین تیار کر لی تھی جس سے معمولی ابنارمل بچوں کے damaged برین سیلز کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو کسی چوٹ کے نتیجے میں ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ یہ تجربہ کسی حد تک کامیاب رہا تھا اور چند بچے ٹھیک بھی ہو گئے تھے۔ اس ویکسین نے ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ ایسے بچوں کے والدین کے اندر امید کی شمع روشن ہو گئی تھی اور وہ بے حد خوش تھے مگر پیدائشی طور پر ابنارمل بچوں کے بارے میں یہ ویکسین اتنی کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی اور اس بات کا علم صرف ڈاکٹر دانش کو ہی تھا لیکن وہ اس کا بھی دعویٰ کر رہے تھے۔ پوری دنیا سے انہیں مبارکباد کے فون آ رہے تھے ان کی شہرت کا ڈنکا ہر جانب بج رہا تھا۔ ان کی تحقیق کو بے حد سراہا جا رہا تھا۔ ان پر فخر کیا جا رہا تھا۔ ان کے لئے ایوارڈز کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اس ریسرچ نے ان کو ہیرو بنا دیا تھا فخر و غرور نے ڈاکٹر دانش کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد تو ہر گھر میں ان کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔

''میں نے یہ کام صرف انسانیت کی خدمت کے لئے کیا ہے'' ڈاکٹر دانش نے ایک انٹرویو میں کہا اور ڈاکٹر محسن زیدی دانت پیس کر رہ گئے۔

''اتنا جھوٹ...... اتنا دھوکہ...... اور...... اتنی ایکسپلائٹیشن...... انسان اس حد تک بھی کمینہ ہو سکتا ہے...... کس قدر آسانی سے دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر کتنا مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے'' ڈاکٹر زیدی کو ان کا انٹرویو سن کر غصہ آ گیا اور ان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔

کاش...... ڈاکٹر رمیض کے پاس کچھ تو ثبوت ہوتا...... اور ان کے جو ریسرچ پیپرز شائع ہوئے تھے۔ وہ اس ویکسین سے متعلق نہیں تھے۔ ویکسین پر کام انہوں نے بعد میں کیا تھا لیکن وہ کام ابھی ادھورا تھا اس پر مزید ریسرچ باقی تھی اور اس کام کو مکمل کر کے ڈاکٹر دانش نے سارا کریڈٹ خود لے لیا تھا۔ ڈاکٹر رمیض کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا...... در یہ کے جانے سے ان کا اندر خالی ہو گیا تھا اور اتنی محنت چھن جانے سے ان کا جذبہ ماند پڑ گیا تھا۔

☆

ان کی کامیابی سے فریحہ بہت خوش تھی...... کیونکہ اس کے اندر امید کی کرن چمکی تھی...... اتنے بہت سے ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد سب نے عاصم کے لئے انکار کر دیا تھا کہ اس کے برین کا ایک اہم حصہ پیدائشی طور پر damage ہے اور اس کا ٹھیک ہونا ناممکن ہے...... بشرطیکہ قدرت چاہے اور ناممکن کو ممکن بنا دے...... اور وہ ہر وقت دل ہی دل میں خدا سے کسی معجزے کی دعا کرتی رہتی جو اس کے عاصم کو ٹھیک کر دے...... زیادہ نہیں تو...... اتنا ہی...... کہ وہ خود چل پھر سکے...... خود کچھ کھا پی سکے...... اس کی معذوری دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا رہتا تھا...... وہ ماں تھی اس کے لئے کوئی ایسی بات بھی نہیں سوچ سکتی تھی جو اس کے لئے مزید اذیت کا باعث بنے...... عاصم سے جدائی کا دکھ اور صدمہ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر پائے گی۔ اب وہ منتظر تھی کہ کب ڈاکٹر دانش عاصم کو اس ویکسین کے لئے ہاسپٹل لے کر جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک دن اس امید میں گزار رہی تھی اور اس کے اندر اتنی امید پیدا ہو چکی تھی جو اس کو اندر ہی اندر مسرور رکھتی...... وہ ان دنوں بہت خوش تھی...... اور ڈاکٹر دانش اس کی خوشی اور اطمینان دیکھ کر مشکوک ہو جاتے فریحہ نے عاصم کی خاطر ان کو اپنے گھر میں انیکسی دی تھی۔ ان کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھا تھا مگر انہیں اپنی ذاتی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے پہلے روز سے ہی ان کے قیام کا انتظام انیکسی میں کیا تھا...... اور اس بات نے ڈاکٹر دانش کو اندر ہی اندر اس کا مزید دشمن بنا دیا تھا...... شیر افگن کا فون اس کا فریحہ سے ملنے آنا انہیں بری طرح کھٹکتا تھا۔ شیر افگن کے بارے میں سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی مگر وہ خاموش رہتے تھے...... رفتہ رفتہ شیر افگن نے فریحہ...... کو فون کرنا بھی بند کر دیا تھا اور اس سے میل جول بھی تقریباً ختم کر دیا تھا...... ورنہ وہ فریحہ کے بارے میں بہت پوزیسو ہو گیا تھا اور کئی بار اس کو شادی کی آفر کی تھی...... فریحہ اس کی بات سن کر پہلے تو انکار کر دیتی مگر آہستہ آہستہ وہ اس کی محبت کی اسیر ہونے لگی۔ اس کی محبت اس کے اندر کے سونے پن کو جھنجھوڑنے لگی۔ اس کا سکون تہہ و بالا کرنے لگی اسے شیر افگن کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس نے شیر افگن کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد ڈاکٹر دانش سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے گی...... دونوں مطمئن ہو گئے تھے اور پھر اس موضوع پر بات نہ کرتے...... نجانے اچانک کیا ہو گیا تھا کہ شیر افگن بہت مصروف ہو گیا تھا وہ فریحہ کو نہ تو صبح سویرے وش کرتا...... نہ آفس میں لنچ بریک میں اسے فون کرتا اور نہ ہی رات کو اسے گڈ نائٹ کہتا...... فریحہ کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی...... اس نے ایک دو بار اس سے وجہ دریافت کی اور وہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال گیا۔ فریحہ نے بھی اسے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ فریحہ کو دو اہم پراجیکٹس ملے تھے اور وہ اس میں بہت مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنی فیلڈ میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی اور ڈاکٹر دانش اس کو یوں مصروف، مشہور اور مطمئن دیکھ کر اپ سیٹ ہو جاتے...... انہوں نے تو اسے ہر طرح سے مفلوج کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی زندگی...... اس کا کیریئر...... اس کی خوشیاں اور سکون چھیننے کی بہت کوشش کی تھی۔ کس کس طرح

اس کی عزت نفس مجروح نہ کی تھی اور وہ پھر بھی زندہ تھی...... مطمئن تھی اور پُر سکون بھی تھی...... فریحہ کی کامیابیاں اور اس کی شہرت انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ انہیں کامیاب عورتوں سے نفرت تھی...... وہ عورت کی کامیابی کو مرد کی ناکامی تصور کرتے تھے...... مرد کی کامیابیوں کے سامنے عورت کی کامیابی کیا معنی رکھتی ہے اور شادی کے بعد انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی ذات کی نفی کرنے کی کوشش کی تھی اس کے لئے زندگی کا ہر لمحہ اذیت ناک بنا کر وہ خوش ہوتے تھے اور انہی سب باتوں کے باوجود وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور مطمئن تھی اور اس کے پیچھے کون تھا وہ اچھی طرح جان گئے تھے' شیر افگن' اس کی خوشی تھا اور عاصم اس کی زندگی کی 'امید' اور سہارا تھا...... عاصم کے وجود سے اس کی زندگی متحرک تھی اس کے نیم مردہ وجود سے اسے زندگی میں جدوجہد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ہونے سے اسے حوصلہ ملتا تھا۔

جب سے ڈاکٹر دانش کی ویکسین کی کامیابی کا چرچا ہر جانب ہو رہا تھا اسے سب کچھ بھول گیا تھا...... اگر یاد تھا تو صرف عاصم...... اور وہ اس دن کی شدت سے منتظر تھی جب عاصم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ عاصم کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دل کتنی خوشی اور امید سے بھر جاتا اس کا احساس اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔ وہ ان دنوں شیر افگن کو بالکل بھول چکی تھی۔ اگر یاد تھا تو صرف عاصم......

''آپ...... عاصم کو کب ہاسپٹل لے کر جائیں گے؟'' فریحہ نے کئی دنوں کے انتظار کے بعد ڈاکٹر دانش سے پوچھا۔

''بہت جلد......'' انہوں نے جواب دیا۔

''کیا آپ کو امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا'' فریحہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''ٹھیک...... کیوں نہیں ہوگا...... میں نے اتنی محنت...... اتنی جدوجہد صرف اس کے لئے ہی تو کی ہے...... مجھے بھلا کیا ضرورت پڑی تھی کہ دوسروں کے لئے اتنی محنت کروں...... اتنا سر کھپاؤں...... میں نے تو یہ سب کچھ صرف اپنے بیٹے کے لئے ہی کیا ہے...... اور تمہارے لئے...... کیوں کہ تم اس سے بہت محبت کرتی ہو......'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

''تم اس سے محبت کرتی ہو...... نا؟'' ڈاکٹر دانش نے پوچھا۔

''ہاں...... اپنی زندگی سے کون محبت نہیں کرتا ہوگا......؟'' فریحہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا دنیا میں تمہیں صرف وہی عزیز ہے...... اور...... کوئی نہیں؟'' ڈاکٹر دانش نے استفہامیہ نگاہوں سے پوچھا۔

فریحہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا کیونکہ ایک سوال میں مضمر اور بہت سے سوالات اس سے پوچھے گئے تھے۔

''نہیں'' فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں جانتا تھا...... عاصم تمہاری زندگی ہے...... تمہاری امید...... خوشیاں اور سب کچھ ہے...... میں ضرور اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا...... بس ایک دو روز میں میں اسے ہاسپٹل لے جاؤں گا......'' ڈاکٹر دانش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو فریحہ خوش اور پُر سکون ہو گئی۔

ڈاکٹر دانش کا شاطر ذہن نت نئے منصوبے بنانے لگا۔

☆

''کل صبح میں عاصم کو ہاسپٹل لے کر جاؤں گا......تم اسے تیار کر دینا'' ڈاکٹر دانش نے دو روز بعد فریحہ کو کہا۔

''کیا میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی خاص ضرورت نہیں......میں ہاسپٹل سے ایمبولینس منگوالوں گا'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''لیکن......عاصم کبھی بھی میرے بغیر کہیں نہیں گیا......'' فریحہ نے افسردگی سے کہا۔

''تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے......اسے تو کسی بھی بات کا شعور نہیں'' ڈاکٹر دانش نے فریحہ کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی کو محسوس کرنے کے لئے شعور کی نہیں......محبت بھرے لمس کی ضرورت ہوتی ہے......وہ میرے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کرتا ہے......جب میں اسے چھوتی ہوں تو محبت سے اس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور وہ اپنی محبت کا اظہار مجھے اپنے انداز سے چھو کر اور اپنے منہ سے مخصوص آوازیں نکال کر کرتا ہے۔ دانش ان سالوں میں......میں نے اس میں ایسی ایسی باتیں آبزروکی ہیں کہ میں قدرت پر اور اس کے معجزوں پر حیران ہوگئی ہوں......انسان ہر صورت میں اس کا بہت بڑا معجزہ اور شاہکار ہے'' فریحہ نے فرط جذبات سے لبریز بھرائی آواز کے ساتھ کہا۔

''یہ سب تمہارا وہم ہے......ہر چیز اور ہر تخلیق سائنس کا کرشمہ ہے اور اس میں تبدیلیاں آنا نیچرل ہے۔ نیچرل فـکـــس کبھی نہیں بدلتے......دقیانوسی ذہن ایسی تبدیلیوں کو قدرت کے معجزوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ہم جیسے ویل ایجوکیٹڈ لوگ ان معجزوں پر یقین نہیں کرتے۔ ہر ایکشن کا ری ایکشن ہونا نیچرل ہوتا ہے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ''سائنس'' ہے......انسان کے نارمل یا ابنارمل ہونے کی بھی سائنسی وجوہات ہوتی ہیں، برین سیلز یا ٹشوز کے damage ہونے کی بھی وجوہات ہوتی ہیں......اگر ایسا نہ ہوتا تو میری ویکسین کارگر نہ ہوتی......مردہ برین سیلز اس ویکسین سے کبھی بھی ایکٹو نہ ہوتے۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے، برین سیلز کسی وجہ سے damaged ہوئے اور سائنسی طریق علاج یعنی میڈیسنز سے وہ متحرک ہوگئے......اب اس میں قدرت اور معجزے کی بات کہاں سے آگئی......ایک بیماری کا علاج کیا گیا اور وہ ٹھیک ہوگئی......'' ڈاکٹر دانش نے اس قدر مدلل انداز میں کہا تو فریحہ خاموش ہوگئی......کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے ڈاکٹر دانش کے ساتھ جب بھی کسی ٹاپک پر مدلل بحث کرنے کی کوشش کی......وہ زچ ہوکر ہائپر ہوجاتے......اور ہر دفعہ بحث کو انتہائی بُرے انداز سے ختم کرنا پڑتا۔ فریحہ خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی جس کی سوچیں اور خیالات اس سے کتنے مختلف تھے......وہ قدرت کی صناعیوں اور اس کی کرشمہ سازیوں کی قائل تھی......اور وہ سائنس کی کرشمہ سازیوں کا مداح تھا......اسے معجزوں پر یقین تھا اور وہ ان کا منکر......وہ سوچ اور عمل کی قائل تھی اور وہ عمل ورد عمل کے جواز پر یقین رکھتا تھا......وہ صرف خدا ہے اور باقی سب کچھ سائنس کا مرہون منت ہے......اس سوچ نے اس کی ذات سے قدرت کے لئے مخصوص جذبات ختم کر دیئے تھے وہ اپنی کامیابیوں، ذات کے زعم اور انانیت کی چاہت میں اس حد تک آگے چلا گیا تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ قدرت کی نفی کر دی تھی......سوچ سے نہیں مگر اپنے عمل سے......فریحہ اس کی باتوں کو انتہائی حیرت سے سنتی اور ان کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی......وہ شخص واقعی اس سے بہت فاصلے پر تھا اور وہ اس سے بہت دور......اگلے روز وہ عاصم کو ہاسپٹل لے جانے لگے تو......فریحہ نے عاصم کو جی بھر کر پیار کیا۔ عاصم کی

آنکھوں میں عجیب سی حسرت تھی...... وہ کتنی ہی دیر اسے چومتی رہی...... پیار کرتی رہی......

''پلیز...... مجھے بھی اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیجئے'' فریحہ نے بے تابی سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا وہاں جانا بے کار ہے...... آپریشن تھیٹر کے باہر یونہی پریشان بیٹھی رہو گی'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''میں یہاں بھی تو بیٹھ کر پریشان ہوں گی...... تو...... وہاں بیٹھ کر انتظار کر لوں گی'' فریحہ نے بے صبری سے کہا۔

''پروسیس کافی لمبا ہو گا...... تم دو گھنٹے بعد آ جانا'' ڈاکٹر دانش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو فریحہ خاموش ہو گئی۔

''کیا...... پروسیس رسکی ہے؟'' فریحہ نے ڈرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا...... ہو بھی سکتا ہے...... سب انسانوں کے جسم میں میڈیسنز کا ری ایکشن ایک سا نہیں ہوتا...... کچھ نارمل رہتے ہیں اور کچھ او ور سینٹو لوگوں میں ردعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ عاصم کا جسم کیسے ری ایکٹ کرے گا...... یہ میں بھی نہیں جانتا'' ڈاکٹر دانش نے تفصیلاً اسے بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ فریحہ خاموش ہو گئی اور نم آنکھوں کے ساتھ عاصم کو ایمبولینس میں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''اب میں بھی چلتا ہوں، خدا حافظ'' ڈاکٹر دانش کہہ کر گاڑی میں بیٹھے اور ڈرائیور کو چلنے کو کہا۔

فریحہ کا دل بری طرح بے تاب ہونے لگا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے لگی۔

''بی بی...... رو...... کیوں رہی ہو...... اس کے لئے دعا کرو...... خدا اس پر کرم کرے گا'' اماں نے فریحہ کو روتے دیکھ کر کہا۔

''اماں...... نجانے کیوں...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے...... اماں کہیں میں نے اپنا بچہ اس شخص کے حوالے کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی...... میں نے تو اس پر کبھی اعتبار کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا'' فریحہ نے اپنے دل میں جنم لینے والے خدشات کا ذکر اماں سے کیا۔

''بی بی...... تم غم نہ کرو...... وہ اس کا باپ ہے...... اور خون میں بڑی کشش ہوتی ہے...... اپنے بچے کو تکلیف میں کون سے ماں باپ دیکھ سکتے ہیں...... تو فکر نہ کر...... بس دعا کر......'' اماں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس نے عاصم کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا خالی کمرہ اس کے نہ ہونے کے احساس سے اسے دوچار کر رہا تھا اور یہ احساس اس کے لئے بہت جان لیوا تھا۔ عاصم کبھی اس سے جدا بھی ہو گا...... یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ تو ابھی تک اس کی آغوش میں سر رکھ کر سوتا تھا اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر اسے جو ٹھنڈک...... سکون اور خوشی ملتی تھی۔ پوری کائنات میں اس کا نعم البدل کوئی نہ تھا۔ عاصم اس کی تنہائیوں کا ہمراز تھا۔ اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس کی ممتا کی تسکین تھا۔ عاصم اس کی زندگی کی سب سے بڑی امید اور سہارا تھا۔ وہ عاصم کے لئے کیا محسوس کرتی تھی۔ دنیا کا کوئی دوسرا شخص کبھی بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھی۔ دوسروں کے لئے وہ ایک بے کار وجود تھا...... ناکارہ انسان...... جس کی زندگی میں کوئی contributions نہیں تھیں...... ایک نیم مردہ رینگتا ہوا کیڑا...... جسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے...... اس کی زندگی کسی کے لئے اہم ہے بھی یا نہیں...... اس کی نہ موت سے کسی کو فرق پڑتا ہے اور نہ ہی زندگی سے...... مگر پھر بھی زندگی کے phenomenon میں اس کی کہیں نہ کہیں ضرورت ضرور ہوتی ہے...... عاصم بھی فریحہ کی زندگی کے لئے

بہت ضروری تھا۔اسے دیکھ کر......اسے چھو کر اور اسے محسوس کر کے......فریحہ کا اندر متحرک ہو جاتا تھا......اس کے اندر زندہ رہنے کی امید اور لگن پیدا ہونے لگتی تھی۔اس کی آنکھوں کے سامنے عاصم کی زندگی کا ایک ایک پل گزرنے لگا......اور اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے۔ اس کی نظریں لاؤنج کی دیوار پر لگے کلاک پر تھیں۔وہ دو گھنٹوں کے گزرنے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی......اس سے تو چند منٹ گزارنے مشکل ہو رہے تھے......دو گھنٹے کیسے گزار پائے گی دو گھنٹے......ڈاکٹر دانش نے دو گھنٹوں کا اسے کیوں کہا تھا......دو گھنٹوں میں کیا خاص بات تھی؟ایک دم اس کا ذہن متحرک ہو کر سوچنے لگا......اور وہ بے حد پریشان ہونے لگی......اس کے دل میں وسوسے جنم لینے لگے......وہ جتنا زیادہ اس کے بارے میں سوچتی اتنی ہی زیادہ پریشان ہونے لگی......

''اماں......میں ہاسپٹل جا رہی ہوں......میں مزید انتظار نہیں کر سکتی......میرا دل بہت گھبرا رہا ہے''فریحہ نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور گاڑی کی چابیاں لے کر باہر نکل گئی۔

اماں حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

عاصم کے برین کو senseless کیا گیا تھا اور وہ بے حس و حرکت ان کے سامنے آپریشن تھیٹر میں اسٹریچر پر پڑا تھا۔ڈاکٹر دانش نے تمام سٹاف کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور سب حیران بھی ہو رہے تھے۔

''ڈاکٹر دانش......میرا خیال ہے یہ پہلا مریض ہے جو پیدائشی ابنارمل ہے اور جس پر آپ پہلی بار اپنی ویکسین ٹرائی کریں گے......کیا اس کے لئے اس کے ٹیسٹ لینے ضروری نہیں؟ ڈاکٹر دانش کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ماجد نے عاصم کے معصوم چہرے کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ......میرا بیٹا ہے اور اس کے ٹیسٹ میں کر چکا ہوں......آپ بھی باہر جائیے......مجھے بہتر معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔مجھے اپنے کام میں نہ تو کسی کی مداخلت پسند ہے اور نہ ہی مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے''ڈاکٹر دانش نے قدرے روکھائی سے کہا تو ڈاکٹر ماجد خاموش نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر دانش نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور عاصم کی جانب دیکھنے لگے......اور......پھر کلاک کی جانب......اس کے برین کو senseless کیے کافی ٹائم گزر گیا تھا۔انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ عاصم کی جانب دیکھا اور مختلف انجکشنز سے ایک ویکسین تیار کی اور اپنی تیار کردہ ویکسین میں اس کو مکس کر کے اسے انجکشنز کے ذریعے لگا دی۔

عاصم نے ایک دو بار جھٹکے لیے......ڈاکٹر دانش بغور اس کی جانب دیکھتے رہے......اس کے جھٹکوں میں اضافہ ہونے لگا......اور اس کے اندر عجیب سا اضطراب پیدا ہونے لگا......اس کے بے حس و حرکت وجود میں حرکت سی پیدا ہونے لگی۔عاصم نے نیم بیہوشی میں اپنے ہاتھ پاؤں مارے اور اس کے چہرے اور جسم پر پسینہ آنے لگا۔ڈاکٹر دانش کی نظریں کلاک پر تھیں۔

فریحہ بے تابی سے آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''اندر جانا منع ہے......ڈاکٹر صاحب آپریشن تھیٹر میں مصروف ہیں......آپ باہر بیٹھ کر انتظار کریں''ایک نرس نے اسے قدرے درشت

لہجے میں کہا۔

''انتظار......''اس نے بے بسی سے کہا اور نم آنکھوں کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''کتنا مشکل ہوتا ہے انتظار کرنا......ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل اذیت بن جاتا ہے......نجانے ہم انسانوں کی زندگیوں میں اتنا انتظار کیوں لکھ دیا گیا ہے......انتظار سے کس قدر اضطراب جنم لیتا ہے......یہ تو انتظار کرنے والے کو معلوم ہوتا ہے......یہ کتنا روح فرسا اور تکلیف دہ ہوتا ہے......نجانے کب میں اپنے بیٹے کو دوبارہ دیکھ سکوں گی۔اس نے انتہائی مضطرب اور بے قرار ہوکر سوچا۔اس کا دل عجیب اضطراری کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کرے۔ایسا کرے جو اس کے دل کو سکون دے......وہ سب کو دروازے پرسے دھکے دے کر آپریشن تھیٹر کے اندر جانا چاہتی تھی وہ ایسا کرنا چاہتی تھی مگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ بہت مجبور اور بے بس تھی......اور ایسے مجبور لمحوں کی بے بسی انسان پر اس کی اوقات ظاہر کرتی ہے......اسے اپنی حیثیت بتاتی ہے کہ وہ کتنا لاچار ہے اور اپنے لئے بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتا۔انتہائی بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور اس نے آہ بھر کر کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کی طرف دیکھا......وسیع نیلگوں آسمان کی جانب دیکھتے ہی اندر کے پھپھولے پھٹ گئے اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''دلوں کا درد......ذہنوں کی اذیتیں......اور جسموں کی تکلیفوں سے صرف تو آشنا ہے۔میرے پریشان اور مضطرب دل کی آواز سن لے اور......میرے عاصم کو......''اس کی سوچ ادھوری رہ گئی اور ایک دم آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔اک کھلبلی سی مچ گئی۔فریحہ بھاگ کر دروازے کی جانب لپکی۔اس کے اوسان خطا ہونے لگے اور چہرہ زرد پڑنے لگا۔اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ایک مردہ اسٹریچر اس کے پاس سے گزرا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔اس نے کسی سے کچھ پوچھنا چاہا مگر اس کے لب یوں جامد ہوگئے جیسے ان میں کوئی حرکت ہی نہ ہو......وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاش کی جانب دیکھنے لگی جس کا سارا چہرہ اور جسم سفید چادر سے ڈھکے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر دانش آپریشن تھیٹر سے باہر نکلے۔فریحہ نے بے قراری سے ان کی جانب دیکھا۔

''دانش......عاصم......ک......ک......کہاں......ہے؟''وہ بے قراری سے اٹک اٹک کر بولی۔

''سوری......ہی......از......نو......مور......ویکسین کا اس کے جسم پر بہت برا اثر ہوا......مجھے بہت امید تھی......مگر......''ڈاکٹر دانش نے کندھے اچکائے۔ان کے چہرے پر کوئی دکھ اور ملال نہیں تھا۔

''کیا......میرا عاصم اب اس دنیا میں نہیں؟''اس نے انتہائی حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''نہیں''ڈاکٹر دانش نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

''تم......جھوٹ بولتے ہو......تم جھوٹے ہو......تم نے جان بوجھ کر اسے مارا ہے......میرا دل کہتا ہے......تم جھوٹے، کمینے، مکار اور دھوکے باز انسان ہو......میں تم سے دھوکہ کھا گئی جو تم پر اعتبار کیا''وہ چلانے لگی......اور سسکنے لگی۔

''اس میں تمہاری غلطی ہے میری نہیں''ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا تو فریحہ کا خون غصے سے کھولنے لگا اس کے

اندر گویا آگ سی لگ گئی۔ اس نے پاس پڑی کرسی اٹھا کر زور سے ڈاکٹر دانش کے سر پر دے ماری۔ وہ وہیں فرش پر گر گئے اور ان کے سر سے خون بہنے لگا۔ ہاسپٹل کا سارا اسٹاف وہاں اکٹھا ہو گیا مگر فریحہ سب کو چھوڑ کر عاصم کی لاش کے پاس پہنچ گئی جو بالکل بے یار و مددگار پڑی تھی۔ کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ چادر اس کے چہرے سے ہٹائی۔ اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور آنکھیں بالکل بند تھیں۔

''عاصم......'' وہ زور سے چیخ مار کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی...... اس کی زندگی کا سہارا اس کی امید اس کی زندگی کا محرک سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

''میں...... میں...... تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی...... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے......'' فریحہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے عاصم کا پوسٹ مارٹم کرایا تو رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ اس کو زہر کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ اس کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس شخص نے اس ابنارمل اور نیم مردہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار کر فریحہ کو زندہ درگور کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے اس کی زندگی ہے اس کی امید ہے...... اس کی خوشی ہے اور زندگی کی حرارت ہے...... اور اس نے فریحہ سے جان بوجھ کر سب کچھ چھین کر اسے خالی کر دیا تھا......

اس نے ڈاکٹر دانش کے خلاف مقدمہ درج کرانا چاہا مگر وہ خود ہاسپٹل میں پڑے تھے۔ کرسی سر پر لگنے سے ان کے دماغ کا انتہائی حساس آپریشن ہوا تھا...... اور ابھی وہ بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹر ان کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں تھی...... اور یہ مقدمہ فریحہ کے خلاف بھی درج کرایا جا سکتا تھا اس لئے اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

عاصم کے چلے جانے سے اس کی زندگی میں گہرا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے رک سی گئی تھی...... کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عاصم کے چلے جانے سے اسے بالکل فراغت مل گئی ہو...... کرنے کو کوئی کام نہ رہا ہو...... وہ سارا وقت خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہتی...... اس کا دل کتنا روتا...... کتنا تڑپتا...... کسی کو بھی احساس نہ ہوتا رو رو کر اس کی آنکھوں میں سوزش پیدا ہو گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے...... اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اماں اسے بہت سمجھاتی...... مگر وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہتی۔ اس کا کسی سے کوئی بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت عاصم کے کمرے میں گھسی اس کے کپڑوں کو بار بار نکال کر تہہ لگاتی۔ پھر انہیں وارڈروب میں رکھتی پھر نکالتی...... پھر انہیں خراب کرتی اور پھر انہیں تہہ لگاتی...... سارا وقت یہی کچھ کرتی رہتی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ امریکہ سے فریحہ کے والدین آئے اور اسے کچھ روز کے لئے ہاسپٹل ایڈمٹ کرا دیا۔ عاصم کے جانے کے بعد وہ ایک رات بھی نہیں سوئی تھی۔ مسلسل جاگنے سے اس کا ذہن بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی...... ڈاکٹروں نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا اور گھر میں ہر طرف اسے عاصم دکھائی دیتا رہتا...... اس لئے انہوں نے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرا دیا۔ چند روز وہ ہاسپٹل میں رہی۔ ڈاکٹروں نے اسے نیند کے انجکشنز دے کر سلایا تھا......

کچھ روز بعد وہ ہاسپٹل سے گھر آئی تو قدرے بہتر تھی...... مگر بہت خاموش...... حیرت سے ہر شے کو دیکھتی رہتی...... اس کے ماں باپ اس کی بہت دلجوئی کرتے اور دونوں نے اسے زبردستی آفس بھیجا تاکہ اس کا کام میں دل لگے۔ وقت آہستہ آہستہ اس کے زخم کو مندمل کرنے لگا۔ عاصم ایک یاد بن کر اس کی روح میں سرایت کر گیا...... درد بن کر دل میں ٹھہر گیا تھا...... جس سے فرار ممکن نہیں تھی۔

ایک ماہ بعد اس کے ماں باپ واپس امریکہ چلے گئے...... وہ قدرے بہتر ہوگئی تھی...... اس نے کچھ نئے پراجیکٹس بھی لینے کا سوچا تھا۔ زندگی اپنے معمول پر آنے لگی تھی مگر اس سارے عرصے میں شیر افگن ایک بار بھی اس کو ملنے نہیں آیا تھا...... نہ کوئی فون کیا تھا اسے اس کے رویے پر حیرت بھی ہوتی اور پریشانی بھی...... عاصم کے بعد شیر افگن اس کے دل میں بسا تھا جس نے اس سے محبت کے بہت دعوے کئے تھے...... جس کو کامیاب عورتیں پسند تھیں...... اور جن کا وہ بہت معترف ہوتا تھا...... وہ فریحہ کی صلاحیتوں کا دل و جان سے مداح تھا مگر اب وہ کہیں غائب ہوگیا تھا۔

فریحہ آفس میں بیٹھی اخبار کھول کر اسے پڑھنے میں مصروف تھی...... اچانک ایک خبر پر اس کی نظر ٹک گئی اور اس سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ حیران کن نگاہوں سے خبر پڑھنے میں مصروف تھی۔

"شیر افگن نے ڈاکٹر دریہ سے شادی کر لی تھی" اس کا دل پھٹنے کو بے تاب تھا۔ اس نے اخبار لپیٹ کر رکھی پھر اسے کھولا...... اور...... پھر پڑھنے لگی...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... ایک بار پھر اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ ایک بار پھر اس کا سب کچھ چھن گیا تھا...... وہ کافی دیر سکتی رہی...... اور پھر ہمت کر کے شیر افگن کو فون کیا...... ایک بیل جانے کے بعد اس نے فون بند کر دیا......

"اسے کیا کہوں...... کہ...... اس نے...... مجھ سے......"

"نہیں...... میں اپنی اتنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی......" اس نے آہ بھر کر سوچا۔ تھوڑی دیر بعد شیر افگن کا فون آ گیا۔

"مجھے معلوم تھا...... تم ضرور فون کرو گی...... بہت کچھ جاننے کے لئے فریحہ...... میں ایک بدکار عورت کے ساتھ کبھی شادی نہیں کر سکتا تھا...... سوری" شیر افگن نے قدرے حقارت سے کہا۔

"بدکار عورت......" وہ حیرت سے بڑبڑائی۔

"ہاں...... یہ سنو...... اور اس کے علاوہ بھی تمہارے خلاف بہت سے ثبوت میرے پاس ہیں"

"ہاں...... یہ سنو...... اپنے الفاظ" اور شیر افگن نے ریسیور کے ساتھ موبائل آن کر کے لگایا۔ اس میں اس کے اپنے کئے ہوئے الفاظ کی بازگشت تھی جو اس نے ڈاکٹر دانش سے کہے تھے جب وہ اس کے گھر پناہ لینے آئے تھے۔

"ہاں...... میں بدکار عورت ہوں" اپنے الفاظ سن کر اس نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"تم...... اس قدر گھٹیا...... کمینے اور سازشی ذہن کے انسان بھی ہو سکتے ہو...... جس نے مجھے ہر طرح سے تباہ کرنے کی کوشش کی ہے...... مجھے اندر سے خالی کر کے رکھ دیا ہے" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی...... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اندر سے سارے لطیف جذبے، احساسات، محسوسات، محبتیں اور چاہتیں ختم ہو رہی ہوں۔ وہ بالکل کھوکھلی ہوگئی ہو...... اندر سے بالکل خالی...... خالی پن کا احساس اسے اندر ہی اندر ختم کرنے لگا جیسے وہ کوئی مردہ ہو۔ ایک کھوکھلا مٹی کا مجسمہ جس میں نہ حرارت ہو اور نہ ہی حرکت اور یہ سب کچھ اس سے اس شخص نے چھینا تھا جس پر اس نے اعتبار کر کے اپنا سب کچھ اسے سونپا تھا۔ انسان اس قدر گھٹیا بھی ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

(۱۹)

''جمی ،فردوس اور نرگس آٹھ دن شمی کے پاس رہ کر آئے تھے۔شمی نے ان کی بہت خاطر مدارت کی......اس کے ڈرائیور نے انہیں پورے شہر کی خوب سیر کرائی۔وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کے ساتھ تو نہ جا سکا مگر رات کو دیر تک وہ ان سے باتیں کرتا رہتا۔وہ ان کو واپس جانے نہیں دے رہا تھا مگر نرگس کا دل اپنے گھر سے اداس ہونے لگا تھا اور اسے مجبوراً انہیں اجازت دینا پڑی۔وہ جب سے گھر واپس آئیں تھیں جمی کا مزاج ان سے اکھڑا اکھڑا سا تھا۔وہ بات بے بات فردوس سے الجھنے لگتا......چھوٹی سی بات سے بحث شروع ہوتی جو تو تکرار اور جھگڑے پر ختم ہو جاتی۔نرگس درمیان میں آ کر صلح کراتی تو بات ختم ہوتی اور دونوں ایک دوسرے کو گھور کر رہ جاتے۔جمی غصے میں گھر سے باہر نکل جاتا اور فردوس اسے گالیاں دیتی رہ جاتی۔فردوس اور جمی رات کو ایک محفل سے دیر سے لوٹے تھے۔کسی کی شادی پر گانے بجانے کی محفل رات دیر تک گرم رہی۔پو پھٹنے کے قریب تھی جب وہ گھر لوٹے اور آتے ہی سو گئے۔

''اے جمی......اٹھ رے......جا کر دودھ لا......چائے بنا کر پیوں......کمبخت ماری......سر کی درد چین نہیں لینے دے رہی'' فردوس نے جمی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جا......جا کر خود لے آ......تجھے کون سا راستہ نہیں آتا......میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں'' جمی غصے سے بولا۔

''اے......جمی تو کیسی باتیں کرنا شروع ہو گیا ہے کمبخت......'' نرگس نے غصے سے کہا۔

''ہاں......تم میری ذمہ داریاں نہیں ہو......جاؤ جا کر اپنا کام کرو......اگر میں یہاں رہتا ہوں اور کھاتا ہوں تو کما کر بھی دیتا ہوں......مفت میں تم لوگ مجھے کچھ نہیں دیتیں......سمجھی تم......'' جمی غصے سے بولا۔

''نامراد......یہ تو کیسی زبان بولنا شروع ہو گیا ہے......تجھے کیا ہو گیا ہے......ارے تیری نظریں کیوں بدل رہی ہیں۔میں دیکھ رہی ہوں......ہم جب سے شامو سے مل کر آئے ہیں تو بڑا اکھڑنے لگا ہے......ارے......کیا ہوا ہے تجھے؟'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''ہاں......بدمزاج ہو گیا ہوں......وہ تم لوگوں سے جا کر اچھا ہو گیا......اس کے ٹھاٹ بن گئے......وہ باؤ بن گیا......تم لوگوں کے پاس رہتا تو میری طرح تم لوگوں کی جوتیاں ہی اٹھا رہا ہوتا......تم لوگوں کے نازنخرے اٹھا رہا ہوتا۔اس کی قسمت اچھی تھی جو یہاں سے چلا گیا'' جمی غصے سے بولنے لگا۔

''ارے......تو کہنا کیا چاہتا ہے......؟کمبخت بول کیا کہنا چاہتا ہے کہ ہم منحوس ہیں......ہمارے سائے سے دور گیا تو وہ ترقی کر گیا......مجھے لگ رہا ہے تو ہم سے اکتا گیا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بتا دے'' نرگس نے کہا۔

''ٹھیک ہے......تو سنو......کمائی میں اور فردوس کریں......تو مزے سے گھر بیٹھ کر اپنا حصے لے لے......میں کوئی تمہارا نوکر ہوں جو تمہیں بھی کھلاؤں......میں نے کوئی تمہارا ٹھیکہ نہیں لے رکھا......میں یہاں سے جا رہا ہوں......مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ......میں بھی شامو کی طرح ترقی کرنا چاہتا ہوں'' جمی نے انتہائی بے رخی سے ترش لہجے میں کہا۔

فردوس اور نرگس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ،نرگس اس کی بات سن کر رونا شروع ہو گئی۔

جمی کمرے میں گیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔رات کی کمائی کا آدھا حصہ اپنی جیب میں ڈالا اور بیگ پکڑ کر صحن میں آ گیا۔اس نے روتی ہوئی نرگس اور فردوس کی طرف دیکھا۔

''میں جا رہا ہوں......'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اری فردوس......یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں کتنی بدنصیب ہوں جسے چھوڑ کر سب جا رہے ہیں۔پہلے شامو چلا گیا......پھر میرا بچہ اور اب جمی......بھی چلا گیا......کیا تو بھی جانا چاہتی ہے؟ تو بھی بتا دے'' نرگس نے روتے ہوئے کہا۔

''ارے آپا......کیسی باتیں کر رہی ہے......میرا جینا مرنا تیرے ساتھ ہے میں تجھے چھوڑ کر بھلا کہاں جاؤں گی......اچھا ہوا یہ جمی نامراد چلا گیا......ہر روز جھگڑنے لگا تھا......آپا اس نے چلے ہی جانا تھا......یہ سب اس نے بہانہ بنایا ہے......جب سے یہ شامو کے گھر سے آیا ہے......اس کی دولت دیکھ کر اس کے پیٹ میں خواہ مخواہ مروڑ اٹھنے لگے ہیں......تو نے دیکھا نہیں......کیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا......دفعہ کر......تو فکر نہ کر......میں ہوں نا تیرے پاس'' فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تو نرگس اونچی آواز میں رونے لگی۔

''فردوس......انسان کا دکھ انسان ہی سمجھ سکتا ہے......مگر ہمارا دکھ کوئی نہیں سمجھتا سوائے ہمارے......'' نرگس نے آہ بھر کر کہا اور اپنے میلے کچیلے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''پتہ نہیں آپا......ہم ادھورے انسانوں کی اس دنیا کو بھلا کیا ضرورت تھی......پتہ نہیں......دنیا کا کونسا خانہ ہم نے پر کرنا ہوتا ہے جو رب ہمیں دنیا میں بھیج دیتا ہے۔لوگوں کا مذاق سہنے کو......دھکے اور ٹھوکریں کھانے کو فردوس نے آہ بھر کر کہا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''میں بھی یہی سوچتی رہتی ہوں......مگر جواب کوئی نہیں ملتا......'' نرگس نے کہا تو دونوں خاموش ہو گئیں۔

''میرا ابے بی زندہ ہوتا......تو......مجھے اس جمی کے جانے کا ذرا دکھ نہ ہوتا......ابھی تو میں بے بی کو بھول نہیں پا رہی......اس کمبخت کو کیسے بھولوں......فردوس اس نے ہمارے مشکل وقتوں میں بڑا ساتھ دیا۔پتہ نہیں اسے اچانک کیا ہو گیا......کیسے بدل گیا......ہمیں چھوڑ کر جانے کا اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا......اور جاتے ہوئے مل کر بھی نہیں گیا......'' نرگس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آپا تم ٹھیک کہہ رہی ہو......اچھا بھلا تھا......پتہ نہیں کیوں بدل گیا خیر تو اب فکر نہ کر......کسی جانے والے کو بھلا کون سے روک سکتا ہے......میرے سر میں تو پہلے ہی بہت درد ہو رہی ہے......میں دودھ لے کر آتی ہوں......رونا مت......ٹھیک ہے اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو ہمیں

بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں'' فردوس کہہ کر گھر سے باہر نکل گئی اور نرگس چارپائی پر لیٹ گئی...... نیلے آسمان کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''ربا...... تو...... آہستہ آہستہ سب کو مجھ سے کیوں چھین رہا ہے؟ تو نے ہم بدنصیبوں کو کیسا انسان بنایا ہے...... جن کو کوئی نہیں اپناتا ہمارے اندر تو...... تو نے رشتوں کی بھوک ڈال دی مگر اس بھوک کو مٹانے کا کوئی سامان نہیں کیا۔ ہم کٹی پتنگوں کی طرح ماری ماری ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں...... جس کے ہاتھ پتنگ آئی اس نے اس سے دل بہلایا اور پھر پھاڑ کر پھینک دیا...... رشتوں کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے۔ کتنا دل تڑپتا ہے ہمارا بھی کوئی اپنا ہو...... جو ہمارا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرے...... کسی کے خون میں ہمارے لئے کشش ہو...... کوئی ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے...... کوئی ہمیں اولاد کی طرح پیار کرے اور کسی کو ہم اولاد جیسی محبت دیں...... رشتوں کا دکھ سکھ محسوس کریں...... مگر ہمیں تو تو نے بڑا ہی محروم رکھا ہے ہم تو تیری دنیا میں مجرم بن کر زندگیاں گزارتے ہیں...... پتہ نہیں کونسا جرم کیا ہے جس کی اتنی کڑی سزا تو نے ہمیں دے دی ہے......

ربا تو نے کیوں ایسا کیا......؟ نرگس کے دل میں ابال سا اٹھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... تجھے ہمارے آنسوؤں پر ذرا ترس نہیں آتا...... تجھے ذرا دکھ نہیں ہوتا...... جب لوگ ہمیں دھکے مارتے ہیں...... جب ہمارا مذاق اڑاتے ہیں...... کیا تو بھی ہم پر ہنستا ہے...... تو کیسا رب ہے...... جو ہمارے دکھ کو ذرا بھی محسوس نہیں کرتا......'' نرگس گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی اور خدا سے شکوے کرنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر روتی رہی اور پھر اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ ایک بوسیدہ سے پلنگ پر جمی کی ایک دو پرانی قمیصیں پڑی تھیں وہ انہیں ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی...... اور انہیں چوم کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

''جمی کو بھی میں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھی...... وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔''

''اسے بے بی یاد آنے لگا اور وہ لوہے کے ٹرنک میں سے بے بی کے کپڑے اور کھلونے نکال کر دیکھنے لگی۔ انہیں والہانہ انداز میں چومنے لگی...... اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے...... اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اسے اپنے پیچھے سے ہلکی سی آواز آئی......

''اماں...... اماں''

''اماں صدقے...... واری...... میرا بچہ...... میرا بے بی...... کہاں ہے تو......؟'' وہ فرط جذبات سے لبریز آنکھوں اور آواز کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگی۔

''بے بی...... بے بی...... میرے بچے...... کہاں ہے تو......؟'' وہ پکارتی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی صحن میں رکھی لوہے کی سیڑھی سے ٹکرائی اور لڑکھڑا کر زمین پر گری تو سیڑھی اس کے اوپر گر گئی۔ سیڑھی کا ٹوٹا ہوا ڈنڈا اس کے سر پر لگا اور ایک دم خون کا فوارا سا نکلنے لگا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''بے بی...... تو کہاں ہے...... جانا مت...... میں...... میں...... آ رہی ہوں'' وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد فردوس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''آج شہر میں دودھ کی ہڑتال تھی، بڑی مشکل سے ایک دکان سے ملا ہے'' فردوس دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے خود ہی بولتی جا

رہی تھی۔ایک دم اس نے اپنے قدموں کے پاس بہتے خون کو دیکھا اور خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی...... پیچھے مڑ کر دیکھا اور چلانے لگی۔

''آپا......آپا......یہ......تجھے کیا ہوا ہے......؟'' اور جلدی سے سیڑھی ہٹا کر پیچھے کی۔

''ہائے......میری آپا......تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے اس کی سانس محسوس کی اور ہمسایوں کی منت سماجت کر کے اسے ہسپتال لے گئی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی حالت بہت خطرناک ہے......اس کا خون بہت بہہ چکا ہے......فردوس نے جلدی سے شامو کو اس کے موبائل پر فون کر کے بتایا اور اس سے پہنچنے کو کہا......فردوس کا دل چاہ رہا تھا کہ جمی کو بھی اطلاع دے مگر کہاں......؟ اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا......فردوس اکیلی ادھر ادھر بھاگتی رہی......نرگس کے لئے دوائیں اکٹھی کرتی رہی۔

''انہیں خون کی اشد ضرورت ہے......؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''خون......؟'' اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

''ہاں......ان کا بہت زیادہ خون بہہ چکا ہے......اور انہیں خون کی بہت ضرورت ہے'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''آ......پ......میرا خون لگا دیں......سارے کا سارا'' وہ بدحواس ہو کر بولی۔

''ٹھیک ہے آپ چیک کرا لیں۔اگر آپ کا بلڈ گروپ ملتا ہے تو یہ اچھی بات ہو گی'' ڈاکٹر نے کہا۔

مگر اس کا بلڈ گروپ نرگس کے بلڈ گروپ سے نہیں ملتا تھا۔وہ سن کر پریشان ہو گئی۔

''اب......کیا ہو گا؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

ہم کوشش کر رہے ہیں......جیسے ہی کوئی بلڈ دینے پر آمادہ ہوتا ہے......ہم ان کو بلڈ لگا دیں گے'' ڈاکٹر کے لہجے میں مایوسی تھی۔ہمیں کون اپنا خون دے گا......ہمارے تو سائے سے لوگ دور بھاگتے ہیں'' اس نے آہ بھر کر سوچا اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کرنے لگی۔

ایک دو نوجوان بلڈ دینے کے لئے آئے مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کا خون کسی ہیجڑے کو لگنا ہے تو وہ منہ بسورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ڈاکٹر نے بھی بہت سے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا۔فردوس نے ان کی منتیں کیں مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلے گئے......فردوس روتی رہی......سسکتی رہی اور شامو کو فون کیا۔وہ پہنچنے والا ہی تھا۔اس نے اس کو بہت تسلیاں دیں۔نرگس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ڈاکٹر مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا مگر نرگس کی سانس اکھڑنے لگی......فردوس گھبرا گئی کبھی ہسپتال سے باہر بھاگ کر شامو کو دیکھنے جاتی،کبھی اندر جا کر نرگس کو دیکھتی۔

شامو آیا......تو وہ اسے لے کر اندر آئی......مگر نرگس دم توڑ چکی تھی۔فردوس شامو کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔

''میرا بلڈ گروپ......آپا سے ملتا تھا......کاش وہ میرا انتظار کر لیتی'' شامو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے جیسے کوئی تماشا دیکھ رہے ہوں۔

نرگس کو دفنانے کے بعد شامو ایک دن وہاں رہا۔اس گھر میں بیٹھ کر فردوس کے ساتھ پرانی یادوں کو تازہ کرتا رہا۔اس نے فردوس کو اپنے

ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ نہ مانی پرانے شہر میں آکر کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسے رانی یاد آنے لگی جو اس کے ناچ گانے کو پسند کرتی تھی۔ اس کی کمائی کو حرام سمجھتی تھی اور جس کی چاہت میں اس نے ناچ گانا چھوڑ کر محنت کا راستہ اپنایا تھا...... اور آج اس مقام تک پہنچا تھا کہ کئی لوگ اس کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

نادانستہ اس کے قدم رانی کی بستی کی طرف اٹھ گئے۔ چار پانچ سالوں میں جھگیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ حلیے سے امیر نوجوان لگتا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ رانی کہاں رہتی ہو گی۔ اس نے ایک لڑکے سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ نوری ادھر سے گزری تو اس نے اس سے پوچھا۔

''رانی تو مر چکی ہے......'' نوری نے کہا تو شامو کے قدموں کے نیچے سرزمین سرکنے لگی۔

''ک...... کب......؟'' وہ بمشکل بولا۔

''معلوم نہیں...... اس کی ماں سے پوچھ لے'' اور نوری اسے برکتے کے پاس اس کی جھگی میں لے گئی۔

''یہ...... رانی کا پوچھ رہا ہے'' نوری نے شامو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جھگی میں برکتے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''رانی کا نام سن کر برکتے کی آنکھیں چمکنے لگیں...... نوری جھگی سے باہر نکل گئی اور برکتے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا تجھے...... میری رانی نے بھیجا ہے؟'' برکتے نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''کیا...... وہ زندہ ہے؟'' شامو نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''تو...... پھر کہاں ہے؟'' شامو نے حیرت سے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... میری رانی کہاں چلی گئی ہے...... مجھے چھوڑ کر'' برکتے رونا شروع ہو گئی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ وہ کہاں چلی گئی؟'' شامو نے پوچھا۔

''ملکا...... کہتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی...... مگر میرا دل نہیں مانتا، میری رانی ایسی نہیں تھی...... پتہ نہیں کہاں گم ہو گئی ہے'' برکتے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی اور اسے اپنے دکھ اور پریشانیاں بتاتی رہی۔ شامو نے جیب میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر اسے تھمائے کہ وہ ان روپوں سے اپنا علاج کرا لے...... اور ضرورت ہوئی تو وہ اور بھیج دے گا۔ اس نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا کہ وہ اس کے نمبر پر فون کر سکتی ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اسے رانی کے کھو جانے کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کا بہت کچھ چھن گیا ہو...... نرگس...... رانی...... اور استاد جمالا...... وہ لوگ جن سے وہ بہت محبت کرتا تھا...... مگر وہ ساری محبتیں اب اس سے روٹھ چکی تھیں۔ وہ ٹوٹے دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔

☆

رمضو اور گڈی کے درمیان ہر روز جھگڑا ہوتا تھا۔ گڈی اسے اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی اور طنزیہ انداز میں رمضو پر ہنستی تھی۔ رمضو کو غصہ آجاتا اور وہ گڈی کی پٹائی شروع کر دیتا۔ شادی کے کئی ماہ بعد بھی دونوں کا یہی معمول تھا۔ گڈی اسے طلاق کو کہتی اور وہ تین ہزار واپس کرنے کو کہتا جو ملکے نے اس سے لیے تھے اور ان تین ہزار روپوں میں ملکے اور بھاگی نے جی بھر کر عیش کی تھی۔ وہ پیسہ انہوں نے کھانے پینے، گھومنے پھرنے اور بھاگی نے اپنے کپڑے اور رنگ برنگی زیورات بنانے میں خرچ کیا تھا۔ گڈی موقع دیکھ کر ملکے کے پاس آتی اور وہ پیسہ واپس کرنے کو کہتی تا کہ اس کی جان چھوٹے مگر ہر بار ملکا اور بھاگی اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اور ذلیل کر کے نکال دیتے۔ وہ اپنی زندگی سے سخت تنگ آ گئی تھی اور اٹھتے بیٹھتے بھاگی اور رمضو کو گالیاں بکتی رہتی جن کی ملی بھگت سے وہ زندگی کا یہ عذاب سہہ رہی تھی۔

رمضو نے پھر رات کو اس کی پٹائی کی تھی اور وہ صبح سویرے روتی ہوئی ملکے کے پاس آ گئی وہ اور بھاگی بیٹھے چائے پی رہے تھے، اسے دیکھ کر غصے سے بڑبڑانے لگے۔

”اے..... تو پھر آ گئی ہے ..... جب تیری ایک بار سادی بنادی پھر کا ہے کو یہاں کے چکر لگاتی ہے ..... اپنے سوہر کے گھر ٹک کر رہ“ ملکے نے غصے سے کہا۔

”ابا..... تیرے جیسا جالم باپ بھی رب کسی کو نہ دے..... اس کلموئی چڑیل کے بہکاوے میں آ کر تو نے اپنی بیٹی کو بیچ دیا۔ ارے..... تو نے میری سادی نہیں بنائی تو نے مجھے بیچا ہے..... ابا میں کوئی بھیڑ بکری تھی ..... یا کوئی ٹوٹی چارپائی تھی جسے تو نے بیچ دیا..... آج میں پیسے لے کر جاؤں گی ..... وہ رجو مجھے تب ہی طلاق دے گا ..... جب میں اس کے پیسے دوں گی ..... “گڈی نے بھاگی کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اری بے سرم..... باپ کے سامنے طلاق کا نام لیتی ہے ..... اری ..... تیری جیسی دھی مر جائے تو بہتر ہے“ بھاگی نے گڈی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اے..... ہے ..... بڑی آئی مجھے سب بتانے والی ..... تو نے ہی سارے پیسے جم کیے ہیں ..... اسی لئے بڑبڑ بول رہی ہے ..... ابے کی آنکھوں پر تو نے ہی پٹی باندھ دی ہے..... اسے تو کچھ ٹھیک نجر ہی نہیں آتا..... “گڈی بھی اکڑ کر بولی۔

”آ..... ہا..... تیرا اباپ جیسے کا کا ہے نا ..... جسے میں انگلی پکڑ کر چلا رہی ہوں..... اری زمانے بھر کا چالاک ہے تیرا ابا..... خود ہی میرے پیچھے پڑا تھا..... بتا..... ملکے ..... اب بتا تا کیوں نہیں ..... تو نے ہی بولا تھا نا کہ بھاگی میں اب تیرے بغیر نہیں رہ سکتا“ بھاگی نے منہ چڑاتے ہوئے کہا تو ملکا کھسیا گیا۔

”اری..... حرام خورو..... بس کرو..... کیا بک بک کر رہی ہو..... اے گڈی ..... چل جا اپنے گھر واپس..... نہیں ہیں میرے پاس پیسے..... جب ہوئیں گے ..... رجو کو دے کر تجھے لے آؤں گا..... سویرے سویرے میرا مغج خراب نہ کر“ ملکا ٹالنے کے انداز میں خفگی سے بولا۔

”نہ ابا..... آج تو نہیں میں جانے کی ..... جتنی مار رات کو اس نے مجھے ماری ہے نا..... اس کے بعد تو نہیں جاؤں گی“ گڈی نے کہا۔

”تو..... نہ..... جا..... تیری مرجی..... “بھاگی نے کہا۔

''ابے نے سارا پیسہ تجھے کھلایا ہے...... ہر روز رنگ برنگی بوتلیں تجھے پلاتا تھا...... مٹھی مٹھی قلفیاں، جلیبیاں، مٹھیائی تو ہی کھاتی تھی نا اب دیکھ...... میں کیا کرتی ہوں......'' گڈی نے کہہ کر قریب پڑا ڈنڈا زور سے بھاگی کے سر پر مارا...... وہ تڑپنے لگی اور واویلا کرنے لگی۔ ملا زمین پر بیٹھا تھا اپنی بیساکھیوں کو سیدھا کر کے کھڑا ہونے لگا مگر اتنی دیر میں اس نے بھاگی کو ایک اور ڈنڈا مارا۔ مگر بھاگی نے ڈنڈا پکڑ کر اسے مارنا چاہا مگر گڈی نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا وہ تڑپنے لگی۔ ملا غصے میں آ گیا اور اپنی بیساکھی سے گڈی کو مارنے کی کوشش کی مگر گڈی صحت مند تھی اس نے بیساکھی سے باپ کو پیچھے دھکیلا وہ نیچے گر گیا۔

''ٹھہر جا...... تو...... حرام خور...... باپ پر ہاتھ اٹھاتی ہے، بے شرم...... تجھے کیڑے پڑیں......'' ملا اسے گالیاں بکنے لگا۔ بھاگی ہائے ہائے کر کے فرش پر گری تھی اسے توقع نہیں تھی کہ گڈی اسے مار بھی سکتی ہے۔ اچانک مار کھا کر وہ بوکھلا گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اب سر کو پکڑے بیٹھی تھی۔

''ابا...... اب میں جا رہی ہوں...... کل پھر آؤں گی اور اگر تو نے پیسے نہ دیئے تو تجھے، تیری جھگی اور بھاگی کو آگ لگا کر جاؤں گی...... سمجھا تو......'' وہ غصے سے کہہ کر نکل گئی اور ملا حیران و پریشان اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

''حرام جادی...... کتنی ہاتھ چھٹ ہو گئی ہے...... یہ تو ایسی نہ تھی...... رجو نے اسے بھی بدمعاش بنا دیا ہے'' ملا غصے سے بولا۔

''ارے...... میرا تو کچھ کر...... میرے سر کو کچھ ہو رہا ہے'' بھاگی غصے سے بولی۔

''تیرا کیا کروں...... تو نے ہی سارے پیسے خرچ کرا دیئے...... تیری فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں...... اب کل کی فکر کر...... وہ کل آ کر آگ لگا گئی تو کیا ہوگا...... اپنی نئی جھگی میں تو مٹھو اور بجو پہلے ہی نہیں گھسنے دیتے...... برکتے کو بھی تو نے ادھر سے نکال دیا...... اگر وہ جھگی کو آگ لگا گئی تو کہاں جائیں گے......؟'' ملکے نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا کیونکہ گڈی کے تیور اسے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

''ارے فکر کیوں کرتا ہے...... استاد فیقا بھکاریوں کے بچوں کو ٹھیکے پر خریدتا ہے...... تیرے اتنے ڈھیر بچے ہیں جا پپو اور مجو کو ٹھیکے پر دے آ۔ اس بلا کو تو سر سے ٹال......'' بھاگی نے کہا تو ملکے نے حیرت سے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو کیا چاہتی ہے...... تو کیا کہہ رہی ہے؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اچھی طرح جانتی ہوں...... ویسے بھی تو تیرے بچے بھیک ہی مانگتے ہیں۔ استاد فیقے سے پیشگی رقم لے لینا......'' بھاگی نے کہا۔

''استاد فیقا کتنا ظالم ہے...... بچوں کو کتنا مارتا پیٹتا ہے...... ان سے جس جس طرح بھیک منگواتا ہے تو نہیں جانتی...... میرا مجو تو ابھی بہت چھوٹا ہے'' ملکے نے کہا۔

''اور جو میرے پیٹ میں کاکا ہے...... اس کو تیری گڈی آگ لگا جائے تو تجھے منظور ہے...... تجھے اپنے بچوں کی فکر ہے...... میرے کی نہیں...... ارے میرا تو یہ پہلا بچہ ہے...... تیرے پاس تو پہلے ہی بہت ڈھیر ہے...... کیا ہے جو اس میں سے دو چلے جائیں گے''۔ بھاگی نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو ملکا سوچ میں پڑ گیا۔

وہ شام کو جھگی میں گیا تو بچے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے اب وہ بہت کم بچوں کے پاس آتا تھا۔ برکتے چارپائی پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اس

نے منہ پھیرلیا۔

''اے...... برکتے کیسی ہے تو؟''ملکے نے اس کے قریب کھڑے ہوکر پوچھا۔

''تیری بلا سے...... تو...... تو اپنی دلہن کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہے نا...... جالم...... تیرے جیسے باپ کو تو اللہ ہی پوچھے...... نہ بچوں کی فکر...... نہ بیوی کی...... اس عمر میں سادی بنالی...... بڈھا کھوسٹ......''برکتے غصے سے بولی۔

''اے...... آج تجھے بڑی جبان لگ گئی ہے...... خیر تو ہے''ملکا منہ بنا کر بولا۔

''چل ہٹ...... میں تیرے منہ نہ لگوں''اور برکتے نے منہ پھیرلیا۔

''ارے تم لوگ کیسے ہو؟ بجو...... مٹھو پپو اور مجو کہاں ہیں''ملکے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بار کھیل رہے ہیں''شبو نے جواب دیا۔

''میں ان کو باہر گھمانے لے کر جا رہا ہوں''ملکا کہہ کر باہر نکل گیا۔

''یہ آج ابے کو کیا ہو گیا ہے...... پپو اور مجو پر بڑا پیار آ رہا ہے......؟''مٹھو نے حیرت سے کہا۔

''ہو گا...... کوئی لالچ...... ہمارے ابے جتنا کمینہ بندہ اور کوئی نہیں ہو گا...... جہاں روپیہ نظر آتا ہے اسکے منہ سے پانی گرنے لگتا ہے......'' بجو غصے سے بولا۔

صبح گڈی نے ابے سے بہت لڑائی کی کہ رجو کے تین ہجار واپس کرے...... پھر وہ گھر واپس آئے گی''مٹھو نے بتایا۔

''کیا گڈی یہاں آ جائے گی؟''شبو نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہ تین ہجار ابے کے پاس ہوں گے اور نہ وہ آئے گی''بجو نے طنزاً کہا۔

برکتے ان کی باتیں سن رہی تھی۔اسے اپنے پاس پڑے پانچ ہزار یاد آئے۔

''تو...... کل گڈی کو بلا کر لانا......''برکتے نے جلدی سے کہا۔

''کیا...... تو اسے پیسے دے گی؟''مٹھو نے ہنستے ہوئے کہا تو برکتے خاموش ہو گئی۔

''ہاں...... میں اپنی دھی کو اس جالم سے چھڑواؤں گی''برکتے نے دل میں سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

☆

''استاد...... اپنے دو بچوں کو لایا ہوں...... ٹھیکے پر دینا ہے''ملکا استاد فیقے کے اڈے پر جا کر بولا۔

''کیوں...... کوئی نئی سادی بنائی ہے؟''استاد فیقا قہقہہ لگا کر بولا۔

''نہیں استاد...... بچے دھندا ٹھیک طرح سے نہیں کر رہے...... اور گھر میں بھوک ننگ بہت ہے...... روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی...... اتنے بچوں کو پالنا مشکل ہو رہا ہے''ملکے نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''مال تو دکھا......'' استاد فیقے نے کہا تو ملکا باہر سے بچوں کو لے آیا۔ بچے بہت سہمے ہوئے تھے۔ پپو پانچ سال کا اور مجو چھ سال کا تھا۔ وہ ڈر کر ملکے کے پیچھے چھپ گئے۔

استاد فیقے نے انہیں پکڑ کر ٹٹولا۔

''سکلوں سے ہی بھکاری لگتے ہیں...... چلیں گے...... بول کتنا لے گا......؟'' استاد نے ملکے سے پوچھا۔

''تو کتنا دے گا؟'' ملکے نے پوچھا۔

''1 ہجار مہینے کا...... پانچ پانچ سو......دونوں کا'' استاد نے کہا تو ملکا سوچ میں پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے...... تین ہجار پیشگی دے دے...... بڑی سخت ضرورت ہے......'' ملکے نے کہا۔

استاد نے اس کی طرف بغور دیکھا اور تین ہزار تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کو دے دیئے۔

''سکریہ......'' ملکے نے خوشی سے پیسے جیب میں رکھے۔

''ابا......ابا......ہمیں چھوڑ کر نہ جا......'' بچے بلکنے لگے۔ استاد نے ان کے ہاتھ زور سے پکڑے وہ رو رو کر چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔

استاد نے دونوں کو ایک ایک تھپڑ مارا...... اور وہ سہم کر بیٹھ گئے اور اپنی آوازیں روک کر سسکنے لگے...... ملکے نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور خوشی خوشی بھاگی کے پاس آ گیا۔

''کام ہو گیا؟'' بھاگی نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' ملکے نے کہا اور جیب میں سے پیسے نکال کر اسے پکڑا دیئے۔

''رات کو رجو آئے گا تو اسے دوں گا...... انہیں سنبھال کر رکھ'' ملکے نے کہا اور جھگی سے باہر نکل گیا۔

تین ہزار روپے پکڑ کر بھاگی کے منہ میں پانی آ گیا...... اس کے اندر کی ہوس اور لالچ سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ کچھ سوچ کر جھگی سے باہر نکل گئی اور پانچ سو کا نوٹ اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر اسے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

وہ نجو کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ نجو جھگیوں سے باہر اپنی بکری کو گھاس چرا رہی تھی۔

بھاگی اسے ایک طرف لے گئی اور اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازداری سے اسے پانچ سو کا نوٹ تھما دیا اور خوش خوش واپس لوٹ آئی۔

☆

''سجو...... پپو اور مجو ابھی تک نہیں لوٹے...... میرے دل کو کچھ برا لگ رہا ہے...... جا...... جا کر دیکھ، وہ کہاں ہیں؟'' برکتے نے پریشانی سے کہا۔

''اماں...... ابے کے ساتھ گئے ہیں...... کسی اور کے ساتھ تو نہیں...... جو تو فکر کر رہی ہے'' سجو نے جواب دیا۔

''پر...... دیر بہت ہو گئی ہے...... وہ ان کو کہاں لے گیا ہے...... میرا دل ڈوب رہا ہے...... جا...... جا کر بھاگی سے پوچھ کر آ...... اس کو پتہ

ہوگا'' برکتے نے کہا۔

''میں نہیں جا رہا...... '' نجو منہ بنا کر لیٹا گیا۔

''شبو...... جا...... تو...... پوچھ کر آ، برکتے نے شبو سے کہا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ برکتے کا دل ڈوب رہا تھا۔ وسوسے اور اندیشے اس کے دل کو ڈرا رہے تھے۔

''اللہ خیر کرے......'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ شبو بھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

''مٹھو...... شبو بھی نہیں آئی...... جا دیکھ...... وہ کہاں رہ گئی۔ پپو اور مجو بھی نہیں آئے'' برکتے نے پریشانی سے کہا۔

''آ جاتے ہیں...... کہاں جانا ہے؟'' مٹھو بھی منہ بناتے ہوئے بولا۔ شبو گھبرائی ہوئی جھگی میں داخل ہوئی۔

''اماں...... اماں...... وہ...... ابا کہہ رہا ہے...... پپو اور مجو گم ہو گئے ہیں'' شبو بدحواسی کے عالم میں اٹک اٹک کر بولی۔

برکتے گھبرا گئی اور سینے پر ہاتھ مارنے لگی۔

''ہائے...... میں مر گئی...... میرے بچے کہاں گم ہو گئے...... ملکا جھوٹ بول رہا ہے...... وہ جھوٹ بول رہا ہے'' برکتے چارپائی پر لیٹی زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بولی۔ اونچی آواز میں رونے اور چلانے لگی۔

''اماں حوصلہ کر...... میں ابے سے پوچھ کر آتا ہوں'' نجو کہہ کر باہر نکل گیا۔

''شبو جا تو گڈی کو بتا کر آ...... وہ رمضو سے کہہ کر انہیں ڈھونڈ لے گی...... جا...... میری دھی...... ورنہ میں مر جاؤں گی...... رات ہو رہی ہے اور میرے بچے تو کبھی بھی رات کو باہر نہیں گئے'' برکتے روتے ہوئے بولی تو شبو گھبرائی ہوئی باہر نکل گئی اور گڈی کی جھگی کی طرف گئی۔

اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے...... گڈی کی جھگی میں آگ لگی تھی۔ ہر طرف شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نجو لوگوں کے ساتھ مل کر پانی کی بالٹیاں آگ پر ڈال رہی تھی مگر آگ اور بھڑک رہی تھی۔

''گڈی...... گڈی کہاں ہے؟'' شبو نے بمشکل پوچھا۔

''ارے اس نے ہی تو اپنے آپ کو آگ لگائی ہے...... اندر ہی سڑ...... مر گئی ہو گی'' نجو غصے سے بولی۔

''کیا گڈی نے خود کو آگ لگائی ہے؟'' شبو نے روتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اس نے اپنے آپ کو بھی آگ لگائی اور جھگی کو بھی...... ہر روز رمجو سے لڑتی تھی۔ وہ اس کی مار کٹائی کرتا تھا...... کمبخت نے خود کو بھی آگ لگائی اور میرے گھر کو بھی......'' نجو پانی کی بالٹی ڈالتے ہوئے بولی۔

شبو کی سانس جیسے رکنے لگی اور آنسو شدت سے بہنے لگے...... وہ برکتے کو واپس جا کر کیا بتائے گی جو پہلے ہی پپو اور مجو کے لئے رو رہی ہے...... شبو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اور اسے ہر طرف گڈی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

''گڈی...... گڈی......'' وہ بدحواس ہو کر چلاتی ہوئی آگ کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے وہاں سے پیچھے ہٹایا۔

☆

ریتا بیگم کے رقص کی دھوم دور دور پھیلنے لگی تھی۔ وہ نگار بیگم سے زیادہ جلدی میں ترقی کا زینہ طے کر رہی تھی۔ اس میں وہی رعب، شان و شوکت اور تمکنت کا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا جو نگار بیگم میں دیکھ کر وہ مرعوب ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں طوائفوں کی ساری خصلتیں، باتیں اور رکھ رکھاؤ آنے لگا تھا۔ شروع کے چند ماہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر رات مجرا کرنے سے پہلے وہ دیر تک بیٹھی روتی رہتی تھی اور کسی مہمان کے ساتھ شب گزاری کے بعد وہ اپنے آپ کو کوستی اور ملامت کرتی رہتی تھی۔ سارا دن وہ دکھ اور غم سے نڈھال پڑی رہتی تھی مگر قدرت نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ جلد ہی اپنے ماحول اور اس کی روایات کا عادی ہونے لگتا ہے۔ رو رو کر اور غم کر کے وہ تھک چکی تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی راہ فرار تھی اور نہ ہی کوئی اور راستہ۔ سارے راستے اس بند گلی میں جا کر ختم ہو جاتے تھے جہاں وہ رہتی تھی۔ اور...... وہ اس بدنام زمانہ حویلی کی رہائشی تھی...... جہاں عورت محض کٹھ پتلی ہوتی ہے...... اور لوگوں کو اپنا تماشا دکھا کر خوش کرتی ہے...... اس کے وجود سے جیسے ہی شرافت، عزت اور عصمت رخصت ہوتی ہے اس کی طرف دیکھنے والی ہر آنکھ بے باک ہو جاتی ہے...... اور ہر زبان بدلحاظ...... رات ختم ہونے کے ساتھ ہی کھیل تماشا ختم ہو جاتا...... اور...... وہ اپنے بکھرے وجود کی کرچیوں کو سمیٹتی رہتی مگر کب تک ان کرچیوں سے اپنے وجود کو لہولہان کرتی...... عزت، شرافت اور عصمت کے لبادے وہ پہلے ہی اتار چکی تھی...... اب وہ بھی پیشہ ور عورتوں کی طرح منہ پھٹ، بدلحاظ اور بدگو ہو گئی تھی۔ اس نے چمن بیگم کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور کوٹھے کا سارا انتظام خود سنبھال لیا تھا۔ کس کو کتنا حصہ دینا ہے یہ...... اس کی مرضی سے طے ہوتا...... وہ...... اپنے ہر مجرے کی منہ مانگی قیمت لیتی۔ دوسری طوائفوں سے بھی اپنا حصہ وصول کرتی...... شراب نوشی، تمباکو نوشی اور اعلیٰ مہمانوں کے ساتھ جوا کھیلنے میں وہ عار محسوس نہ کرتی تھی۔

نگار بیگم کی طرح اسے بھی بڑی بڑی گاڑیاں لینے آتی تھیں۔ امیر خاندانوں کے لوگ اسے شادی بیاہ پر خصوصی رقص کے لئے بلواتے...... اور جب وہ نت نئی، جدید ماڈلز کی گاڑیوں پر بیٹھنے کے لئے نگار بیگم کی طرح چادر اوڑھ کر اچھو کے پاس سے گزرتی تو ہر بار کھڑی ہو کر ایک ٹک اچھو کی طرف ضرور دیکھتی جو اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھتا جیسے خدا کی قدرت اور شان پر حیران ہو رہا ہو...... اور...... وہ اس کے پاس سے گزر جاتی۔

دلبر اس کو چھوڑ کر جا چکا تھا بلکہ اس نے اس کا شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ نجانے وہ کہاں چلا گیا تھا...... کسی کو کچھ خبر نہ تھی وہ اسے اور حویلی کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا مگر یہ صرف وہی جانتی تھی...... جب وہ شدت غم سے نڈھال ہو جاتی تو دلبر کو رات کی تنہائیوں میں بلاتی...... اور اسے اپنے قریب آنے کو کہتی جس طرح وہ محبت سے اس کے پاس آتا تھا جب وہ ایک ملازمہ تھی۔ نگار بیگم نے جب مار مار کر اس کا برا حشر کر دیا تھا تو دلبر اس کے زخموں پر مرہم لگاتا تھا۔ وہ ان لمحوں کو یاد کرتی جب دلبر اس کو محبت سے چھوتا...... اور اسے اپنے ساتھ لگاتا تھا۔ مہمانوں کی مہمان نوازیاں اور ان سے جھوٹی محبت جتلاتے...... کھوکھلے تعریفی الفاظ سن کر اور بناوٹی دل لگی کر کے وہ تھک چکی تھی۔ اسے دلبر کی محبت ستانے لگی تھی...... اس کے لمس اور چھونے کے احساس کے لئے دل تڑپنے لگتا...... وہ دلبر کی محبت کی خوشبو اس کی سانسوں سے محسوس کرتی مگر اب وہ محبت کھو چکی تھی...... دلبر روٹھ گیا تھا...... اور اسے دلبر کی ضرورت تھی...... اس کی محبت اور چاہت کی تڑپ اسے مضطرب رکھتی تھی۔ نگار بیگم کی جگہ لینے کے بعد وہ اسے جب بھی بلاتی وہ بہانہ بنا کر کھسک جاتا...... اور...... وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تلملانے لگی۔ دلبر کی بے رخی پر اسے غصہ آنے لگتا...... اس کی اکڑ پر وہ حیران ہوتی...... مگر اسے چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکتی اس رات کے بعد اچانک وہ غائب ہو گیا...... کسی سے کچھ کہے بنا ایسا گیا پھر لوٹ کر نہ آیا...... آدھی رات کو اس نے

دلبر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔اس رات وہ شدید مضطرب اور بے چین تھی۔ دلبر آیا تو منہ موڑے کھڑا تھا.....وہ اس کے قریب آئی اور اس کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔

''دلبر.....مجھے.....تمہاری محبت چاہیے.....وہ محبت جو تم مجھ سے کرتے تھے.....'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔

''وہ میری بھول تھی اور آپ بھی اسے بھول جایئے'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیا کچھ بھولوں.....یہ.....کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو.....اور یہ کہ مجھے محبت کے لمس اور اس کے احساس سے تم نے آشنا کیا ہے.....اور.....اب تم مجھے کہہ رہے ہو کہ میں بھول جاؤں.....میں کیسے سب کچھ بھلاؤں.....دلبر مجھے پہلے کی طرح ایک بار اپنی بانہوں میں لو.....مجھے سینے سے لگا کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اپنا نام لکھواور میرے اندر کے سارے دکھوں اور غموں کو کان لگا کر سنو.....دلبر.....میں تمہارے بغیر بہت تنہا ہوں۔تمہاری بے رخی مجھے بہت اذیت دیتی ہے.....میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔اور وہ قدرے جذباتی ہو کر اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی.....دلبر اس سے یوں پیچھے ہٹا جیسے اسے کوئی کرنٹ لگی ہو.....دلبر نے اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور وہ کچھ کہے سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔وہ حیران کھڑی اسے دیکھتی رہی۔پھر اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ جا چکا تھا.....نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا کہ پھر دوبارہ کبھی لوٹ کر نہ آیا۔اس کو گئے ہوئے پورا سال گزر گیا تھا اور وہ ہر شب تنہائی میں اس کو یاد کر کے آنسو بہاتی.....دلبر جیسی محبت اس سے کوئی نہیں کر سکے گا اور شاید وہ بھی کسی کے لئے وہ احساسات محسوس نہ کر سکے گی جو وہ دلبر کے لئے کرتی تھی۔دلبر کے جانے کے بعد اس کے اندر واضح تبدیلی آئی تھی۔وہ بہت تلخ اور ترش رو ہو گئی تھی۔اس کے دل سے جیسے نرمی ختم ہو گئی تھی۔اس کا رویہ دوسری طوائفوں اور کوٹھے کے ملازموں وکارندوں کے ساتھ قدرے تلخ ہو گیا تھا۔اس نے قلیل عرصے میں بہت زیادہ پیسہ اکٹھا کر لیا تھا.....اکثر محفلوں میں رقص کرنے جاتی تو نوٹوں سے بیگ بھر کر لاتی۔کوٹھے کی تمام دوسری طوائفیں اسے حسد بھری نگاہوں سے دیکھتیں.....روز بروز رینا بیگم کی شان اور تفاخر میں اضافہ ہونے لگا۔وہ اپنے آپ کو سب سے منفرد اور اعلیٰ سمجھنے لگی۔

ایک فلم پروڈیوسر سکندر علی، رینا بیگم پر بری طرح مرمٹا تھا۔اس نے اسے اپنے ایک دوست کی حویلی میں رقص کی محفل میں دیکھا تھا.....اور اس کے بعد اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔وہ اس کا رقص دیکھنے خصوصی طور پر اس کی حویلی آیا اور اسے اپنی ایک فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے کی پیش کش کی۔اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔اس کی تصویریں پورے ملک کے اخبارات میں شائع ہوں گی اور بڑے سینما گھروں کے باہر اس کے رنگ برنگے پوسٹرز آویزاں ہوں گے۔وہ پورے ملک میں مشہور ہو جائے گی۔فلمسٹار 'رینا' اس سے بڑھ کر اسے اور کیا بننا تھا.....؟ اس نے جو خواب کبھی دیکھے تھے وہ سب پورے ہو رہے تھے۔اس نے جس جس بات کی تمنا کی تھی۔قدرت اسے عطا کر رہی تھی اسے اپنی سوچ سے بڑھ کر مل رہا تھا۔وہ نگار بیگم سے کہیں آگے کھڑی تھی۔

اس کے فلم میں کام کرنے پر چمن بیگم سمیت سب لوگوں نے پھر اعتراض کیا مگر اس نے نگار بیگم کا حوالہ دے کر سب کو خاموش کر دیا۔رفتہ رفتہ اس کی توجہ مجروں سے ہٹنے لگی اور وہ اپنا زیادہ وقت فلم کی شوٹنگ میں صرف کرنے لگی۔وہ اخبارات کی خبروں میں نمایاں ہونے لگی تھی۔سکندر علی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کی خصوصی توجہ اور دلچسپی نے اس کی قدر و منزلت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہر طرف فلمسٹار 'رینا' کا چرچا ہونے لگا۔ ایک فلم کی کامیابی کے بعد فلمسازوں کی لائنیں لگ گئیں مگر وہ کسی کو بھی سکندر علی کی مرضی کے بغیر سائن نہ کرتی۔ سکندر علی اور رینا ہر ٹی وی پروگرام میں اکٹھے دکھائی دیتے تھے۔ رینا کا ستارہ عروج پر جا رہا تھا۔ سکندر علی کے لئے وہ صرف ایک ہیروئن ہی نہیں تھی بلکہ "بہت کچھ" تھی۔ دونوں میں دن بدن بہت محبت پیدا ہو رہی تھی۔ سکندر علی ایک منٹ بھی اس کے بغیر نہ گزارتا۔ اگر وہ شوٹنگ میں مصروف ہوتی تو وہ اسے وہاں فون کرتا رہتا۔

"رینا بیگم...... اب آپ کے بغیر سانس لینا بھی ممکن نظر نہیں آتا ہے" سکندر علی نے ایک روز محبت سے کہا۔

"یہ تو بہت خطرے کی بات ہے" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں...... خطرہ تو ہے اب آپ کا اس علاقے میں رہنا مناسب نہیں" سکندر علی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ چونک گئی۔

"کیا مطلب......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اب آپ مشہور ہو چکی ہیں۔ آپ کی پہچان بدل گئی ہے...... آپ بہت سے لوگوں کی آئیڈیل ہیں...... اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی آئیڈیل کہاں سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا بہت برا اثر آپ پر پڑے گا...... آپ کی شہرت متاثر ہوگی اور آپ کو فلموں میں کام ملنا بند ہو جائے گا" سکندر علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے...... لیکن ہماری حویلی ہی ہمارا گھر ہے، ہم اور کہاں جا سکتی ہیں؟" رینا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"شہر کے سب سے قیمتی اور ماڈرن علاقے میں، میں آپ کو بہت بڑا بنگلہ خرید دیتا ہوں۔ میرے خیال میں آپ کا وہاں شفٹ ہو جانا بہتر ہے......" سکندر علی نے کہا۔

"کیا ہم یہ حویلی...... اور یہ پیشہ سب کچھ چھوڑ دیں؟" رینا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" وہ قطعیت سے بولا۔

"مگر......" اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔

"میں آپ کو سب کچھ دوں گا...... گھر...... عزت...... اور تحفظ" سکندر علی نے کہا تو 'عزت' پر اس کا ذہن اٹک گیا...... اس نے سب کچھ پا لیا تھا مگر 'عزت' کھوئی تھی اور اب قدرت اسے سکندر علی کے ذریعے عزت واپس لوٹا رہی تھی۔ وہ واقعی خوش قسمت تھی۔ عزت کتنی بڑی نعمت اور عطا ہے جو قدرت اپنے بندوں کو عطا کرتی ہے مگر انسان اپنی بداعمالیوں سے اسے خود ہی گنوا بیٹھتا ہے یا پھر قدرت اس سے چھین لیتی ہے...... پھر وہ ساری زندگی سر پٹختا رہتا ہے مگر کھوئی ہوئی عزت نہیں پا سکتا۔ رینا بیگم نے گھر، دولت، شہرت اور دنیا کی ہر شے پا لی تھی۔ اگر کچھ نہیں پا سکی تو وہ عزت تھی۔ وہ اس کی بات سن کر مسکرانے لگی۔

"کیسی عزت؟" رینا بیگم نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" سکندر علی نے مسکرا کر پوچھا تو رینا مسکرا دی۔ اس کے گال خوشی سے تمتمانے لگے۔

''شادی......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اب ہم دونوں کو شادی کر ہی لینی چاہیے کیونکہ اخبارات ہر روز مصالحہ دار خبریں اخبارات میں لگا کر ہمارے اسکینڈلز بنانا چاہتے ہیں جس کا ہم دونوں کو نقصان ہوگا......'' سکندر علی نے کہا تو وہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔

''لیکن...... ایک بات ہے...... وہاں جانے کے بعد آپ مڑ کر اس حویلی کو نہیں دیکھیں گی...... آپ کو ساری کشتیاں جلا کر میرے ساتھ جانا ہوگا'' سکندر علی نے کہا تو وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔

''ہمیں منظور ہے'' وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں ایک دو روز بعد آ کر آپ کو لے جاؤں گا، تیار رہیے گا'' سکندر علی نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

مستقبل کے سنہرے خوابوں اور امیدوں نے اسے مسرور کر دیا۔ حویلی چھوڑنے کی خبریں ہر جانب گردش کرنے لگیں تو سب کے چہروں پر حیرت کے ساتھ ساتھ گہرا استفہام نمایاں ہوتا۔

''رینا بیگم...... کیا آپ حویلی...... یہ نام...... یہ شان و شوکت سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہیں'' چمن بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''مگر...... کیوں......؟''

''اب ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں...... ہم نے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

''رینا بیگم...... کیا آپ 'نگار بیگم' کو بھول گئیں...... نوازش علی نے کیسے ان کو دو منٹ میں چھوڑ دیا...... ایسے لوگوں کی محبتیں ہوا کے سنگ اڑتے پھرتے رنگ برنگی کاغذوں جیسی ہوتی ہیں۔ آج یہاں...... تو...... کل وہاں...... ہر طوائف کی زندگی میں کوئی نہ کوئی 'نوازش علی' اور 'سکندر علی' آتا ہے مگر انجام کیا ہوتا ہے آپ اچھی طرح جانتی ہیں'' چمن بیگم نے اسے سمجھانا چاہا۔

''سکندر علی ایسے مرد نہیں'' وہ پر یقین لہجے میں بولی۔

''ہر مرد ایک سا ہوتا ہے...... اور...... ہر طوائف...... ہر بار دھوکہ کھاتی ہے اور ہر بار اس پر یقین کر کے خوار ہوتی ہے۔ رینا بیگم...... ہر طوائف کی زندگی کوٹھے سے شروع ہو کر کوٹھے پر ہی ختم ہوتی ہے اور جب وہ اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اجنبی راستے اس کو قبول نہیں کرتے۔ وہ ہر ایک کی ٹھوکر سے لڑکھڑاتی رہتی ہے'' چمن بیگم نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مگر ہم کب تک یونہی لوگوں کے سامنے رقص کر کے ان کا دل بہلاتے رہیں گے...... ہماری اپنی زندگی ہماری اپنی خوشیاں کہاں ہیں...... کیا ہمارا ان پر کوئی حق نہیں...... کیا ہمیں گھر...... اور عزت نہیں مل سکتی؟'' اس نے چمن بیگم سے پوچھا۔

''اس وقت آپ سے بحث فضول ہے...... آپ کے سر پر سکندر علی کی محبت کا بھوت سوار ہے...... ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں مگر جب وہاں سے لوٹ کر آئیں گی تو یہ حویلی آپ کو اس طرح قبول نہیں کرے گی جس طرح اب آپ جا رہی ہیں'' چمن بیگم نے کہا تو اس نے قدرے طنزیہ انداز

میں چمن بیگم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''یہاں دوبارہ آئے گا کون......؟'' اور وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

چمن بیگم نے اس کی طرف بغور دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

☆

جمی اور نرگس کے جانے کے بعد فردوس بہت تنہا رہ گئی تھی۔ گھر اس کو کھانے کو دوڑتا......اس میں شامو، جمی، نرگس اور بے بی کی رچی بسی یادیں اسے ہر وقت تنگ کرتی رہتیں۔ جب دل تنگ پڑنے لگتا تو وہ گھر سے باہر نکل جاتی اور باہر جاتی تو گلی محلے کے لڑکے اس سے چھیڑ خانیاں کرتے۔ کوئی آوازیں کستا تو کوئی چٹکی کاٹتا...... وہ گالیاں بکتی تو لوگ چڑ کر اسے اور تنگ کرتے...... وہ بڑبڑاتی، گالیاں بکتی گھر لوٹ آتی......زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی تھی...... نہ گھر میں سکون ملتا تھا نہ باہر چین...... تنہائی اور اجنبیت نے اس کو ذہنی طور پر بہت پریشان کر دیا تھا۔ کوئی ایسا انسان نہ ملتا جس سے وہ اپنے دل کی بات کرتی۔ اس سے اپنی بے تابیوں اور بے چینیوں کا ذکر کرتی...... نہ کوئی حال پوچھنے والا تھا اور نہ ہی کوئی تسلی دینے والا...... اور ہر زندہ انسان کو زندگی میں دوسروں کی تسلی و تشفی اور دلاسے کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ تنہائی کی اذیت سہنے والا انسان ہی جانتا ہے۔ نرگس کے ساتھ وہ اپنے دل کی ہر بات کر لیتی تھی اور وہ اسے کبھی تسلیاں دیتی تو کبھی دونوں مل کر اپنی بے بس اور مجبور زندگی کے دکھ ایک دوسرے کے ساتھ بیان کرتیں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا مگر اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے دل کسی بھاری پتھر تلے آ گیا تھا یا غبارے کی مانند جو غموں، سسکیوں اور آہوں سے پھولا چلا جا رہا تھا۔ وہ دن میں کتنی بار روتی...... آنسو پونچھتی اور پھر گھر سے باہر چلی جاتی۔ جب گھر لوٹتی تو دل اور ہی چکنا چور ہو جاتا۔

جمی تھا تو وہ اس سے لڑتی جھگڑتی مگر اس کا خیال بھی بہت رکھتی تھی مگر جمی کے جانے کے بعد وہ اسے بھی بہت یاد کرتی۔ کوئی ایسا رشتہ پاس نہیں تھا جس کے ساتھ وہ محبت کے بول بولتی۔ جس کو پیار کرتی...... جس سے کچھ کہتی یا سنتی...... وہ اپنے آپ سے تنگ آنے لگی تھی......اور چڑچڑی ہو گئی تھی...... محلے والوں سے ہر روز ایک نیا جھگڑا تیار ہوتا۔ کبھی کوئی جان بوجھ کر اس کے صحن میں پھلوں کے چھلکے پھینک دیتا تو وہ گالیاں بکنے لگتی۔ کبھی کوئی دیوار پھلانگ کر اس کی چیزیں اور کپڑے چرا کر لے جاتا تو اس پر گالیاں شروع کر دیتی......کوئی چھیڑ جاتا تو اس پر بگڑ جاتی...... محلے والے بھی اس کی بدزبانی اور جھگڑنے سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ بھی جان بوجھ کر رات کو دیر تک اونچی آواز میں گانے لگا دیتی تو لوگ اس کی موسیقی سمیت اسے لعن طعن کرتے۔ اسے گالیاں دیتے...... ہر وقت میدان جنگ کا ماحول بنا رہتا۔ لوگ اس سے تنگ تھے اور وہ لوگوں سے......

وہ کئی سالوں سے نرگس کے ساتھ اس بوسیدہ اور کھنڈر نما گھر میں کرائے پر رہتی تھی۔ لوگوں نے مالک مکان سے کہہ کر اس کا سامان گلی میں پھنکوا دیا۔ وہ روتی چلاتی اپنا سامان سمیٹ کر ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہاں جائے۔ اس تاریکی میں شامو ہی اک جگنو کی مانند چمکا اور وہ اس کے شہر چلی آئی۔ شامو اسے تپاک سے ملا اور اسے اپنے گھر ٹھہرنے کو کہا۔ پہلے وہ وہاں نرگس اور جمی کے ساتھ گئی تھی اور وہ آٹھ دن سب نے بہت عیش میں گزارے تھے۔ سب نے بہت لطف اٹھایا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی زندگی میں صرف وہی آٹھ دن خوشی کے دن تھے۔ باقی سب دن تو بس روز و شب کا آنا جانا تھا اور کچھ نہیں......کوئی ایک دن بھی زندگی میں اہم نہ گزرا تھا اور کوئی شب بھی ایسی اہم نہ گزری تھی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جب اپنے ادھورے وجود کے احساس نے اسے نہ رُلایا ہو...... مگر ان آٹھ دنوں میں وہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔ اپنے وجود کو فراموش کر چکے تھے۔ اگر یاد تھا تو صرف یہی کہ وہ سب شامو کے مہمان تھے۔

اپنے 'انسان' ہونے پر انہیں جو دکھ ہر لحہ...... ہر وقت آہستہ آہستہ اندر ہی اندر کچو کے لگاتا رہتا تھا...... 'مہمان' بن کر آنے پر وہ ہر غم بھول چکے تھے۔

مگر اب شامو کے پاس آکر اسے بہت عجیب لگ رہا تھا...... وہ صبح لیٹ اٹھتا اور دوپہر کے قریب پارلر چلا جاتا...... رات کو دیر سے لوٹتا۔ کبھی کبھار اس سے بات ہوتی۔ اسے یہاں آکر محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اس پر بوجھ ہو...... یا کوئی فالتو چیز...... جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا...... گھر کے ملازمین اسے وقت پر کھانا دے دیتے اور اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ کوئی اس کے ساتھ زیادہ بات چیت نہ کرتا وہ تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے تو یہاں آئی تھی مگر دل اور بوجھل ہونے لگا تھا۔

ایک شام شامو جلدی گھر لوٹ آیا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور اسے بخار محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آتے ہی اپنے بیڈروم میں چلا گیا...... اس نے اس کے پاس جانا چاہا تو ناصر نے اسے روک دیا۔

''صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں...... آپ انہیں ڈسٹرب نہ کریں تو بہتر ہے'' ناصر نے کہا۔

''ارے چل...... تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا...... یہ دیکھ میں...... اندر جا رہی ہوں...... جب وہ پہلے کبھی بیمار ہوتا تھا تو میں ہی اس کا سر دباتی تھی'' فردوس نے کہا اور اندر چلی گئی۔ شامو بیڈ پر آنکھیں موندھے لیٹا تھا۔ فردوس نے جوتا اتارا اور جھٹ اس کے بیڈ پر چڑھ گئی۔ شامو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپا...... تم......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارا سر دباتی ہوں'' وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں'' اس نے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا۔

''تو چپ کر...... بھول گیا وہ وقت جب میں ہی تیرا سر دباتی تھی اور اب تو بڑا صاحب بن گیا ہے...... تجھے...... میری ضرورت نہیں رہی'' فردوس منہ بنا کر بولی اور اس کا سر دبانے لگی۔

''معلوم نہیں آپا...... زندگی میں کس کو کس کی ضرورت ہوتی ہے...... شاید جس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کبھی نہیں ملتا'' شامو نے آہ بھر کر کہا۔

''تو کس کی بات کر رہا ہے......؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی بات کر رہا ہوں......'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''اچھا...... چپ کر...... تیرے سر میں درد ہے...... باتیں کرنے سے سر اور بھاری ہوگا'' وہ محبت سے اس کا سر دبانے لگی...... اور وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک شامو کے چہرے پر اس کے آنسو گرے۔ شامو نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں......اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپا......کیا تم......رو رہی ہو'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''ن......نہیں......تو......بس یونہی......تجھے دیکھ کر پرانی باتیں یاد آنے لگیں......شامو......ہمارے پاس تو کوئی ہمارا اپنا بھی نہیں ہوتا جس کو ہم جی بھر کر پیار کر سکیں......ارے شامو......دل ہر وقت کتنا ٹوٹتا رہتا ہے......تجھے کیا بتاؤں......؟ سوچتی ہوں......ہم جیسے انسان دنیا میں کیا لینے آتے ہیں......ادھورے انسان، بھلا کسی کے کیا کام آ سکتے ہیں......ہمیں تو نہ شناخت ملتی ہے......نہ محبت......نہ رشتے......اور نہ ہی عزت...... ہمارے پاس ہے کیا؟ ہم کس کے لئے جئیں......اور کیوں جئیں......؟ پھر بھی جینا پڑتا ہے......نجانے کیوں......؟ وہ آہ بھر کر بولی تو شامو اس کی طرف حیرت اور تاسف سے دیکھنے لگا۔

''آپا......تمہارے کسی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں......کیونکہ یہی سوال میں بھی اپنے آپ سے کرتا ہوں مگر جواب نہیں ملتا......'' شامو نے بھی تاسف سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

''شامو......میں نے تجھ سے ایک بات کہنی تھی......موقع ہی نہیں مل رہا تھا......آج تم جلدی آ گئے......تو......سوچا ہے......آج ہی کہے دیتی ہوں'' فردوس نے کہا تو شامو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیسی بات......؟'' شامو نے پوچھا۔

''میں یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہوں'' فردوس نے کہا۔

''کیوں......؟ کیا تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......مگر......میں یہاں کب تک مہمان بن کر رہوں گی......مجھے لگتا ہے......میں تم پر بوجھ ہوں'' فردوس نے افسردگی سے کہا۔

''آپا......بوجھ......! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' شامو نے کہا۔

''نہیں شامو......مجھے یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا......تم مجھے کوئی کام دلا دے......؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیسا کام......؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی کے گھر صفائی، ستھرائی کا کام......کسی کے بچے کی آیا بھی بن سکتی ہوں اور کپڑے دھونے کا کام بھی میں کر سکتی ہوں......بس تو کوئی کام دلا دے......میرا بھی دل چاہتا ہے......کہ میں بھی محنت کر کے کھاؤں......'' فردوس نے فرط جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔

''اچھا......ٹھیک ہے......میں کسی سے بات کر کے بتاؤں گا......اب تم جا کر آرام کرو'' شامو نے کہا تو وہ خوش ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی اور شامو بھی دوائی کھا کر سو گیا۔

شامو کے پاس بڑے بڑے اعلیٰ گھروں کی بیگمات آتی تھیں اور اکثر گھر کے مسائل بھی اس کے ساتھ ڈسکس کرتی تھیں......ایک بزنس مین کی بیگم صاحبہ کو اپنے چھ ماہ کے بچے کے لئے آیا کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ روز پہلے شامو سے ذکر کیا تھا۔ شامو نے اس کو فون کر کے فردوس کو وہاں بھیج دیا۔ بیگم صاحبہ نے اس کا بھرپور انٹرویو کیا اور اچھی طرح جانچنے کے بعد اس نے اسے انکار کر دیا اور شامو سے فون کر کے بہت شکوہ کیا کہ

اس نے ایک ہیجڑے کو کیوں اس کے گھر بھیجا ہے...... وہ تو ایسے لوگوں کا سایہ بھی اپنے بچے پر نہیں پڑنے دیتی...... فردوس کا دل بہت ٹوٹ گیا تھا۔ شامو نے اسے کسی کے گھر ملازم کے طور پر رکھوایا چند روز اس نے وہاں بہت دل لگا کر کام کیا...... بھاگ بھاگ کر ہر کام کرتی، شروع میں تو وہ لوگ بہت خوش تھے مگر بعد میں جب انہیں نیا ملازم ملا تو انہوں نے اسے کام سے نکال دیا۔ شامو نے ایک دو جگہ پر اسے ملازم رکھوایا مگر جب لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ اسے نکال دیتے۔ وہ اتنی دلبرداشتہ ہو گئی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے روتی تھی کہ لوگ اس کے کام کو نہیں دیکھتے...... اس کے ادھورے پن کو دیکھتے ہیں...... ان کی نظروں میں انسان کی عزت کام سے نہیں ہے...... لوگوں کا عجیب دوغلا پن تھا جو اسے ذہنی طور پر شدید ڈسٹرب کر رہا تھا...... اور وہ ایک صبح شامو کے اٹھنے سے پہلے اس کا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ شامو کو جب معلوم ہوا تو اسے بہت دکھ ہوا...... اس نے اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی مگر نجانے وہ کہاں کھو گئی تھی۔

☆

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز "علم و عرفان پبلشرز" کی خدمات حاصل کیجیے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک...... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجیے اور کتاب لیجیے......

خواتین کے لیے سنہری موقع...... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجیے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

برکتے کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ اسے گڈی کی سڑی ہوئی لاش نہیں بھولتی تھی۔ اس کا چہرہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا اور جسم کا کوئی حصہ سلامت نہیں تھا...... وہ مرنے سے پہلے برکتے کے پاس چارپائی پر لائی گئی اس کا چہرہ اور جسم چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں جلنے سے بچی تھیں۔ برکتے اسے دیکھ کر پیٹنا شروع ہو گئی...... گڈی کی آنکھیں آگ اور دکھ کے غبار سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا اور ان بہتی آنکھوں میں شکوے ہی شکوے تھے۔ وہ بول نہیں سکتی تھی مگر اس کی آنکھیں بول رہی تھیں...... برکتے واویلا کر رہی تھی اپنی جوان بیٹی کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔ ملکا جھگی کے اندر آیا...... تو گڈی نے اسے دیکھ کر منہ موڑ دیا اور اس کی جان نکل گئی...... وہ سڑے ہوئے مردہ وجود کے ساتھ پڑی تھی۔ سب بہن بھائی رو رہے تھے سوائے مجو اور پپو کے جو کل سے گم تھے اور جن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا...... برکتے ان کے غم میں پہلے ہی نڈھال ہو رہی تھی کہ گڈی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی رانی کی طرح...... پہلے وہ رانی اور منے کو نہیں بھول پا رہی تھی اور اب گڈی بھی چلی گئی...... پپو اور مجو کا بھی کوئی پتا نہ تھا...... نجانے اس کے بچوں کو کس ظالم کی نظر لگ گئی تھی کہ اس کی جھگی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بچے اس سے بچھڑ رہے تھے اور وہ بچوں کے غم میں پاگل ہو رہی تھی...... گڈی کو دفنا دیا گیا...... رمضو غائب ہو گیا تھا کہ کہیں اس پر گڈی کے قتل کا الزام نہ آ جائے اور ملکا پولیس میں رپورٹ نہ لکھوا دے مگر ملکا اندر ہی اندر مطمئن تھا کہ رمضو کے بھاگ جانے سے اور گڈی کے مر جانے سے وہ روز روز کی چخ چخ سے بچ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تین ہزار واپس کر کے پپو اور مجو کو لے آئے گا مگر بھاگی نے پانچ سو نجو کو دے کر ڈھائی ہزار بچا لیے تھے اور وہ ان ڈھائی ہزار روپوں سے اپنے کاکے کے لئے بہت کچھ خریدنا چاہتی تھی...... اسے پپو اور مجو کی کیا فکر تھی؟

کئی روز ہو گئے تھے مگر پپو اور مجو کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور برکتے کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس نے نجو اور مٹھو کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ وہ کسی طرح اس کے بچوں کو ڈھونڈ لائیں اور وہ دونوں ان کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ اچانک ایک روز نجو کو شہر سے باہر ایک بازار میں پپو بھیک مانگتا نظر آ گیا۔ اس کی آدھی ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور مرہم پٹی نہ کرنے کے باعث زخم میں پیپ پڑ چکی تھی وہ سڑک کے کنارے کپڑا اچھا کر لیٹا کراہ رہا تھا...... اس کے پاس کشکول پڑی ہوئی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا اور لوگ اس کی حالت دیکھ کر اس پر رحم کھاتے ہوئے اس کے کشکول میں پیسے ضرور ڈال کر جاتے اور اسکی طرف دکھ اور رحم بھری نظروں سے دیکھتے۔ نجو اس کو دیکھ کر گھبرا گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"پپو...... پپو...... میرے بھائی...... یہ...... یہ تجھے کیا ہوا ہے؟" نجو نے اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا تو پپو نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس کے سینے کے ساتھ چمٹ کر رونے لگا......

"نجو...... مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جانا...... استاد مجھے بہت مارتا ہے...... اس نے میری ٹانگ کاٹ دی ہے" پپو رونے لگا۔

"کون استاد......؟" نجو نے حیرت سے پوچھا۔

"استاد فیقے نے...... ابا مجھے اور مجو کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا...... پھر کبھی نہیں آیا...... استاد ہمیں بہت مارتا ہے......" پپو کے چہرے پر خوف اور ڈر تھا...... اس کی آواز بار بار گلے میں اٹک رہی تھی۔ اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

"اور...... مجو...... کہاں ہے؟" نجو نے پوچھا۔

''اس کا ہاتھ اس نے کاٹ دیا ہے روز اسے کسی مزار پر چھوڑ آتا ہے...... تجو...... وہ ہمیں کھانے کو بھی نہیں دیتا...... تجو مجھے اماں کے پاس جانا ہے...... مجھے گڈی اور شبو کے پاس جانا ہے...... مجھے اماں بہت یاد آتی ہے'' وہ منمنا کر رونے لگا۔

''میں...... میں...... تجھے اپنے ساتھ لے کر چلتا ہوں'' اور تجو اسے اٹھا کر جانے لگا تو ایک موٹا تازہ آدمی اس کے پاس آیا اور تجو کو گریبان سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''اوئے...... تو اس کو لے کر کہاں جا رہا ہے؟'' موٹے آدمی نے کہا۔

''یہ...... یہ...... میرا بھائی ہے اور میں اس کو لے کر ہی جاؤں گا'' تجو نے بھی اکڑتے ہوئے کہا۔

''واہ...... بڑی اکڑ ہے تجھ میں...... تو...... لا...... وہ پیسے جو تیرا باپ، استاد فیقے سے لے کر گیا ہے'' موٹے آدمی نے تجو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''کیسے پیسے؟'' تجو نے حیرانگی سے پوچھا۔

''اوئے...... تیرا باپ...... ان کو استاد کے ہاتھ بیچ کر گیا ہے...... یہ نہیں اس نے تجھے بتایا...... جا...... پہلے پیسے لا...... اور پھر استاد سے بات کر'' موٹے آدمی نے کہا تو تجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ انہی قدموں پر واپس لوٹا۔

شام ہونے کے قریب تھی وہ بھاگی کی جھگی میں گیا۔ وہ اور ملکا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تجو نے قریب پڑا ڈنڈا اٹھایا اور باپ کی طرف لپکا۔

''ابا...... پپو اور مجو کہاں ہیں؟'' تجو نے پوچھا۔

''وہ گم ہو گئے ہیں'' ملکے نے منہ پھیر کر کہا۔

تجو نے اٹھا کر ڈنڈا باپ کی کمر میں مارا...... بھاگی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے...... مر جائے...... تو...... باپ کو مار رہا ہے...... تجھے کیڑے پڑیں......'' بھاگی چلائی۔

''اری...... چپ کر تو...... ساری آگ تو نے لگائی ہے...... یہ باپ مر جائے تو اچھا ہے...... اس نے پپو اور مجو کو بیچ دیا ہے۔ استاد فیقے کے ہاتھ بول...... ابا وہ رقم کہاں ہے؟ بول...... ورنہ'' تجو نے پھر ڈنڈا مارنے کو اٹھایا۔ ملکا اور بھاگی گھبرا گئے۔

''م...... میں نے کوئی پیسے نہیں لیے'' ملکے نے کہا۔

''جھوٹ مت بول...... اگر تو سچا ہے تو چل میرے ساتھ استاد فیقے کے پاس...... اور...... اس کے سامنے یہ بات کہہ'' تجو نے غصے سے کہا۔

''چل...... چل...... تو...... کون ہوتا ہے...... باپ کو وہاں لے جانے والا...... پپو اور مجو اس کی ہی اولاد ہے...... جو چاہے کرے'' بھاگی نے غصے سے کہا تو تجو نے ڈنڈا زور سے اس کی کمر میں مارا...... وہ وہیں اپنے پیٹ کو پکڑ کر تڑپنے لگی۔

''ہائے...... میں...... مر گئی...... میرا بچہ......'' وہ چلائی۔

''اللہ کرے...... مر جائے...... تو...... اور تیرا بچہ بھی'' تجو نے غصے سے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

''سن ابا...... مجو اور پپو کو واپس لے کر آ...... ورنہ میں تیری بوٹی بوٹی کر دوں گا'' جو غصے سے دھمکی لگا کر چلا گیا۔ ملکے کے ہوش اڑ گئے وہ بھاگی کو سنبھالنے لگا۔ جلدی سے نوری کو بلا کر لایا۔ بھاگی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی...... اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ اس نے واویلا کر کے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ صبح تک اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی مگر وہ پیدا ہوتے ہی مر گئی...... بھاگی...... جمو کو گالیاں دیتی...... اس نے نرس کو کہہ کر پولیس کو بلوایا اور جمو کو گرفتار کروا دیا...... وہ پیسے جو اس نے اپنے ہونے والے بچے کی چیزوں کی خریداری کے لئے رکھے تھے۔ وہ ہسپتال میں دواؤں پر خرچ ہو گئے تھے...... جمو نے ملکے کو دھمکی دی تھی کہ وہ اسے اور بھاگی کو ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ برکتے کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے ملکے سے کہا کہ وہ بچوں کو واپس لے کر آئے...... مگر اس کے پاس پیسے کہاں تھے...... جو وہ انہیں لے کر آتا...... برکتے نے تنگ آ کر اپنے پاس پانچ ہزار روپے اسے دیئے تو وہ چونک گیا۔

''یہ...... یہ...... تیرے پاس کہاں سے آئے؟'' ملکے کی آنکھیں حیرت سے نکل گئیں۔

''کسی نے دیئے ہیں......؟'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کون ہے...... وہ......؟ جس نے تجھے اتنے روپے دیئے'' ملکے نے پوچھا۔

''تھا...... اللہ کا بندہ...... تو جلدی سے میرے بچوں کو گھر واپس لے کر آ'' برکتے نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ملکا پانچ ہزار روپے لے کر استاد کے پاس گیا اور بچوں کو واپس کرنے کو کہا...... پہلے تو استاد مان نہیں رہا تھا مگر اس کی منت سماجت پر وہ مان تو گیا مگر اس نے تین کی بجائے پانچ ہزار روپے وصول کیے۔ جب بچوں کو اس کے سامنے لایا گیا تو وہ خود بھی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ پپو کی کٹی ٹانگ اور مجو کا کٹا ہاتھ دیکھ کر وہ رونے لگا۔

''استاد...... یہ...... یہ تو نے کیا کیا...... میں تو صحیح سلامت بچے لایا تھا اور تو نے ان کے ساتھ......'' ملکا بے بسی سے بولا۔

''میں نے ان سے بھیک منگوانی تھی...... سیریں نہیں کروانی تھیں اور بھیک لینے کے لئے بھکاریوں کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے...... لوگ بڑے سیانے ہو گئے ہیں...... ایویں ہی ٹھیک ٹھاک بچوں کو کوئی بھیک نہیں دیتا...... چل...... دفعہ ہو یہاں سے...... میرا اتنا نقصان کر دیا ہے'' استاد غصے سے بولا۔

''استاد...... تو...... بڑا ظالم انسان ہے'' ملکا آہ بھر کر بولا۔

''اوئے...... یہ مجھے کہنے سے پہلے اپنے آپ کو کہہ...... میں ان کا باپ نہیں ہوں...... اور تو نے تو باپ ہو کر ان کو بیچ ڈالا...... بول ظالم تو ہے کہ میں؟'' استاد نے غصے سے کہا تو ملکا شرمندہ ہو گیا اور بچوں کو لے کر باہر آ گیا۔

بچے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ ملکے کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے...... پپو اور ملکا دونوں اپنی اپنی بیساکھیوں کے سہارے چل رہے تھے اور مجو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ روتا ہوا جا رہا تھا...... وہ دونوں بہت کمزور ہو چکے تھے۔ برکتے بچوں کو دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگی اور ملکے اور بھاگی کو گالیاں دینے لگی...... بچے ماں کے سینے سے لگ کر کافی دیر سسکتے رہے...... مٹھو نے ملکے کو جھگی سے باہر نکال دیا کہ وہ اب ان کی جھگی میں کبھی نہ آئے ورنہ وہ اس کے ٹکڑے کر دے گا۔

☆

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

''شمی...... آج بہت اہم اپائنمنٹ ہے...... فلمسٹار' رینا' آ رہی ہیں...... ان کے پروڈیوسر کا فون آیا ہے۔ وہ ایک فلم میں برائیڈ کا رول ادا کریں گی ان کا ہیر اسٹائل اور میک اپ آپ نے کرنا ہے''۔ ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

''او کے...... ٹائم کیا ہے......؟'' شمی نے پوچھا۔

اسے ٹائم بتایا گیا اور شمی نے کلاک کی طرف دیکھا...... دو بج رہے تھے اور رینا کا بکنگ ٹائم شام چھ بجے کا تھا...... اس نے اپنی ڈائری دیکھی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا...... شام چھ بجے سے پہلے وہ فارغ ہو چکا تھا...... فلمسٹار رینا جیسے ہی پارلر میں داخل ہوئی۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ خواتین میک اپ اور فیشل کرواتے ہوئے اسے مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں۔ اس کا سر فخر سے اکڑنے لگا اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک اسسٹنٹ بھی تھی جس نے اس کا برائیڈل ڈریس، جیولری اور دوسری چیزیں ایک بیگ نما سوٹ کیس میں اٹھا رکھی تھیں۔ رینا بڑی ادا سے شمی کے کیبن میں داخل ہوئی جو خصوصی طور پر اس کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ رینا لمبے بالوں اور ٹراؤزر شرٹ میں بڑی ماڈرن لگ رہی تھی۔ اسسٹنٹ اس کا سامان رکھ کر چلی گئی۔

''ہیلو'' رینا نے شمی سے کہا جو کچھ مکس کرنے میں مصروف تھا۔ شمی نے مڑ کر اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے چہرہ بہت شناسا محسوس ہوا۔ وہ چہرہ جو اس کے دل کے اندر ہمیشہ سے بستا تھا...... اور جس کو وہ اکثر تنہائی کے لمحوں میں اپنے سامنے بٹھا کر گفتگو کرتا تھا...... مگر...... اس کا حلیہ اور اب اس کا مقام و مرتبہ اس کو پریشان کر رہے تھے۔ شمی خود بھی بہت بدل چکا تھا۔ اس کا جسم قدرے بھاری اور چہرے کے نقوش بھی موٹے ہو گئے تھے رینا کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی چمک آئی مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو نارمل کیا۔

''آپ کا چہرہ کچھ شناسا لگ رہا ہے؟'' شمی نے ہمت کر کے پوچھا۔

''دنیا میں بہت سے لوگوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے'' رینا نے بڑی ادا سے کہا۔

آواز وہی تھی مگر انداز گفتگو میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شمی الجھنے لگا۔

''کیا آپ کسی شامو کو جانتی ہیں......؟ میں...... وہی شامو ہوں'' شمی نے واضح انداز میں اپنا تعارف کرانا چاہا۔

''کون شامو......؟ آپ ہمیں الجھایئے مت...... اور اپنا کام شروع کیجئے۔ ہمیں وقت پر شوٹنگ کے لئے پہنچنا ہے'' اور اسی لمحے سکندر علی کا فون آ گیا اور وہ بہت ناز و اداؤں سے اس کا فون سننے لگی...... اس کی باتیں چونکا دینے والی تھیں اور اس کا انداز انتہائی دل لبھانے والا...... اس کا چہرہ پرکشش دل میں اتر جانے والا تھا دل اس کی لمبی زلفوں کا اسیر بننے کو دل مچلنے لگتا تھا۔ شمی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کا دل بہت مضطرب رہا۔ اس نے بہت الجھن میں اس کو دلہن بنایا...... جس کی محبت میں وہ بری طرح گرفتار رہا تھا۔ اس نے اس کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں...... اس کا دل بھی رینا بیگم کے الفاظ کو نہیں مان رہا تھا...... اس نے اس کے ایک ایک نقش کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا...... اسے بہت محبت سے دلہن بنایا...... وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر مسکرانے لگی اور پرس میں سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر اسے انعام دیا۔

سکندر علی خود اسے لینے آیا تھا......اور اسے دیکھ کر وہ کتنا دیوانہ ہو رہا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

شمی سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہو گیا تھا۔ وہ الجھا ہوا باہر نکلا......

کچھ خواتین آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔

''یہ فلسٹار رینا تھی......آج کل سکندر علی کے ساتھ اس کے اسکینڈلز کی خبریں پڑھنے اور سننے کو مل رہی ہیں......'' ایک خاتون نے کہا۔

''ان لوگوں کو اسکینڈلز کی کیا پرواہ......؟ ویسے بھی اس کا تعلق بازار حسن سے ہے......سنا ہے......وہاں کی بہت مشہور طوائف تھی......سب کچھ چھوڑ کر سکندر علی کے ساتھ آ گئی......'' دوسری نے جواب دیا۔

''کیا دونوں نے شادی کر لی ہے؟'' پہلی نے پوچھا۔

''کہاں......؟'' دوسری نے طنزاً کہا۔

شمی سے مزید نہ سنا گیا اور وہ پارلر سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل پر جو بھاری پتھر تھا وہ ہٹ گیا تھا......

رانی......طوائف نہیں ہو سکتی......وہ تو ناچ گانے کی کمائی کو حرام سمجھتی تھی......ہمیں بہت نفرت سے دیکھتی تھی......وہ خود کبھی یہ کام نہیں کر سکتی......میرے دل کو اس بات پر پکا یقین ہے'' وہ خود بخود مسکرانے لگا اور مطمئن ہو گیا۔

☆

شوٹنگ کے بعد سکندر علی اسے ایک ریسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ایک کمرے کو خوبصورت تازہ پھولوں سے بھرپور انداز میں سجایا گیا تھا۔ وہ اتنی تیاری دیکھ کر چونکی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دلہن کا کمرہ......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''مگر......یہاں تک آنے کے لئے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے......وہ سب......میرا مطلب ہے نکاح خواں اور لوگ جن کی شرکت شادی میں ضروری ہوتی ہے'' وہ بولی۔

''وہ سب کچھ بعد میں بھی ہوتا رہے گا......آج صرف ہم دونوں ہوں گے......ان خوشبوؤں اور مہکتے پھولوں کے سنگ......محبت کے سفر پر......محبت سے قدم رکھیں گے'' وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گرد اپنے بازوؤں کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے بولا۔

''مگر آپ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا......'' اس نے شکوہ کیا۔

''اگر زندگی میں سرپرائز ختم ہو جائے تو زندگی کا کیا مزا......؟ یہ سرپرائز ہے صرف آپ کے لئے'' وہ مسکرا کر بولا۔

اور پھر اسے مزید سوالات کرنے کا موقع نہ دیا۔

وہ اپنے ساتھ جو جمع پونجی لائی تھی۔ سکندر علی نے کمال ہوشیاری سے اس کا سارا پیسہ ایک فلم بنانے میں لگوا دیا تھا۔ اس نے سکندر علی کے

ساتھ جتنی فلمیں کیں تھیں وہ کامیاب رہیں تھیں اور اس نے نئی فلم کے کامیاب ہونے کا بھی اسے یقین دلایا تھا۔ وہ ظاہراً خود ہی فلم کی پروڈیوسر، ہیروئن اور ڈائریکٹر تھی۔ مگر حقیقت میں سکندر علی اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ اسے فلم بنانے کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ تو ہر بات میں سکندر علی پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور سکندر علی اس اعتماد سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے اس کی فلم کے بجٹ میں سے اپنی دو فلمیں بنالیں تھیں اور اس کی دونوں فلمیں کامیاب ہوئیں تھیں جبکہ رینا کی اپنی فلم بری طرح ناکام ہوئی تھی...... سکندر علی کے ساتھ اس کے اسکینڈلز سے اخبارات بھرے ہوئے تھے...... اور سکندر علی ان خبروں سے لطف اٹھاتا تھا...... جبکہ وہ سب کچھ لٹانے کے باوجود بھی صرف ایک بات پر اصرار کرتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرلے...... وہ انکار بھی نہیں کرتا تھا اور شادی کرنے کے لئے ٹالتا رہتا تھا۔

وہ دو ماہ سے اس کے ساتھ بنگلے میں رہ رہی تھی۔ وہ شادی کے لئے اصرار کرتی تھی اور وہ انکار کرتا تھا۔ سکندر علی اپنی نئی فلم کے سلسلے میں اچانک بیرون ملک چلا گیا تھا۔ رینا اس کے یوں چلے جانے پر بے حد پریشان تھی۔ مگر اسے روک نہ سکی۔

اگلی صبح سکندر علی کی خوبصورت، جواں سال بیوی اپنے چار بچوں کے ساتھ اس کے بنگلے میں آئی اور آتے ہی اس نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ رینا نے اس کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اسے بھی مارا اور دھکے دے کر اسے بنگلے سے نکال کر گیٹ بند کر دیا...... رینا بہت پریشان ہوئی اور جلدی سے سکندر علی کا نمبر ملایا...... اور اس کی بیوی کے بارے میں بتایا۔

''وہ میری قانونی بیوی ہے...... اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر اور شوہر کو بچانے کے لئے جو چاہے...... کرے......'' سکندر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور...... میں......؟ میں کون ہوں؟'' رینا نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سوال تم اپنے آپ سے پوچھو تو بہتر ہے'' اس نے جواب دیا۔

''دھوکے باز...... مکار...... میں تمہارے خلاف پریس کانفرنس کروں گی...... تمہیں ذلیل و رسوا کروں گی...... تمہارے سارے پول کھولوں گی'' وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''جو چاہو...... تم بھی کرلو...... مگر ثبوت کے بغیر تمہاری بات کون سنے گا...... رہی بات رسوائی کی...... تو میں اس سے نہیں ڈرتا...... ایسے کھیل میں بہت کھیل چکا ہوں...... اور تمہاری بات سنے گا کون...... تم کوئی شریف زادی نہیں ہو جس کے حقوق کے تحفظ کے لئے این جی اوز اٹھ کھڑی ہوں گی۔ تمہارا تعلق جس پیشے سے ہے...... اس میں نہ رشتے بنتے ہیں اور نہ رشتہ داریاں نبھائی جاتی ہیں...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں سے آئی ہو...... وہیں واپس چلی جاؤ'' سکندر علی نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیسے چلی جاؤں...... تمہاری خاطر میں ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی'' وہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کہیں نہ کہیں چور دروازہ بھی ہوتا ہے اس چور دروازے سے پھر داخل ہونے کی کوشش کرو...... اب تمہارے پاس کچھ نہیں...... نہ پیسہ...... نہ پیشہ...... لیکن اپنے پیشے سے پھر پیسہ بنانے کی کوشش کرو......'' سکندر علی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے

کتنا بڑا دھوکہ کھایا تھا...... اس شخص پر اندھا اعتماد کیا تھا۔

چمن بیگم کی ساری باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگی تھیں۔ سب نے کتنا سمجھایا تھا مگر وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی...... محبت اور گھر کے تحفظ کے لئے اس نے اپنا سارا کچھ داؤ پر لگایا تھا اور اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

وہ کہاں جائے گی......؟

کون اسے پناہ دے گا......؟

کون اسے ساتھ لگائے گا......؟

کون اسے تحفظ دے گا......؟

جگی یا کوٹھا......؟

جگی اور جگی والے تو خود کہیں گم ہو گئے تھے......

اب صرف کوٹھا باقی تھا......

اور اس کے بارے میں سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا......

حوصلہ ٹوٹنے لگا...... اس کا وجود کرچی کرچی ہونے لگا۔

انوار صدیقی کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 160/- روپے

جوگی

© جوگی...... جو حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا
© وہ انمول شے کیا تھی جس نے جوگی کو دیوانہ بنا دیا تھا
© کفر اور ایمان کے درمیان جنم لینے والی پراسرار سرگزشت
© ایک ایسے گھرانے کی کہانی جس پر پراسرار موت کا سایہ تھا

☆

شمی بہت مصروف تھا جب اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا...... وہ نمبر دیکھتا تو کوئی غیر معروف نمبر تھا۔ وہ کال ریجیکٹ کر دیتا۔ پھر فون بجتا...... وہ ہیلو کہتا تو کال ڈراپ ہو جاتی۔ اس نے تنگ آ کر موبائل ہی بند کر دیا۔

برکتے کو اس کڑے وقت میں کوئی آسرا نظر نہیں آ رہا تھا جو جگو کو پولیس سے چھڑا کر لاتا۔ مجو اور پپو کا علاج کرانے میں اس کی مدد کرے۔

عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے رازداری سے مٹھو کو شمی کا کارڈ دے کر اسے فون کرنے کو کہا تھا اور وہ مسلسل اسے فون کر رہا تھا مگر جب شمی نے موبائل بند کر دیا تو اس کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔ برکتے بھی مایوس ہو گئی۔

"اماں...... پتہ نہیں وہ کون ہے؟ اور وہ بھلا ہماری مدد کیوں کرے گا......؟ ہمارے سگے باپ نے بچوں کا یہ حال کر دیا...... تو وہ غیر ہو کر ہمارے بارے میں کیوں سوچے گا؟ اماں تو بھی پاگل ہو رہی ہے۔" مٹھو نے کہا تو برکتے نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولی۔

انسان کے دل میں جب دوسروں کے لئے ہمدردی، پیٹ اور آنکھوں میں کسی قسم کی بھوک نہ ہو تو وہ سب کے لئے فرشتہ ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے...... کہ وہ بھوکا اور کمینہ انسان نہیں...... تیرے باپ کی طرح...... وہ ضرور ہماری مدد کرے گا...... سن تو کل صبح اسے پھر فون کرنا" برکتے نے مٹھو کو کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

بھاگی جب سے ہسپتال سے واپس آئی تھی اس نے واویلا مچا رکھا تھا۔ ملکے اور اس کے بچوں کو گالیاں بکتی...... جگو کو بدعائیں دیتی جس

نے اس کے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا تھا۔ ملکا خاموش تھا۔ اس کے پاس کسی کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا...... وہ غصے میں بھری برکتے کے پاس گئی اور اس سے بھی لڑ جھگڑ کر اس کے چھوٹے بچوں کو مار پیٹ کر آئی۔ ہر وقت ہنگامہ برپا رکھتی......

مٹھو نے دوبارہ شمی کو صبح کے وقت فون کیا تو اس نے فون اٹھا لیا...... مٹھو نے اس سے بات کی اور اپنی ماں کا حوالہ دیا تو شمی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا تم رانی کے بھائی ہو؟'' شمی نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... وہی......'' مٹھو نے خوش ہو کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں تمہارے بھائی کو چھڑانے کی بات کرتا ہوں اور تم اپنے بھائیوں کو لے کر میرے پاس آ جانا...... میں ان کا علاج کرا دوں گا...... اماں کو بولنا فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا'' شمی نے اسے تسلی دی تو مٹھو خوش ہو گیا اور اگلے روز ہی وہ بھائیوں کو لے کر اس کی کوٹھی چلا گیا۔ اس نے شہر کے سب سے اچھے ہسپتال میں ان کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا...... پپو کی کٹی ٹانگ کا آپریشن کیا گیا اس کا زخم بہت بگڑ چکا تھا اور مجو کے کٹے ہاتھ کا بھی علاج کیا گیا...... چند روز بعد دونوں کی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مصنوعی اعضاء ان کے جوان ہونے پر لگانے کو کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا۔ مٹھو، بھائیوں کے ساتھ جتنے روز ہسپتال رہا۔ اس نے ان کے علاج اور کھانے پینے کا خرچہ اٹھا رکھا تھا۔ جگو کو بھی جیل سے چھڑایا اور جب مٹھو واپس جانے لگا تو اس نے اسے روپے دیئے کہ وہ جا کر برکتے کا بھی علاج کرائے اور وہ چند روز تک ان سے ملنے آئے گا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے عجیب طرح کی سرشاری اپنے اندر محسوس کی...... اسے یوں لگا جیسے اس نے رانی کا کچھ قرض ادا کر دیا ہو...... رانی نے اس کی زندگی بدلی تھی اور وہ بہت سے مجبور و بے بس لوگوں کی زندگیاں بدلنا چاہ رہا تھا...... وہ بہت سی سماجی تنظیموں کو فنڈ ز دیتا...... اور جو کوئی مجبور و بے آسرا و بیمار اس کے پاس مدد کے لئے آتا تو وہ کسی کو انکار نہ کرتا۔

ایسے وقت اسے استاد جمال بہت یاد آتا جس نے اس کے اندر انسانیت سے ہمدردی اور پیار کی شمع روشن کی تھی جس نے اسے 'نفس کشی' سکھائی تھی۔ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینا...... دوسروں کی خوشیوں اور دکھوں کی پرواہ کرنا...... وہ مزاج کا سخت تھا مگر اس کا دل موم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ شمی کو افسوس تھا کہ وہ استاد کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ جب وہ سنگاپور سے واپس آیا تو اسلم نے اس کو اطلاع دی کہ اس کے جانے کے چند روز بعد ہی استاد کا انتقال ہو گیا تھا اور جو دو لاکھ روپے اس نے استاد کو دیئے تھے وہ امانت استاد نے مرنے سے پہلے اسلم کو دے دی تھی جب اسلم استاد سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ استاد نے اس کی دی ہوئی رقم میں سے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔ اس نے شمی کا کسی طرح بھی احسان نہیں لیا تھا اس نے اسلم کے ذریعے بس اس کو ایک پیغام پہنچایا تھا۔

''قدم قدم پر تمہیں مجھ سے زیادہ پریشان اور دکھوں کے مارے لوگ ملیں گے...... بس ان کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کرنا...... ممکن ہو سکے تو ایسے لوگوں کی مدد کرنا''

استاد کے پیغام کو اس نے اپنے دل کے ہر خانے میں محفوظ کر لیا تھا۔ وہ جب کسی ایسے بے بس انسان کو دیکھتا تو ضرور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا اور بدلے میں دو چہرے اسے مسکرا کر دیکھتے اور وہ ان کی مسکراہٹ سے ہی خوش ہو جاتا...... ایک چہرہ رانی کا ہوتا اور دوسرا استاد جمالے

کا...... کبھی کبھار وہ شخص بھی ضرور اس کے ذہن میں آتا جس نے انتہائی بھوک کے عالم میں اسے دس روپے دیئے تھے۔ اس وقت وہ دس روپے اس کے لئے کتنی بڑی نعمت ثابت ہوئے تھے۔ اس کی قدر اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ دس روپے حقیقت میں اس مشکل وقت میں اس کے اندر کی بھوک کو مٹانے میں کتنی بڑی مدد ثابت ہوئے تھے جو اس کے اندر کی تسکین کا باعث بنے تھے۔ ان روپوں نے اس کے دل میں اس شخص کی قدر و منزلت بڑھائی تھی اور اس کے اندر تشکر کا احساس پیدا کیا تھا۔ اس کے اندر تمام مردہ امیدوں اور آس کی دبی چنگاریوں کو دیئے کا کام دیا تھا۔ جب کوئی کسی کو مشکل وقت میں کچھ دیتا ہے تو اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کے اندر کی دنیا میں کیا کردار ادا کر رہا ہے...... وہ لوگ جو بھکاری نہیں ہوتے اور جو اپنے بھرم کی خاطر خاموش رہتے ہیں مگر جن کی بے بسی ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے اور یاسیت سے چہرے مرجھائے ہوتے ہیں...... وہ ایسی خاموش مدد سے اپنے اندر کیا کچھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ صرف وہی جانتے ہیں...... جن کے اندر اس مدد سے بہت کچھ ٹوٹتا بھی ہے اور بہت کچھ پیدا بھی ہوتا ہے...... احساسات مجروح بھی ہوتے ہیں اور تشکرانہ احساسات جنم بھی لیتے ہیں...... وہ وقت اور وہ مدد اسے ساری زندگی نہیں بھولتے...... یاد آنے پر وہ دکھی بھی کرتے ہیں اور سرشار بھی...... انسان عجیب کیفیتوں سے گزرتا ہے...... وہ کسی کو بتانا بھی چاہتا ہے مگر بہت کچھ چھپانا بھی چاہتا ہے...... اور بہت کچھ چھپا کر وہ اپنا آپ اس میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ عجیب سی حالت ہوتی ہے...... شامو کو نہ وہ دس روپے بھی بھولے...... نہ اس شخص کا چہرہ...... نہ استاد جمالا...... اور نہ ہی اس کی محبت...... نہ رانی...... اور نہ ہی وہ چاکلیٹ......" سب کچھ اس کے اندر محفوظ تھا...... ان احساسات نے اس کو اور بہت سے احساسات سے روشناس کرایا تھا مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ جوں کے توں قائم تھے...... اسے جب بھی وقت ملتا ماضی کی بہت سی تلخ یادیں اسے ستانے لگتیں...... جب وہ نرگس، فردوس اور جمی کے ساتھ ناچتا تھا اور اس ناچ گانے کے دوران کتنی ذلت سہتا تھا...... لوگوں کی چھیڑ خانیاں اور بدتمیزیاں سہتا مگر ان تلخ یادوں میں صرف تین لوگوں سے وابستہ خوبصورت اور مثبت یادوں کو وہ اپنی زندگی کا کل سرمایہ سمجھتا۔ یہ یادیں اس کے لئے امیدیں تھیں...... اس کے جینے کا سہارا تھیں...... اس کے لئے خوشی کا پروانہ تھیں...... اس کی سوچ کو مثبت رکھنے میں بنیاد ثابت ہوئیں تھیں...... ورنہ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا...... اس کے پاس اپنی ذات سے وابستہ نہ تو زندہ رہنے کی کوئی وجہ تھی اور نہ ہی وہ کسی کو اپنی زندگی کے لئے کوئی وجہ بنا سکتا تھا...... نہ بیوی...... نہ بچے...... نہ کوئی رشتے دار مگر بہت سے وقتی دوست...... جو اس کے ہنر کی وجہ سے اس کی عزت بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ دوستی بھی بناتے تھے...... اس کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں تھا...... سوائے تین چہروں اور ان کی یادوں کے...... اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی...... وہ بس چلا جا رہا تھا جب تک زندگی ساتھ دے گی...... اور اس نامعلوم منزل تک پہنچنے میں اسے جس عزم، حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی وہ اسے اپنے اندر ان چیزوں سے ملتی تھی۔

☆

برکتے اس کے لئے دن رات دعائیں کرتی...... اٹھتے بیٹھتے اس کی سانسوں سے بھی شامو کے لئے دعائیں نکلتیں...... بھاگی نے بجو کے رہا ہونے پر بہت شور مچایا تھا۔ ملکے سے جی بھر کر لڑی تھی...... اور بجو کے ساتھ پھر مار کٹائی کی کوشش کی تھی۔ مٹھو، برکتے کو خود ہسپتال لے کر گیا اور اس کا علاج کروانا شروع کیا۔ اس کی حالت بھی بہتر ہونے لگی تھی وہ چھڑی کے سہارے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک بار شامو

سے ضرور ملے......اور اس سے پوچھے کہ وہ ان سے اتنی ہمدردی کیوں کرتا ہے......اس نے ان کا اتنا ساتھ کیوں دیا ہے؟ وہ رانی کا پوچھنے آیا تھا...... نجانے وہ رانی کو کیسے جانتا تھا......شاید وہ رانی کی خاطر سب کچھ کر رہا تھا......مگر اس نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا......رانی کتنی بدقسمت ہے جو اس نے اتنے ہمدرد انسان کو کھو دیا......اور پھر خود بھی کہیں گم ہو گئی......نجانے کہاں......؟

برکتے کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے......گڈی کو قبر میں اتار کر وہ دکھی تھی مگر مطمئن بھی تھی......لیکن رانی کو کھو کر وہ بہت بے چین اور مضطرب تھی......رانی کا سوچ کر وہ پریشان اور بے قرار ہو جاتی......

نجانے کہاں چلی گئی ہے......؟

کاش! وہ ایک بار آ جائے......

وہ دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کرتی اور روتی رہتی۔

''مٹھو......یہ دیکھ، اس فلمی لڑکی کی شکل ہماری رانی سے کتنی ملتی ہے'' شبو نے اخبار کا ایک چرمر ٹکڑا مٹھو اور جمو کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ جو فلمسٹار ریتا کے ایک فلمی کلوز اپ کا تھا۔

''شکل ملتی ہے......پر......ہے تو نہیں'' مٹھو نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں......وہ تو پتہ نہیں کہاں چلی گئی......کبھی کبھی مجھے سوتے میں خواب آتا ہے......جیسے اسے کسی بڑے سے مگرمچھ نے کھا لیا ہو'' شبو نے معصومیت سے کہا۔

''ہاں......تو کھا ہی لیا ہوگا......ورنہ واپس نہ آ جاتی'' مٹھو جواب دیتا تو وہ خاموش ہو جاتی اور اس چرمر کاغذ کو سنبھال کر اپنی چیزوں کے ساتھ رکھ دیتی......جن کو وہ کسی کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔

''رانی مر چکی ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی'' ملکے نے سب بچوں کے ذہن میں اس بات کو پکا کر دیا تھا اور اب کوئی بھی اس بات کو سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور کبھی آ جائے گی......سوائے برکتے کے......

☆

ریتا بیگم اپنا سب کچھ لٹا کر پھر اس حویلی کی طرف لوٹ رہی تھی......جس کو اس نے یہ سوچ کر چھوڑا تھا کہ اب وہ کبھی دوبارہ یہاں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ وہ بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گلی میں داخل ہوئی اچھو حسب معمول ہار پرو رہا تھا......ریتا اس کے پاس کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی......اچھو نظریں جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا......جیسے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہا ہو......اس نے آہ بھری اور سیڑھیاں چڑھنے لگی......اچھو نے ایک ٹک اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔

اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچھو کے الفاظ یاد آنے لگے 'جو ایک بار یہ سیڑھیاں چڑھتا ہے......وہ مر کر ہی اترتا ہے' اور اس نے جیتے جی ان سیڑھیوں سے اترنے کی کوشش کی تھی مگر نجانے ان سیڑھیوں میں کوئی مقناطیسی کشش تھی جو انہیں پھلانگنے والوں کو پھر اپنی طرف کھینچ لاتی

تھی۔۔۔۔۔۔ وہ مایوسی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی تو شیریں بائی بڑی شان اور تمکنت سے اس کی جگہ مسہری پر بیٹھی تھی۔ چمن بیگم اسے پان کی گلوری بنا کر دے رہی تھی۔ اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر دونوں چونک گئیں اور اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگیں۔۔۔۔۔۔ اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ چہرہ مرجھایا ہوا اور اداس آنکھیں اس کے اندر کی ویرانی کی داستان سنا رہی تھیں۔

''آ۔۔۔۔۔۔ آپ؟'' چمن بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

جواباً وہ خاموش رہی اور سر جھکا لیا۔

''آپ دوبارہ یہاں کیوں آئی ہیں؟ آپ کو جانے سے پہلے سب نے کتنا سمجھایا تھا کہ یہاں آنے والے مرد۔۔۔۔۔۔ ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ خواب تو آنکھوں میں بھرتے ہیں مگر تعبیر دینا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ وہ تتلیوں سے ان کے رنگ بھی چھین لیتے ہیں اور ان کے پروں کو بھی نوچ ڈالتے ہیں اور جب وہ بے دم ہو کر گر جاتی ہیں تو انہیں تڑپتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ طوائفوں کے ساتھ شروع سے یہی ہوتا آ رہا ہے مگر ہر طوائف ہر بار دھوکہ کھا جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر۔۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔۔ اس کی زندگی میں آنے والا مرد سب مردوں سے مختلف ہوگا۔۔۔۔۔۔ وہ اس کے ساتھ برا نہیں کرے گا۔۔۔۔۔۔ مگر وہ تب اس پر یقین کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ جب وہ کسی قابل نہیں رہتی۔۔۔۔۔۔ یقیناً آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔۔۔۔۔۔'' شیریں بائی نے کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''کیا ہم نے آپ کو جانے سے پہلے سب کچھ نہیں سمجھایا تھا۔۔۔۔۔۔؟'' چمن بیگم نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''اور۔۔۔۔۔۔ اب آپ دوبارہ یہاں آ گئی ہیں؟'' شیریں بائی نے کہا۔

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔

''جبکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اب آپ کے لئے یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ نہ وہ مقام۔۔۔۔۔۔ نہ وہ شان و شوکت اور نہ ہی وہ عزت۔۔۔۔۔۔ جو اس حویلی نے آپ کو دی تھی'' شیریں بائی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''اب آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟'' شیریں بائی نے پوچھا۔

''طوائف کو۔۔۔۔۔۔ کوٹھے کے علاوہ اور کہیں پناہ نہیں ملتی'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شیریں بائی نے چمن بیگم کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''آپ کیا سوچ کر یہاں آئی ہیں؟'' شیریں بائی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''زندگی کی آخری سانسوں تک سر چھپانے کے لئے، اس کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ نہیں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کس حیثیت سے۔۔۔۔۔۔؟ کیا آپ وہی مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہیں جواب میرے پاس ہے'' شیریں بائی نے کہا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

''نہیں...... میں کوئی مقام حاصل نہیں کرنا چاہتی...... ملازمہ کی حیثیت سے بھی رہ لوں گی اور...... طوائف کی حیثیت سے بھی آپ جو چاہیں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

چمن بیگم نے شیریں بائی کے کان میں کچھ کہا اور شیریں بائی نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

''ٹھیک ہے...... حویلی کے پچھواڑے میں آپ طوائفوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں اور جب آپ کے رقص کی باری ہوا کرے گی...... ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے...... اس کے علاوہ آپ نہ ہم سے کچھ طلب کریں گی اور نہ ہی آپ کو کچھ دیا جائے گا'' شیریں بائی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے چمن بیگم کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر حویلی کے پچھواڑے میں چلی گئی۔

☆

برکتے نے جب سے آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے چلنا شروع کیا تھا اس نے اپنے بچوں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں ان کی ہمت بندھائی تھی۔ سب بچوں نے برکتے کے ساتھ مل کر ملکے کے ساتھ تعلقات ختم کر لیے تھے۔

''تم لوگ بھکاریوں کے گھر پیدا ضرور ہوئے ہو...... مگر یہ ضروری نہیں کہ ساری زندگی بھیک مانگ مانگ کر بھکاری ہی رہو...... جو انسان محنت کے سہارے زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے...... رب ضرور اس کی مدد کرتا ہے...... محنت کی راہ مشکل ضرور ہوتی ہے مگر پیٹ کی بھوک کو سکون محنت کی روٹی ہی دیتی ہے...... لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے رب کے آگے ہاتھ پھیلاؤ...... وہ پیٹ بھر کر روٹی بھی دے گا اور سکون بھی'' برکتے نے سارے بچوں کو سمجھایا تھا۔ جو اور مٹھو بھی بھیک مانگ مانگ کر تنگ آ گئے تھے۔ ماں کے کہنے پر جو نے ڈرائیوری سیکھ لی۔ مٹھو نے ایک ورکشاپ میں کام شروع کر دیا۔ شبو نے لوگوں کے گھر صفائی کرنے کا کام شروع کر دیا۔ پپو اور مجو گھر میں ماں کے پاس رہ کر پڑھائی کرنے کی کوشش کرتے۔

جلد ہی انہوں نے شہر سے باہر ایک کچی بستی میں ایک چھوٹا سا پکی اینٹوں والا گھر کرائے پر لے لیا۔ سب کمائی کرنے لگے اور روز بروز ان کے حالات بہتر ہونے لگے۔

ملکا اور بھاگی جھگی میں ہی رہ گئے...... دونوں دن بھر بھیک مانگنے نکلتے...... شام کو گھر لوٹتے...... صبح جانے سے پہلے گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا ہوتا...... رات سونے سے پہلے پھر لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی ہوتی...... بھاگی اسے کوستی جس نے اسے ورغلا کر اس سے شادی کی تھی اور پھر اس کی زندگی خراب کی تھی...... اس کے ہاں پھر کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا اور اس کی ذمہ دار بھی وہ ملکے اور بجو کو ٹھہراتی مگر اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس نے گڈی کو کس طرح تباہ کیا تھا...... وہ مطمئن تھی...... اسے صرف شکوے تھے...... وہ ہر ایک سے شکوے کرتی رہتی...... برکتے اور اس کے بچوں کے بارے میں سن کر اسے ہمیشہ حسد ہوتا تھا اور وہ جلن کے مارے پھر ملکے کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیتی...... یہی ان کے روز و شب کا معمول تھا۔

☆

شامو کے گھر سے جانے کے بعد فردوس نے کچھ ہیجڑوں کے گروپ میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر اس کی بڑھتی عمر اور چہرے کی جھریوں کو میک اپ کی دبیز تہیں بھی نہیں چھپا سکیں اور بڑے شہر کے ہیجڑوں کے گروہ میں پڑھے لکھے نوجوان لڑکے بھی اپنی مرضی سے شامل ہو کر ناچ

گانے کی محفلوں میں شرکت کر کے کمائی کرتے۔ وہ سب بہت ماڈرن اور فیشن ایبل تھے۔ فردوس کی آواز، فیشن، کپڑوں اور میک اپ کو سب ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے...... اس کے لئے وہاں رہنا بھی مشکل ہو گیا...... وہ اپنے طور پر شادی بیاہ کی محفلوں میں جا کر ناچ گانا کرنے کی کوشش کرتی مگر وہاں بھی قسمت اس کا ساتھ نہ دیتی۔ وہ شہر سے باہر چند ہیجڑوں کے ساتھ رہتی تھی۔ جو اس سے کھانے پینے اور گھر کا کرایہ بھی مانگتے تھے اور اسے اخراجات پورے کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا تھا...... وہ تنگ آ گئی تھی۔ روزی روٹی کا کوئی وسیلہ نہیں بن رہا تھا اور شامو کے پاس جا کر کچھ مانگتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔

شامو کے پاس فرصت کم ہی ہوتی تھی۔ وہ جب بھی ڈرائیور کے ساتھ جا رہا ہوتا تو متلاشی نگاہوں سے کسی کو ادھر ادھر دیکھتا...... ہر بھکارن کو چونک کر بار بار دیکھتا، اسے امید تھی کہ کسی روز کہیں سے رانی بھیک مانگتی ہوئی آ جائے گی اور وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے محل نما گھر میں لے آئے گا اور پھر اسے اپنے اس گھر کی ''رانی'' بنا کر رکھے گا۔ وہ اپنا سب کچھ اسے سونپ دے گا...... کہ...... اس کا سب کچھ...... اسی کا تو ہے...... وہ تو اس کی امانت کی حفاظت کر رہا تھا...... وہ اسی امید پر جی رہا تھا ہر ٹریفک سگنل پر اسے تلاش کرتا۔

وہ ایک بڑے شاپنگ سنٹر میں شاپنگ کے لئے گیا۔ اس نے اچانک فردوس کو میلا سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتی...... اور جب کوئی من چلا اس طرف بغور دیکھتا تو اس کو چھیڑ کر کہتا۔

''پہلے ٹھمکا لگا......''

وہ پہلے اسے گالیاں بکتی۔ جب وہ پچاس یا سو کا نوٹ دکھاتا تو وہ سرِ عام ناچنا شروع کر دیتی...... لڑکے اور مرد اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اس سے چھیڑ خانیاں کرتے اس کے ساتھ گھٹیا مذاق کر کے اسے پیسے دیتے اور وہ پیسوں کو جھپٹ کر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر وہاں سے فرار ہو جاتی......

شامو نے اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے سخت دکھ ہو رہا تھا...... جب وہ مجمع میں سے بھاگ رہی تھی تو شامو نے اس کو آواز دی...... مگر فردوس نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنی چادر سے چہرہ چھپا کر تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی...... شامو انتہائی مایوسی اور غم کے عالم میں ایک ویران گوشے میں چند سیڑھیوں میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل شدتِ غم سے پھٹ رہا تھا۔

''انسان اس پیٹ اور بھوک کے ہاتھوں کتنی ذلت سہتا ہے...... کتنا رسوا ہوتا ہے اور کتنا بے عزت'' شامو کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے۔ اس نے ارد گرد گھومتے پھرتے، کھاتے پیتے خریداری کرتے لوگوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اندر سے بہت سے انسانوں کے دکھ ایک جیسے ہیں...... مگر باہر سے سب دوسروں سے کتنے بے نیاز ہیں...... ہر ایک کا غم اس کا اپنا غم ہے...... اور...... ہر ایک کی زندگی اس کی اپنی زندگی ہے...... اور ہر ایک کی خوشی اس کی اپنی خوشی ہے...... ہر ایک کی اپنی دنیا ہے...... اور یہ دنیا کتنی ویران ہے...... یا خوش ہے...... اس کی خبر وہ کسی دوسرے انسان کو نہیں دینا چاہتا...... مگر پھر بھی یہ راز کسی نہ کسی طرح افشا ہو جاتا ہے...... اندر چھپے غم ابلتے لاوے کی طرح بہنے لگتے ہیں۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جب کوئی ٹوٹا دل...... کسی زخمی دل کی چھوٹی سی بات پر اس کی طرف چونک کر دیکھتا ہے...... تو اس کا چہرہ اور آنکھیں اندر کی اس کیفیت کو بیان کر دیتی ہے...... کتنا سنبھل کر ایک دوسرے سے غم چھپانے والے پھر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔

انسان کو انسان سے فرار ممکن نہیں۔

جیسے

نفس کو روح سے......اور

روح کو جسم سے......اور

جسم کو اس کی ضروریات سے......اور

ضروریات کو طلب سے......اور

طلب کو خواہش سے......اور

خواہش کو حرص ولالچ سے......اور

حرص ولالچ کو بھوک سے......اور

شمیم نوید کے قلم سے ایک پراسرار سلسلہ

دیدبان

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی
پراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں
وہ سانپوں سے بڑھ کر زہریلی تھی
پراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں
خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان

دو حصے شائع ہو چکے ہیں

جب کسی شے کی 'بھوک' بڑھتی چلی جاتی ہے تو وہ انسان کو اندر سے ایسا مضطرب کرتی ہے کہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اسے یاد رہتا ہے تو اپنا 'وجود'...... جسے بچانے کے لیے وہ سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہے...... اور جب وہ بازی بھی ہار دیتا ہے...... تو پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی 'بھوک' تو جوں کی توں اس کے اندر موجود تھی...... اور...... ہے...... اس بھوک کو مٹانے کے لیے اس نے جتنی کوششیں کیں۔ سب رائیگاں گئیں۔ وہ احساس زیاں، پھر اسے مضطرب کرنے لگتا ہے۔ 'اضطراب' سے 'اضطراب' تک کا سفر پھر جاری رہتا ہے اور انسان کو اس سے نہ فرار مل پائی ہے اور نہ ہی قرار۔

من و سلویٰ

دورِ حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول...... من و سلویٰ...... جس کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ من و سلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزق حلال جو اُمت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من و سلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزق حلال پر قانع...... انہیں انواع و اقسام کے زمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کی...... رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

(۲۰)

ماسٹر باسط علی نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سائیں مٹھا اور اس کی باتیں اٹھتے، بیٹھتے ان کے اندر سلگتی چنگاریوں کو بھڑکانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ اب وہ آگ دن بدن ایسے الاؤ میں تبدیل ہو رہی تھی، جس کے شعلے ہر لحہ بلند ہوکر ان کے دماغ کے خلیوں کو جھلسا رہے تھے۔ اک ایسی آگ بھڑکی تھی جو کسی پل اسے سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔ سکون پانے کے لئے وہ اپنا شہر چھوڑ کر دور پہاڑوں میں آکر بسا تھا۔ نازی کو طلاق دینے کے بعد وہ صرف چند ماہ اس شہر میں رہا تھا۔ ملازمت بھی دلجمعی سے نہ کر سکا اور اسے جلد فارغ کر دیا گیا۔ ایک دو اور نوکریاں کیں مگر اندر کے اضطراب نے اسے کوئی بھی کام ٹھیک طرح سے نہ کرنے دیا۔ اس نے والدین سے ملنے گاؤں جانا چاہا، مگر ہمت نہ کر پایا کہ ان کا سامنا کیسے کر پاتا کئی شہروں میں خوار ہوکر وہ ان پہاڑوں میں آ بسا تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے بہت دور، سکون کی تلاش میں۔ چند سو نفوس پر آباد بستی میں ملے جلے لوگ رہتے تھے، مگر سب ایک دوسرے سے بہت محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ اس نے سکول میں ٹیچر کی نوکری کر لی تو اس کی عزت میں اور اضافہ ہو گیا...... یہاں سب کچھ تھا۔ خوبصورت قدرتی نظارے اور خوبصورت چہروں والے لوگ، مگر اس کا دل یونہی بے سکون رہتا۔ اذیت کے جن لمحات میں سے گزر رہا تھا، اس کی تکلیف کا سوائے اس کے اور خدا کے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ماسٹر صاحب بہت اچھے اور نیک انسان ہیں، ان جیسا کوئی دوسرا انسان اس بستی میں نہیں۔ ماسٹر صاحب بے ضرر انسان ہیں، وہ کسی کو، کوئی اذیت دیں، اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' بستی کے ہر شخص کے ان کے بارے میں ایسے ہی خیالات تھے۔ انہیں یہاں بہت عزت ملی تھی...... مگر سائیں مٹھا نجانے کہاں سے آ گیا...... اور ان کی چوری پکڑنا شروع کر دی، وہ بوکھلا گئے۔ پچھلے چند ماہ سے سائیں کی باتوں نے ان کے اندر کو اس قدر بھڑکا دیا تھا کہ اب فرار ممکن نہیں تھی اور یہی سوچ کر انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے فیصلے پر بہت سوچا تھا، بہت دفعہ ہمت ہاری تھی، کئی بار اپنے آپ کو حوصلہ دیا تھا اور بالآخر انہوں نے اپنی کٹیا میں اپنے سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ سارا سامان سمیٹ کر اس نے پھر بکھیر دیا۔ ''مجھے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں...... بھلا زندگی چیزوں کی محتاج ہوتی ہے......؟

''پھر زندگی کس کی محتاج ہوتی ہے......؟''

''انسان کی......؟''

''اور انسان...... کس کا...... محتاج ہوتا ہے......؟''

وہ سوچ میں ڈوب گیا......

''انسان کس کا محتاج ہوتا ہے......؟''

بار بار ان کے ذہن میں سوال گونجنے لگا، سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹنے لگا۔

''شاید...... انسان...... انسان کا محتاج ہے۔''

''نہیں...... بالکل بھی نہیں۔''

پھر...... کس کا......؟

''شاید دنیا کا......''

''دنیا کا...... نہیں...... کبھی بھی نہیں'' ان کے ذہن نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

''پھر...... کس کا......؟''

وہ کٹیا کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور اردگرد سرسبز و شاداب اونچے، نیچے پہاڑوں، نیلگوں آسمان اور پہاڑوں کے وسط میں خوبصورت پھلدار درختوں اور رنگ برنگی پھولوں پر نظر دوڑانے لگا...... ہر چیز ایک سوال بن ان کے ذہن میں ابھری...... اور وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی۔

''میں اپنے ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتا...... میں کس قدر کند ذہن انسان ہوں۔ اس قدر لاعلم...... مجھ سے اچھا تو سائیں مٹھا ہے...... ان پڑھ...... گنوار انسان...... ایسی باتیں کرتا ہے کہ میں سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور مجھے کسی بھی بات کا کچھ علم نہیں...... ساری زندگی اپنے آپ سے لڑنے بھڑنے میں گزاری اور حاصل کیا ہوا......؟ کچھ بھی نہیں......!

میں اپنے سوالوں کا خود جواب نہیں دے سکتا...... میں کیسا بے علم انسان ہوں...... یوں لگتا ہے...... زندگی کا سفر اکارت گیا ہے۔'' ان کے اندر کے اضطراب اور چبھن میں بہت اضافہ ہونے لگا، وہ پریشان ہو کر سڑک پر چلنے لگے۔ ایک درخت کے نیچے سائیں مٹھا چھوٹے بچوں میں کوئی چیز بانٹ رہا تھا اور بچوں نے اسے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ماسٹر باسط حیرت سے انہیں دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سائیں کے پاس آ گئے۔

''اب تم لوگ جاؤ...... کل آنا...... جاؤ...... اب...... چلے جاؤ۔'' سائیں نے نرم لہجے میں بچوں کو کہا اور سب چلے گئے۔

''اب کیوں پریشان ہو رہے ہو...... ماسٹر......؟ سائیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک سوال نے الجھا دیا ہے......'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''صرف ایک سوال نے......؟ تمہارا تو ہر سوال تمہیں الجھاتا ہے...... اوپر دیکھو...... تمہارے سوال کا جواب اس میں ہے۔'' سائیں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا تو ماسٹر باسط علی نے چونک کر اوپر دیکھا۔ وسیع نیلگوں آسمان سے ان کی نگاہیں یوں ٹکرائیں جیسے پہلی بار وہ اسے دیکھ رہے ہوں۔ وہ اپنی نظریں اس پر یوں دوڑا رہے تھے جیسے کسی کی تلاش میں کوئی ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پہلی بار آسمان کو دیکھ رہے ہوں یا پھر پہلی بار اس خاص نظر سے دیکھ رہے ہوں۔ اس نظر میں نجانے کہاں سے اتنی جستجو اور عجیب سی لذت بھر گئی تھی کہ وہ خود حیران رہ گئے۔ شاید سائیں کی فیض نظر انہیں بہت کچھ دکھا رہی تھی...... یا پھر...... کوئی اور......؟ آسمان کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے دل کے اندر اتنی وسعت پیدا ہو رہی تھی کہ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے اندر کیا شے وسعت پا رہی ہے۔ دل کے دریچے یوں کھل رہے تھے جیسے روشنی کی کوئی کرن تاریک

تہوں کے اندر گھس کر اسے روشن کرتی جاتی ہے۔ ماسٹر باسط علی کے دل ونگاہ میں عجیب سی وسعت پیدا ہو رہی تھی۔

''یہ...... میں کیا دیکھ رہا ہوں...... اور میرے اندر کیا ہو رہا ہے؟ ماسٹر باسط علی نے چونک کر سوچا اور سائیں کی جانب دیکھا...... سائیں کے لبوں پر مسکراہٹ نمایاں تھی اور آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی جیسی وہ اپنے دل کے اندر محسوس کر رہا تھا۔

''سناؤ...... ماسٹر...... کیا نظر آیا؟'' سائیں نے پوچھا۔

''وہ...... وہ......، وہ ہکلانے لگے اور اپنے چہرے پر آنے والا پسینہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔''

''معلوم نہیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ماسٹر باسط نے کہا۔

''چلو...... جو کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ اسی کو سمجھ لو۔'' سائیں نے ہنس کر کہا۔

''میں کچھ بتا نہیں سکتا۔'' ماسٹر باسط علی نے کہا۔

''جو سمجھ میں تو آئے...... مگر...... کوئی بتا نہ پائے...... وہی تو حق، سچ ہے۔'' سائیں نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

''کیا مطلب......؟''

''انسان بھی تو کہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت سمجھتا ہے...... مگر جب اس کی حقیقت پوچھو تو گھبرا جاتا ہے...... بھولے بادشاہ...... اگر انسان اپنے آپ کو سمجھ گیا، تو اس کو سمجھ گیا...... جو اپنے آپ کو نہ سمجھ پایا تو اس کو کیا سمجھے گا......'' سائیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... سائیں جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... انسان کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے...... اور اپنے آپ کو سمجھنا اس سے بھی مشکل۔''

ماسٹر باسط علی آہ بھر کر کہا۔

''ارے...... کچھ بھی مشکل نہیں...... روشنی کی ایک کرن، خوشبو کا جھونکا اور آگ کی ننھی سی چنگاری۔ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ جب وہ دل کے اندر اپنے 'نور' کی کرن داخل کرتا ہے تو سب کچھ روشن ہو جاتا ہے اور جب معرفت کی روشنی عشق کی آگ کو بھڑکاتی ہے تو سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے...... نہ جسم، نہ جان باقی رہتی ہے...... صرف عشق اور...... روح۔ روح عشق کی طاقت سے اس تک پہنچ جاتی ہے۔

ایمان سلامت ہر کوئی منگے   عشق سلامت کوئی
منگن ایمان، شرماون عشقوں   دل نوں غیرت ہوئی ہو
جس منزل تے عشق پچاوے   ایمان خبر نہ کوئی ہو
عشق سلامت رکھیں باہو   دیاں ایمانوں دھروئی ہو

ماسٹر باسط علی نے گہری سانس لی اور خاموشی سے سائیں کی طرف دیکھنے لگے۔

''جا...... اک منزل تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ کیوں وقت ضائع کرتا ہے...... اگر تو ٹھہر گیا تو پھر ساری زندگی کے لئے ٹھہر جائے گا۔ جا...... اپنے عشق کو ڈھونڈ...... تیرے اندر ہی کہیں چھپا ہے، مگر تجھے نظر ہی کچھ نہیں آ رہا، سائیں نے کہا، تو ماسٹر باسط علی نے گہری استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تو جس سفر پر جا رہا ہے...... چلا جا...... دیر کیوں لگا رہا ہے...... تجھے کس کا انتظار ہے......؟'' سائیں نے کہا۔

''ہاں...... میں نے ارادہ کر لیا ہے'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''صرف ارادہ......؟ تجھے تو سفر کر لینا چاہئے۔

اگر تو نے اسے کھو دیا، تو بہت کچھ کھو دو گے۔ بہت کچھ...... بہت کچھ۔'' سائیں بولتا ہوا اور چھن چھن کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ماسٹر باسط علی اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ ان کے دل کی دنیا میں بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ قلب وروح میں بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ قلب وروح میں اک عجیب سا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اک عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ اک ہنگامہ سا برپا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ مضطرب ہو کر اپنی کٹیا میں واپس لوٹ آئے۔

☆

نازی اور تیمور بے حد خوش تھے۔ دونوں کورٹ میرج کرنے کے بعد حجلۂ عروسی میں بیٹھے تھے۔ دونوں کے دل خوشی اور مسرت کے جذبات سے سرشار ہو رہے تھے۔ نازی اس سے قبل دو دفعہ سیج پر بیٹھی تھی مگر ہر بار اس کے جذبات مختلف تھے۔ شاہ زیب کی سیج پر وہ بہت دکھی دل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے تھے اور اس کا دل مسلسل روتا رہا تھا۔

باسط علی کی سیج پر بیٹھے ہوئے وہ خوش بھی تھی اور مشکوک بھی۔ باسط علی کے بدلے رویے نے اس کے دل کی خوشی کو گرہن لگا دیا تھا۔ اس کی خوشی ماند پڑ چکی تھی اور اب تیمور کی سیج پر بیٹھے ہوئے، اس کی قلب وروح سرشار تھی، کیونکہ اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جو اسے...... سب سے زیادہ چاہتا تھا اور نازی کو اپنی پوری زندگی میں یہی بات تو عزیز تھی کہ کوئی اس کی بھرپور پذیرائی کرے۔ اس کی محبت کا بھرپور جواب دے، بلکہ اس سے بھی زیادہ...... وہ جس طوفانی اور جذباتی محبت کی خواہشمند تھی۔ تیمور نے اس سے ایسی ہی محبت کی تھی اور اب وہ اس محبت سے سرشار ہونے جا رہی تھی۔

شعیب کا گھر چھوڑنے کے بعد تیمور نے اس شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ملازمت کر لی تھی اور دوست کی وساطت سے ایک گھر کرائے پر لے کر سب سے پہلے شادی کی تھی۔ دونوں نے بہت محبت سے گھر کو سجایا تھا اور اپنی سیج بھی خود ہی سجائی تھی اور اس کو سجاتے ہوئے دونوں کتنے خوش تھے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

نازی عروسی لباس میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ گلاب کی خوبصورت ادھ کھلی کلی کی مانند نرم ونازک...... اب کی بار اس نے نہ تو زیادہ قیمتی زیورات پہن رکھے تھے اور نہ ہی اس کا لباس بہت قیمتی تھا، مگر اس کے چہرے پر پھیلے خوبصورت قوس وقزح کے رنگ اس کے اندر کی خوشی کا پتہ دے رہے تھے۔

تیمور بھی بہت خوش تھا۔ اس نے جس کو چاہا تھا، جس سے بہت محبت کی تھی اور جس کو پانے کے لئے اس نے اپنا گھر، گھر والے، دولت و جائیداد سب کچھ چھوڑی تھی، وہ حسن وخوبصورتی کا شاہکار...... اس کی محبت کا ثمر...... اس کے سامنے ہوشربا حسن لئے بیٹھی تھی۔

''ہم دونوں بہت خوش قسمت ہیں۔'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں......؟ نازی نے سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کی اور ایک دوسرے کو پالیا، ورنہ اکثریت محبت کو پائے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اور جو اسے پا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔'' تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ہاں......آپ جیسے انسان کا ملنا......بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔'' نازی نے مسکرا کر کہا تو تیمور بھی مسکرانے لگا اور جیب میں سے ایک خوبصورت سونے کی انگوٹھی نکال کر اسے پہنانے لگا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ زور سے بجا اور پھر دھکے کے ساتھ کھلا۔ آٹھ دس مسلح لوگ کمرے میں داخل ہوئے، نازی اور تیمور گھبرا گئے۔

''ک......کون......ہو......تم لوگ؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور سب نے نازی پر بندوقیں تان لیں۔

''یہ......یہ......کیا کر رہے ہو۔ چھوڑو اسے۔'' تیمور چلایا۔

''ہم اس کو قتل کرنے آئے ہیں۔'' ایک نقاب پوش شخص نے تیمور کی جانب شعلہ برساتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟''

''یہی حکم ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کس کا......؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ ان کاغذات پر دستخط کرو۔'' اس شخص نے کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے......؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

''طلاق کے کاغذات ہیں......ابھی اور اسی وقت اسے طلاق دے دو، ورنہ ہم اسے تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیں گے۔'' اس شخص نے بارعب انداز میں کہا۔

''نہیں......تیمور......خدا کے لئے مجھے طلاق مت دینا۔'' نازی روتے ہوئے چلائی۔

''ٹھیک ہے......اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز نہیں تو ہم اسے قتل کر دیتے ہیں۔'' اور اس شخص نے ایک گولی کمرے کے دروازے کی جانب چلائی، اس میں سوراخ ہو گیا۔ تیمور بے حد ہراساں ہو گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''جلدی کرو......ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔'' اس شخص نے جیب میں سے پن نکال کر اس کی جانب پھینکا۔

''تیمور......نہیں......مجھے تمہارے بغیر یہ زندگی نہیں چاہئے۔ مجھے مر جانے دو......مگر مجھے طلاق مت دو۔'' نازی انتہائی شدت سے رونے اور چلانے لگی۔

اس شخص نے اپنی بندوق کا رخ نازی کی جانب کیا۔

''اکبر......خنجر نکال اور گھونپ دے اس کے پیٹ میں۔'' اس شخص نے ایک نوجوان کو کہا تو اس نے جلدی سے اپنی قمیض کے نیچے سے تیز

دھار خنجر نکالا۔ تیمور گھبرا گیا۔

''اسے کچھ مت کہنا...... اسے قتل مت کرو، تم مجھے قتل کر دو۔'' تیمور نے بے بسی سے کہا۔

''اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے تو طلاق کے ان کاغذات پر پر دستخط کر دو...... ورنہ......'' نقاب پوش شخص نے کہا اور دوسرے نے خنجر کی نوک نازی کے پیٹ پر رکھ دی۔

''تیمور...... مجھے طلاق مت دینا...... مجھے مر جانے دو......'' نازی نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

تیمور نے بے بسی سے نازی کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''نازی...... مجھے تمہاری زندگی...... اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔'' تیمور نے نم آنکھوں سے جواب دیا اور نقاش پوش شخص کے ہاتھ سے قلم پکڑا۔

''تیمور...... تمہارے بغیر میں اس زندگی کا کیا کروں گی، خدا کے لیے دستخط نہ کرنا۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... نہ دستخط کرو...... مگر اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو گے...... ساری زندگی اس کی موت پر آنسو بہاتے رہنا۔'' نقاب پوش شخص نے کہا۔

''ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... جو تم...... ہمیں یوں جدا کرنا چاہتے ہو۔'' تیمور نے سسکتے ہوئے کہا۔

''ہم تو حکم کے بندے ہیں...... جو حکم ملا...... وہ کر رہے ہیں۔ ہماری...... تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

''پھر...... کون...... ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے؟ تیمور نے پوچھا۔

''تمہارے گھر والے...... تمہارے اپنے'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کون......؟ میرے چچا......؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر جانتے ہو...... تو...... پھر پوچھتے کیوں ہو؟ جلدی کرو...... وقت کم ہے...... اس کی موت...... یا...... طلاق؟ اور یہ یاد رکھو...... کہ ہم اپنا کام کر کے ہی جائیں گے۔ اس لئے تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو...... تو...... کر دو...... کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔'' نازی نے چلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ہم تمہاری خواہش بھی پوری کر دیتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا اور دوسرے کو اشارہ کیا، اس نے خنجر کو دوسرے شخص کے ہاتھ میں پکڑایا اور اس نے نازی کی گردن کو زور سے جھٹکا دیا اور خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

''اسے...... چھوڑ...... چھوڑ دو...... میں دستخط کر دیتا ہوں۔'' تیمور نے گھبرا کر کہا اور طلاق کے کاغذات پر جلدی سے دستخط کر دیئے...... نازی بلند آواز سے چلانے لگی...... ''نہیں...... تیمور...... نہیں نہیں...... میں......'' نازی بیہوش ہو گئی۔ تیمور نے جلدی سے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور وہ کاغذات لے کر چلے گئے۔

تیمور نے نازی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ نازی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور زور زور سے چلانے لگی...... تیمور بھی رو رہا تھا۔

''ہم بہت بدقسمت ہیں......'' تیمور نے روتے ہوئے کہا۔

''تم...... نہیں...... میں سب سے زیادہ بدنصیب ہوں......'' وہ سسکنے لگی...... اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتا ہوں، تو دنیا کی کوئی طاقت میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ مجھے اپنے آپ پر بہت یقین اور اعتبار ہے۔'' تیمور کے اپنے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اسے اذیت دینے لگے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔ اسے قدرت نے بہت بری مات دی تھی...... کچھ دیر پہلے خوش قسمتی کا دعویٰ کرنے والے اب اپنے آپ کو سب سے زیادہ بدقسمت تصور کر رہے تھے۔ کیسے لمحوں میں تقدیریں بدل جاتی ہیں...... انسان اور اس کی سوچ بھی...... اسے زندگی میں پہلی بار اتنی بری شکست ہوئی تھی۔ اس کی قسمت نے اس کو ایسا پچھاڑا تھا کہ اس میں اٹھنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اس کے اپنے کہے ہوئے الفاظ اور بلند و بانگ دعوے لمحوں میں ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ سب کچھ بکھر گیا تھا اور گزرے لمحوں کی خاک پر وہ نوحہ کناں تھے۔ دونوں کتنی دیر بیٹھے آنسو بہاتے رہے، مگر ان کے آنسوؤں کی شدت میں کمی نہ آ رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی، انہیں وقت گزرنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کے سنگ گزرا ایک ایک لمحہ ان کو یاد آ رہا تھا اور وہ اس کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ساری رات گزر گئی۔ دن کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ رو رو کر نازی اور تیمور کی آنکھیں سرخ اور پپوٹوں میں اتنی سوزش ہو گئی تھی کہ آنکھیں کھلنی اور بند ہونی مشکل ہو رہی تھیں۔

''میں...... جا رہا ہوں......'' تیمور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں......؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' تیمور نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور...... میں...... میں کہاں جاؤں......؟'' نازی نے پوچھا۔

''ہمارے راستے جدا ہیں...... تم...... جو...... مناسب سمجھو......'' تیمور نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''تیمور...... تم نے تو بہت دعوے کیے تھے...... کہ...... تم......'' نازی نے اسے اس کے بلند و بانگ دعوے یاد دلانا چاہے۔

''میں بھول گیا تھا...... کہ...... میں انسان ہوں۔ بہت کمزور...... قسمت کے ہاتھوں بے بس۔'' تیمور نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اگر...... مجھے یوں راستے میں چھوڑنا تھا...... تو...... پھر مجھے اتنی امید...... اور یقین کیوں دلایا؟'' نازی نے کہا۔

''اس وقت مجھے اپنے آپ پر یقین اور اعتبار تھا۔'' تیمور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اور...... اب......؟''

''اور اب نہ تو اپنے آپ پر اعتبار رہا ہے...... اور نہ کسی اور...... پر۔''

''تیمور...... تم نے بہت زیادتی کی ہے۔...... میرے ساتھ۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں۔'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا...... تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے...... اس پر......؟''

''میں بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں...... کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اور میں نے بھی وہی کیا ہے...... البتہ قسمت نے ہمارے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے...... اس پر بہت دکھی ہوں۔'' تیمور نے کہا اور اسے دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نازی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اپنے سر کے بال نوچنے لگی، اپنے عروسی دوپٹے کو اس نے پھاڑ پھاڑ کر کترنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اپنے زیورات کو نوچ نوچ کر انہیں توڑ ڈالا تھا، جس کمرے کی آرائش ان دونوں نے بہت محبت سے کی تھی اور درو دیوار کو خوبصورت تازہ گلاب کی مہکتی کلیوں اور پھولوں سے سجایا تھا۔ اس نے ایک ایک کلی اور پھول کو اپنے ہاتھوں سے نوچ کر انہیں اپنے پاؤں تلے مسلا تھا۔ خوبصورت نرم و گداز بیڈ شیٹ اور تکیوں کو اس نے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا تھا۔

''ہر بار...... ہر بار...... میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خدا...... کیوں میرے ساتھ یہ کرتا ہے...... اس نے مجھ پر اتنا ظلم کیوں کیا ہے......؟ وہ ہر بار مجھے...... میری خوشی اور محبت دے کر مجھ سے چھین لیتا ہے...... اور میرا تماشا دیکھتا ہے...... نجانے کیوں مجھے اتنا دکھ دیتا ہے...... اتنا دکھ...... کہ میرا دل پھٹنے لگا ہے...... وہ ہر بار...... میرے ساتھ ایسا کرتا ہے...... ظالم......'' وہ سسکنے لگی۔

اور شاہ زیب اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ خوبصورت وجیہہ اور اچھا انسان...... اس نے بھی مجھ سے بہت محبت کی...... مگر میں اس کی محبت بھی نہ بن سکی...... تو نے مجھے اس کی بھی نہ ہونے دیا۔'' باسط علی...... ''جس سے میں بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کی محبت کی خاطر شاہ زیب کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ وہ بھی میرا نہ بن سکا تو نے مجھے اس کی محبت بھی نہ بننے دیا اور اسے بھی مجھ سے جدا کرا دیا۔

''اور اب تیمور...... جس نے مجھ سے بے حد محبت کی...... اتنی محبت کہ میں اپنے پچھلے دکھ بھول گئی تھی...... اور تو نے مجھ سے اس کو بھی چھین لیا، ہر بار میرے ساتھ ایسا کیوں کرتا ہے......؟ میں نے کیا گناہ کیا ہے...... جو تو میرے ساتھ اتنا ظلم کر رہا ہے...... مجھ سے ہر بار چھین کر تو خوش کیوں ہوتا ہے۔ بتا تو سہی میں نے کیا کیا ہے...... یا...... پھر مجھے کسی کی بددعا لگ گئی ہے کہ میں جس کو بھی پانے کی کوشش کرتی ہوں، وہی مجھ سے دور چلا جاتا ہے، وہی مجھ سے چھن جاتا ہے۔'' وہ روتے ہوئے سوچنے لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے شاہ زیب کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی اسی طرح رویا اور تڑپا ہو گا...... جس دن میں اسے چھوڑ کر چلی آئی تھی۔

کیا وہ بھی اسی اذیت سے گزرا ہو گا...... جس سے میں گزر رہی ہوں...... وہ کرب سے سوچنے لگی۔ ''لیکن...... اس وقت میں نے شاہ زیب کے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچا تھا...... ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔ اس وقت صرف باسط علی، میرے دل اور آنکھوں میں بسا تھا اور کوئی نہیں...... مجھے شاہ زیب اور اس کی محبت کبھی دکھائی ہی نہیں دی۔

کیا میں نے شاہ زیب کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے، جس کی سزا مجھے اس صورت میں مل رہی ہے......؟ اس نے سوچا اور شاہ زیب کا دکھی چہرہ اور نم آنکھیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں، جب حویلی چھوڑنے سے پہلے اس نے شاہ زیب کی جانب دیکھا تھا، وہ بہت خاموش اور مغموم

تھا۔شاید وہ رات بھر روتا رہا تھا...... یا پھر کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔اس کی آنکھیں بھی یونہی سرخ تھیں اور ان کے پپوٹے بھی یونہی بھاری تھے...... سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی وہ اس کے دل کی کیفیت نہیں جان پائی تھی...... وہ اس وقت صرف اپنے دل کی کیفیت کو جانتی تھی جو بہت مسرور اور شاداں تھا،جس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔وہ اپنی منزل کو پانے جا رہی تھی اور اس کے اندر فتح کا نشہ اور سرور تھا۔وہ اپنے آپ میں اتنی بدمست ہو رہی تھی کہ اسے کسی کا ہوش نہ تھا...... اور اب پھر شاہ زیب اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔اسی طرح...... جس طرح باسط علی بتایا کرتا تھا اور وہ اسے جھوٹا اور فریبی سمجھتی تھی۔

وہ آنکھیں بند کرتی تو شاہ زیب اس کے سامنے ہوتا...... کھولتی تو اس کا چہرہ اسے گھور رہا ہوتا۔وہ سونے کی کوشش کرتی تو اس کا اداس چہرہ اسے سونے نہ دیتا۔وہ عجیب مخمصے اور الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔شاہ زیب کے ہیولے اور اس کے عکس سے فرار ممکن نہیں تھا،وہ اس سے بھاگنا چاہتی تھی۔اس کی آنکھوں اور چہرے کے حصار سے دور جانا چاہتی تھی،مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا...... وہ بہت الجھنے لگی تھی...... پاگل ہونے لگی تھی...... تیمور اور باسط علی اس سے دور چلے گئے تھے...... اب صرف شاہ زیب اور اس کا اداس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا......

☆

''بہرام خان...... آج کسی کو میرے پاس نہ آنے دینا۔''

شاہ زیب نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کیوں......شاہ زیب بھائی؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''آج کوئی خاص مہمان آنے والا ہے۔''

''وہ......کون......؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے......کوئی......'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''کیا...... آپ کو اس کے بارے میں کوئی خواب آیا ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھو......'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''بہرام خان خاموشی سے شاہ زیب کے چھوٹے سے حجرے سے باہر نکل گیا۔حجرے میں ایک چارپائی اور مٹی کے فرش پر چٹائی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا...... نجانے لوگوں کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ زیب کی کہی ہوئی باتیں پوری ہوتی ہیں...... اور وہ اس سے اپنی حاجتیں بیان کرتے اور ان اپنے لئے دعائیں کرانے آتے تھے۔

شاہ زیب حیران ہوتا اور انہیں منع کرتا...... مگر روز بروز لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تھا۔دن کا آغاز ہوتے ہی لوگ اس کے ڈیرے پر پہنچ جاتے اور اس سے اپنے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے۔وہ خاموشی سے سنتا رہتا اور ان کا دل رکھنے کے لئے اللہ سے دعا کرنے کو کہتا۔وہ مطمئن ہو کر چلے جاتے...... وہ رات کے کسی پہر...... جانماز بچھا کر تمام حاجت مندوں کے لئے دعا کرتا اور ان کے معاملات اللہ کے سپرد کر

دیتا۔ دعائیں کب اور کیسے پوری ہوتیں۔ اسے خود بھی کچھ معلوم نہ ہوتا، مگر ہر روز لوگ اس کے پاس آ کر اسے خوشی سے بتاتے کہ ان کی مرادیں پوری ہوئی ہیں۔ اللہ نے اس کے ذریعے ان کی دعائیں سن لی ہیں۔ وہ ان کی نظروں میں اور معتبر ہو جاتا۔ اس کی عزت، اس کا رتبہ اور تعظیم پہلے سے بھی زیادہ کی جانے لگتی۔ وہ کیا تھا...... اور...... اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا...... اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

اس کی دعائیں واقعی ہی پوری ہوتی ہیں...... یا...... نہیں اسے خود بھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں تھا...... اللہ اسے کیا عطا کر رہا تھا...... اسے خود بھی پتہ نہیں تھا...... اللہ کا اور اس کا کیا معاملہ تھا، وہ جان نہیں پایا تھا۔ وہ ان کے ہاں کتنا معتبر تھا...... یا...... اس کا کیا مقام تھا...... اسے کوئی خبر نہ تھی...... وہ تو بس اپنے اندر پھیلی اس روشنی کی تقلید کرتا...... جو اس کی آنکھوں کے دیپ بجھ جانے کے بعد روشن ہوئی تھی۔ وہ ایک ان پڑھ انسان تھا، جسے نہ کتابی علم آتا تھا اور نہ ہی کوئی دنیاوی...... اور...... نہ ہی اس کا ذہن زمانے کی مکارانہ چالوں اور سازشوں سے آشنا تھا، وہ قدرت کی تخلیق کردہ پاک روحوں میں سے ایک 'پاک روح' تھا۔ جس کی آشنائی اپنے خالق سے اس وقت ہوئی جب وہ نازی کے جانے کے بعد انتہائی اضطرابی دور میں سے گزر رہا تھا۔ ان لمحوں کی اذیت اور اس کے اندر جنم لینے والے اضطراب...... اور...... اس اضطراب میں پوشیدہ تکلیف...... اور...... کرب نے رفتہ رفتہ اسے ایک ایسی روشنی سے آشنا کرنا شروع کر دیا جو بھنور سے اٹھنے والی لہروں میں سے ایک پرسکون لہر کی مانند سر اٹھاتی اور اس کے اضطراب کو کم کرنے لگتی۔ اسے ایک لمحے کے لئے سکون دیتی...... اسے تسلی دیتی...... کبھی کبھی جنم لینے والا یہ سکون، اپنے اندر ایک ایسا سحر رکھتا، جس کی کشش نے اسے نازی کی بے وفائی اور جدائی سے پیدا ہونے والے اضطراب اور اذیت کو اس سے بہت دور کر دیا تھا۔ اس پرسکون لہر میں اتنا سحر تھا کہ وہ اکثر اپنا آپ بھول بیٹھتا اور کبھی کبھی اٹھنے والی اس لہر کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اپنے آپ میں مضطرب رہتا وہ پرسکون لہر اس کی زندگی کا حاصل بنتی جا رہی تھی۔

☆

''شاہ زیب بھائی...... کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں، کہتی ہیں...... بہت دور سے آئی ہیں۔'' بہرام خان نے دوپہر کے وقت اس کے حجرے میں آ کر اسے اطلاع دی۔

''ان کو اندر بھیج دو...... کیا ان کو کھانا کھلا دیا ہے۔'' شاہ زیب نے پوچھا، کیونکہ اس کے ڈیرے پر آنے والے ہر شخص کو پہلے کھانا کھلایا جاتا تھا...... بعد میں وہ شاہ زیب کے پاس آتا تھا۔

''وہ...... کہتی ہیں...... انہیں بھوک نہیں۔'' بہرام خان نے بتایا۔

''کیا...... تم نے انہیں اس ڈیرے کی روایت کے بارے میں نہیں بتایا؟ شاہ زیب نے پھر پوچھا۔

''سب بتایا ہے...... مگر...... وہ......'' بہرام خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... انہیں اندر بھیج دو۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب چارپائی پر بیٹھا تھا اور اس کی چھڑی اس کے پاس تھی۔ نازی نے سیاہ چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی اور شاہ زیب کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوئی، مگر شاہ زیب دروازے کی دائیں جانب والی دیوار کو دیکھ رہا

تھا۔ نازی اسے بغور دیکھتی رہی۔ وہ بے حد بدل چکا تھا۔ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر قدرے لمبی داڑھی، یہ شخص اس شاہ زیب سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا، جسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔

''وہ منتظر رہی...... کہ وہ اسے اندر آنے کو کہتا ہے، مگر وہ خاموش رہا...... وہ بھی خاموشی سے اس کی جانب منتظر نگاہوں سے دیکھتی رہی۔''

''اندر...... آ جائیے۔'' شاہ زیب قدرے توقف کے بعد بولا، تو نازی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

شاہ زیب نے اپنی چھڑی ٹٹولی اور اس کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے وہ ٹھوکر لگنے سے گرنے لگا۔

''آ...... آ...... پ......؟'' نازی نے ہکلاتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

میں دیکھ نہیں سکتا، شاہ زیب نے جواب دیا اور چارپائی سے قدرے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

''آپ...... چارپائی پر بیٹھ جائیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کب سے......؟ نازی نے کچھ پوچھنا چاہا۔

جب...... خدا نے چاہا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

نازی بہت کچھ سوچ کر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم گھبرا گئی اور سب کچھ بھول گئی۔ ''کیسی ہیں۔ آپ......؟ خوش ہیں نا؟ شاہ زیب نے مسکرا کر پوچھا۔

نازی کو اس کی بات سن کر جھٹکا سا لگا اور اسے ایک دم یاد آیا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لئے آئی ہے۔

''نجانے آپ نے مجھے کیسی بددعا دی ہے...... کہ......'' نازی گلوگیر آواز میں بولی۔

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے...... اللہ نے مجھے اتنا کم ظرف نہیں بنایا۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''لیکن...... میرے ساتھ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے...... کہ...... زندگی اور اس کی خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی ہیں...... میں نے جس کی تمنا کی...... وہی نہ ملا...... جس کو پانا چاہا...... وہی چھن گیا۔'' نازی نے آہ بھر کر کہا۔

''کسی کو عطا کرنا اور محروم کرنا، کسی انسان کے بس میں نہیں...... یہ اختیار صرف مالک کے پاس ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں...... مگر......؟'' نازی نے کچھ کہنا چاہا۔

''باسط علی کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......''

''کیوں......؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے اس سے طلاق لے لی۔''

''طلاق......'' شاہ زیب کو جھٹکا لگا اور وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

''ہاں......وہ بہت بدل گیا تھا۔ باسط علی......وہ نہیں رہا تھا......جس کی تمنا میں نے کی تھی۔'' نازی نے افسردگی سے جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہو گیا، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کہ کیا کہے۔

''اور......تیمور بھی مجھ سے چھن گیا۔'' نازی نے آہستہ آواز میں کہا۔

''تیمور......کون......؟'' شاہ زیب نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھ سے ویسی محبت کی تھی......جیسی......میں نے کبھی باسط علی سے کی تھی......نہ مجھے میری محبت ملی اور نہ تیمور کو اس کی محبت۔'' نازی نے روتے ہوئے بتایا۔

''ہر شے پر اللہ قادر ہے۔ انسان صرف سوچتا ہے مگر عطا وہ کرتا ہے۔'' شاہ زیب نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں......لیکن مجھے اب احساس ہونے لگا ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ میں نے آپ کی محبت کو جھٹلایا اور خدا نے مجھ سے میری محبتیں چھین لیں......میں نے آپ کا گھر اجاڑا اور خدا نے میرا گھر کبھی بسنے ہی نہیں دیا۔ میں نے آپ کی ناقدری کی......اور اس نے مجھے بے وقعت بنا دیا......'' نازی نے نم آنکھوں کے ساتھ شاہ زیب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ محض آپ کی سوچ ہے......ایسی بات نہیں۔'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

نہیں......یہ......میرا یقین ہے۔'' نازی نے جواب دیا۔

''یقین کو اپنا ایمان مت بنائیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' نازی نے کہا۔

''معاف کرنا، اسے زیب دیتا ہے......میری اتنی اوقات کہاں؟''

''کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟'' نازی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''ہاں......آپ کے معاف کرنے سے مجھے سکون آ جائے گا۔'' نازی نے کہا۔

''میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

مجھے......اب کسی دعا کی ضرورت نہیں......مجھے کچھ نہیں چاہئے، کیا آپ ترس کھا کر میرے لئے دعا کریں گے......؟ کیا آپ اللہ کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں کہ آپ کی دعائیں سنی جائیں گی......'' نازی کو نجانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم مشتعل ہو گئی اور شاہ زیب اس کی باتیں سن کر حیرت سے آنکھیں جھپکانے لگا۔

''مجھے......آپ سے صرف معافی چاہئے......کوئی دعا نہیں......کیونکہ مجھے جتنی بد دعائیں لگنی تھیں وہ لگ چکی ہیں......معافی اس لئے نہیں مانگ رہی کہ زندگی میں مجھے کسی اچھی بات کی توقع اور امید ہے۔ صرف اس لئے معافی مانگ رہی ہوں کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ

کے ساتھ زیادتی کی ہے۔'' نازی نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں نے آپ سے کبھی کوئی شکایت تو نہیں کی۔''

''یہ بات تو میرے لئے تکلیف دہ ہے...... اگر آپ شکوہ کرتے تو میں آج یہاں نہ آتی۔'' نازی نے جواب دیا۔

''میں نے آپ کے لئے کبھی برا نہیں سوچا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کاش...... میں بھی آپ کے لئے کبھی اچھا سوچتی۔'' نازی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''انسان اپنی سوچوں پر قادر نہیں ہوتا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میرے خیال میں بہت حد تک ہوتا ہے......'' نازی نے جواب دیا۔

شاہ زیب اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔

''کیا...... آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟'' نازی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''میں نے تو پہلی شادی بھی نہیں کی۔'' شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''اور...... اس کی گنہگار میں ہوں......'' نازی نے آہ بھر کر کہا۔

''شاید قسمت میں ہی یہ سب کچھ لکھا تھا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں...... مگر...... ہر بات میں مجرم تو انسان ہی ٹھہرتا ہے۔ قسمت نہیں۔'' نازی نے کہا۔

''ہاں...... جہاں انسان بے بس نظر آتا ہے...... وہاں قسمت کو الزام دیا جاتا ہے، ورنہ ہر بات میں انسان ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔''

شاہ زیب نے اپنی چھڑی کے سہارے چلتے ہوئے کہا۔

''میرے جانے کے بعد آپ بہت دکھی ہوئے ہوں گے؟'' نازی نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''اور...... اب......؟'' نازی نے سوال کیا۔

''اب...... نہیں۔'' شاہ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' نازی نے پوچھا۔

''قدرت نے میرے دل کو بہت کچھ سمجھا دیا ہے......''

''کیا مطلب......؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''بہت سی ان کہی اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں مگر آپ نہیں سمجھیں گی۔'' شاہ زیب نے کہا۔

نازی خاموش ہو گئی اور شاہ زیب کی جانب دیکھنے لگی۔

''باسط علی کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے اچانک پوچھا۔

''معلوم نہیں''۔

''کیا...... وہ آپ کو کبھی یاد نہیں آیا؟''

''نہیں......'' نازی نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

''کیوں......؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''جو لوگ اذیت دینے والے تیر کی طرح دل میں پیوست رہتے ہیں۔ انہیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی...... دل سے رستا لہو ہر دم ان کی یاد تازہ رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ بھی مجھے کبھی نہیں بھول پائیں گے نہ ہی وہ...... اور نہ ہی میں۔'' نازی نے کہا۔

شاہ زیب اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''اب باسط علی اور تیمور سے زیادہ 'آپ' مجھے یاد آتے ہیں...... جانتے ہیں...... کیوں؟'' نازی نے شاہ زیب کے سامنے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

شاہ زیب خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا اور کرنا چاہا، مگر میں نے آپ کو نہ تو کوئی حق دیا، بلکہ سب کچھ چھین لیا۔'' نازی نے آہستہ آواز میں کہا تو شاہ زیب کی آنکھوں کی نمی میں اور اضافہ ہونے لگا۔

''میں نے نہ تو آپ سے کبھی کوئی گلہ کیا...... اور نہ ہی کوئی حق مانگا؟''

''یہی تو دکھ کی بات ہے...... جو مجھے سکون نہیں لینے دیتی۔ میرے اندر ہر وقت اک آگ سی لگی رہتی ہے۔ ایسی بے سکونی پھیلی رہتی ہے، جس سے چھٹکارا پانا میرے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ میں کس قدر اذیت میں سے گزر رہی ہوں...... آپ نہیں جانتے...... مجھے اس اذیت سے نجات دلائیں...... ورنہ مجھ سے سانس لینا مشکل ہو جائے گی۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا...... آپ کو ہر تکلیف سے نجات دے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں خدا سے کچھ نہیں مانگ رہی...... اور...... اب مجھے اس سے کچھ چاہیے بھی نہیں...... اس نے مجھے جو کچھ دینا تھا...... دے دیا...... اب زندگی بھر اس سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ مجھے صرف آپ سے معافی چاہیے۔'' نازی قدرے چلاتے ہوئے بولی۔

''آپ...... خدا سے اتنی ناامید کیوں ہو رہی ہیں؟''

''اس نے مجھ سے میری ساری امیدیں چھین لی ہیں...... میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا...... میں ایسے خدا کو کیا کروں، جس نے مجھے اذیتیں دی ہیں اور ہر پل مجھے اذیت دے کر خوش ہوتا ہے۔'' نازی نے قدرے باغیانہ انداز میں کہا۔

''آپ اس کی حکمتوں کو نہیں سمجھ پا رہیں۔'' شاہ زیب نے نرم لہجے میں کہا۔

''اور......میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی......''

''وہ انسانوں پر بہت مہربان ہے۔''

''ہوگا......مجھے یقین نہیں۔''نازی نے غصے سے کہا۔

''کیوں......؟''شاہ زیب نے پوچھا۔

''اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا......؟''مجھ جیسی بے وفا عورت سے شادی کرائی، جو آپ کو دھوکہ دے کر چلی گئی......پھر آپ سے آپ کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی۔ کیا ایک اذیت کم تھی، جو دوسری بھی دے دی......اور مجھ سے باسط علی کو چھینا، جس سے میں محبت کرتی تھی......اور پھر تیمور کو بھی چھین لیا، جو مجھ سے محبت کرتا تھا۔ کیا انسان کے لئے ایک اذیت کم ہوتی ہے، جو اس کو دُہری اذیتوں میں وہ ڈالتا ہے......تاکہ انسان کو کسی پل سکون نہ آئے......وہ ہر وقت روتا......اور......سسکتا رہے......جیسے میں......آپ......باسط علی......اور تیمور......اور شاید سارے انسان۔'' نازی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''آپ......اپنی سوچ کو بدل لیں......تو آپ کو سکون آ جائے گا۔''شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اور......انسان کی سوچ کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی......اور میں بھی اسے بدلنا نہیں چاہوں گی۔''نازی نے ڈھٹائی سے کہا۔

''آپ اتنی منفی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟''

''کیا اب بھی نہ کروں......اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی۔''نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''آزمائش تو زندگی کا حصہ ہیں......قدرت نے انسان کو آزمائشوں کے لئے ہی تو پیدا کیا ہے۔''شاہ زیب نے سمجھانا چاہا۔

''ٹھیک ہے......آزماتا رہے......اس کو کون روک رہا ہے۔''نازی نے غصے سے جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہوگیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ واقعی نازی کو نہ کبھی سمجھا پائے گا اور نہ ہی اس کی سوچ کو بدل پائے گا......سوچ تب ہی بدلی جاتی ہے جب انسان کسی نقطے پر سر تسلیم خم کرتا ہے......کسی بات کو ماننے کی خواہش اس کے اندر پیدا ہوتی ہے اور جب انسان اپنے اندر سے سب کچھ ختم کر دیتا ہے تو وہ خام مٹی کا کھنکتا ہوا بجنے والا انسان بن جاتا ہے۔ شاہ زیب کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟''نازی نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو سب کچھ معاف کیا......''شاہ زیب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''شکریہ......اب میں چلتی ہوں۔''نازی نے اس کی جانب بغور دیکھا اور تیزی سے اس کے حجرے سے باہر نکل گئی۔

شاہ زیب حیرت زدہ رہ گیا۔ نازی کی سوچ، اس کا ایمان اور اس کی باتیں کتنی بدل گئی تھیں۔ وہ ضدی، خودسر اور خود غرض پہلے بھی تھی، مگر اب ان تمام جذبوں میں شدت آ گئی تھی۔ وہ اپنی سوچ، ایمان اور باتوں پر سختی سے قائم تھی، وہ نہ تو کسی کی بات سننے کو تیار تھی نہ ماننے کو......وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔ شاہ زیب کو اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دکھ ہوتا رہا......مگر وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا......شاید دعا بھی

نہیں ...... کیونکہ اس نے خود اسے کہا تھا کہ اسے دعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں ...... شاہ زیب نے گہری سانس لی اور حجرے سے باہر نکل کر کھلے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

''اپنی مخلوق سے تو ہی واقف ہے ...... کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ کسی کے دل و دماغ تک پہنچ پائے اور اس کی سوچوں کو بدل پائے۔'' شاہ زیب نے دل میں سوچا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

☆

ماسٹر باسط علی نے ایک چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈالا، جس میں چند کتابوں کے علاوہ کچھ ضروری چیزیں تھیں اور کٹیا سے باہر نکل گئے۔ کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہو کر پیچھے دیکھا، سب کچھ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ انہوں نے کوئی چیز بھی وہاں سے نہ اٹھائی تھی۔ انہوں نے تین سال اس بستی اور کٹیا میں گزارے تھے۔ جب وہ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ تب انہوں نے واپس جانے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا تھا، مگر اب انہیں واپس جانا پڑ رہا تھا۔ سائیں کے بار بار کہنے پر ...... یا ...... پھر اپنے دل کی بے قرار کیفیت سے تنگ آ کر وہ واپس جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے حسرت بھری نگاہ کٹیا پر ڈالی اور جلدی سے وہاں سے باہر نکل آئے۔

ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر اتنی چہل پہل بھی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ادھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ شاید سائیں مٹھا کہیں نظر آ جائے اور وہ اسے آخری بار مل کر چلے جائیں ...... وہ باغ میں اُس مخصوص ٹیلے کی جانب گئے جہاں سائیں اکثر بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ملتا تھا، مگر وہ آج وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ سڑک کے اس درخت کے پاس بھی گئے جہاں سائیں اکثر بچوں میں چیزیں بانٹتا تھا، مگر وہ آج وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اس آبشار تک بھی گئے، جہاں وہ اکثر تنہائی میں نجانے کیا پڑھتا رہتا تھا ...... وہ ہر اس جگہ گئے جہاں اکثر سائیں پایا جاتا تھا، مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ ان کے اندر مایوسی بڑھنے لگی ...... جس کے اصرار پر وہ جا رہے تھے، وہی کہیں نہیں مل رہا تھا۔

''سائیں ...... کہاں جا سکتا ہے؟'' ماسٹر باسط علی نے مایوسی سے اپنے دل میں سوچا اور اپنا رخ شیرے کے کھوکھے کی جانب موڑ دیا۔ شیرا ابھی کھوکھے پر آ کر بیٹھا تھا اور اس کے آتے ہی اکا دکا لوگ بھی آنا شروع ہو گئے۔

''سلام ماسٹر جی ...... خیر تو ہے ...... بڑے دنوں کے بعد آپ تشریف لائے ہیں۔'' شیرے نے پوچھا۔

''ہاں ...... بس ...... یونہی۔'' انہوں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''چائے پئیں گے ......؟'' شیرے نے پوچھا۔

''نہیں ...... مجھے جلدی ہے ...... میں جا رہا ہوں۔'' ماسٹر باسط نے جواب دیا۔

''کہاں ......؟'' شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

''اس گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''کیا مطلب ...... آپ ہم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کیوں ......؟ کیا کوئی ہم سے غلطی ہو گئی ہے ......؟ کیا آپ کسی سے ناراض ہو گئے

ہیں؟ شیرے نے ایک دم پریشان ہو کر پوچھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں۔'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''تو...... پھر...... کیا بات ہے؟ آپ ہم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے...... ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔'' شیرے نے محبت سے حق جتلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبت کا شکریہ...... مگر...... اب میں یہاں مزید نہیں رہ سکتا۔'' ماسٹر باسط علی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر...... سرکار...... اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہئے...... اگر ہم لوگوں سے کوئی خطا...... کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معافی چاہتے ہیں...... مگر ہم آپ کو یوں جانے نہیں دیں گے۔'' شیرے نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''شیرے بھائی...... میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے کہا۔

''مگر...... اتنی اچانک جانا کیوں ضروری ہو گیا ہے؟''

''ضرور آپ کسی سے ناراض ہوئے ہیں۔'' شیرے نے کہا۔

''بالکل بھی نہیں...... بس یوں سمجھ لو...... کہ اللہ کا جتنا حکم تھا...... یہاں رہ لیا...... اب جانے کا حکم ملا ہے تو چل پڑا ہوں...... ہر شے اسی کے حکم سے تو چلتی ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''مگر...... آپ جیسے سچے موتیوں جیسے پاک انسان کہاں ملتے ہیں۔ آپ تو ہماری بستی کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ بچوں کے لئے سکول کھولا، غریبوں کے لئے ہسپتال کھلوایا، ہر ایک کی مدد کی، ہر ایک سے پیار کیا، آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔'' شیرے نے فرطِ جذبات سے لبریز آواز کے ساتھ کہا۔

''نہیں...... میں بہت عام سا انسان ہوں۔'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''ماسٹر جی...... آپ کتنے خاص ہیں...... یہ ہم جانتے ہیں...... آپ تو ہماری بستی کی رونق تھے...... میرے کھوکھے کی شان بڑھاتے تھے...... اب میں کس کا انتظار کیا کروں گا...... ماسٹر جی...... آپ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔'' شیرے نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

''میرا جانا...... بہت ضروری ہے...... اتنا ضروری...... کہ...... اگر...... میں نہ گیا...... تو شاید...... بہت دیر ہو جائے۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں......'' مگر آپ کے بغیر ہمارا دل نہیں لگے گا...... ہم سب بہت اداس ہو جائیں گے۔'' شیرے نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبت اور چاہت میرے لئے بہت بڑا تحفہ ہے اور میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کے لئے جو کچھ بھی کیا...... وہ انسان ہونے کے ناطے کیا۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں۔'' ماسٹر باسط علی نے نم آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

''مگر سب انسان آپ جیسے کہاں......؟'' شیرے نے کہا۔

''ہر انسان کے ذمہ اللہ نے کچھ کام لگائے ہوتے ہیں، جو اسے ہر صورت میں پورے کرنے ہوتے ہیں...... میرے ذمہ بھی اس نے یہ کام لگایا تھا...... اس میں میری کیا بڑائی ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

''ماسٹر صاحب...... آپ کی پڑھی لکھی باتیں ہمیں کہاں سمجھ میں آتی ہیں...... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ، دنیا میں بہت کم ہیں، جو دوسروں کا بھلا ہی سوچتے ہیں...... ورنہ زیادہ تر لوگ تو دوسروں کے حصے کا لقمہ بھی چھیننا چاہتے ہیں۔'' شیرے نے کہا۔

''تمہاری محبت کا شکریہ...... اب میں چلتا ہوں۔'' ماسٹر باسط علی نے کہا۔

''ماسٹر صاحب...... آج آخری بار تو چائے پی لیں۔'' شیرے نے محبت سے کہا تو ماسٹر باسط علی نے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی۔'' ماسٹر باسط علی نے مسکرا کر کہا اور شیرا جلدی سے چائے بنانے لگا۔

''اوئے جمالے...... جلدی سے الماری میں سے دھلا ہوا کپ پلیٹ نکال کر لاؤ...... آج ماسٹر صاحب کو سب سے بڑھیا چائے پلانی ہے، تاکہ انہیں ہماری آخری چائے کبھی نہ بھولے۔'' شیرے نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''ماسٹر صاحب...... کہاں جا رہے ہیں؟ چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہم سب سے بہت دور...... اب یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔'' شیرے نے کہا تو سب لڑکے پریشان ہو کر ماسٹر باسط علی کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ان سے مختلف سوالات کرنے لگے اور ماسٹر باسط علی انہیں مطمئن کرنے لگے۔ وہ چائے پی کر سب سے مصافحہ کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ اتنی محبتوں پر ان کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔

ماسٹر باسط علی سڑک پر چلتے ہوئے متلاشی نگاہوں سے پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بس سٹینڈ کی جانب چلنے لگے۔ بس پر سوار ہونے سے پہلے وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے، جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔

''باؤ جی...... بس چلنے کو تیار ہے...... اگر اس میں سوار ہونا ہے تو جلدی کریں...... ورنہ راستہ چھوڑیں۔'' کنڈیکٹر نے قدرے خفگی سے کہا، جو کافی دیر سے ان کے سوار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

ماسٹر باسط علی مایوس دل کے ساتھ بس میں سوار ہو گئے۔ سائیں سے نہ ملنے کا انہیں بہت دکھ ہو رہا تھا...... نجانے کیوں وہ اسے آخری بار ضرور ملنا چاہتے تھے اور یہ خواہش ان کے اندر بہت شدید ہوتی جا رہی تھی...... مگر سائیں کا کہیں کوئی اتا پتہ نہ تھا، وہ مایوسی سے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ بس آبادی سے نکل کر کچے پکے راستوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے چلنے لگی تو اچانک ماسٹر باسط علی کی نظر ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے سائیں پر پڑی، وہ ایکدم خوش ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''بس...... یہیں روک دو...... مجھے یہاں ہی اترنا ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے قدرے بلند آواز میں شور مچاتے ہوئے کہا۔ کنڈیکٹر نے غصے سے ان کی جانب دیکھا اور بس کو روکا۔ ماسٹر باسط علی جلدی سے بس سے نیچے اترے اور قدرے بھاگتے ہوئے سائیں کے پاس چلے گئے۔

''آ..... آپ کہاں تھے...... میں آپ کو ہر جگہ ڈھونڈتا رہا۔'' ماسٹر باسط علی نے سائیں سے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ماسٹر...... تو نے مجھے سچے دل سے ڈھونڈا...... اور میں تجھے مل گیا...... ساری بات...... تو...... تیرے سچے من کی ہے نا......'' سائیں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... آج میں جا رہا ہوں...... دعا کرنا...... کہ...... وہ۔'' ماسٹر باسط علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اگر تو اپنے من کو صاف کر کے گیا...... تو...... سب رستے صاف ملیں گے...... من میں ذرا سا شک...... ذرا سی کھوٹ ہوئی تو ہر شے کیچڑ کیچڑ ہو جائے گی......'' سائیں نے نرمی سے جواب دیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے...... نجانے کیوں...... ؟ سوچتا ہوں کس منہ سے اس کا سامنا کروں گا...... اور اس سے کیا بات کروں گا...... اور اگر...... اس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر دیا...... تو...... پھر...... میں کیا کروں گا...... میں کہاں جاؤں گا؟ ماسٹر باسط علی نے اپنے دل میں پیدا شدہ خدشات اس کو بتائے۔

''ماسٹر...... اک بات پلے سے باندھ لے...... بندہ جو سوچتا ہے...... وہ ہوتا نہیں...... اور...... ہوتا ہے وہ جو سوچتا نہیں...... یہی زندگی کا نچوڑ ہے...... اور یہی بندے بشر کی کہانی ہے۔ انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔''

سدا نہ باغیں بلبل بولے ———— سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے، حسن جوانی ———— سدا نہ صحبت یاراں
مان نہ کیجیے روپ گھنے دا ———— وارث کون حسن دا
سدا نہ رہ سن شاخاں ہریاں ———— سدا نہ پھل چمن دا
سدا نہ رست بازاریں وکسی ———— سدا نہ رونق شہراں
سدا نہ موج جوانی والی ———— سدا نہ ندیاں، لہراں
سدا نہ لاٹ چراغاں والی ———— سدا نہ سوز پتنگاں
سدا اڈاراں نال قطاراں ———— وِن قد کلنگاں
سدا نہ چھوپے پا محمد ———— رل مل بہنا سنگاں

ماسٹر باسط علی توجہ سے سائیں کو سنتے رہے اور ایک ایک بات کو ذہن نشین کرتے رہے۔

''اب تو...... جا...... رب راکھا...... وقت بہت گزر گیا ہے اور اس کے پاس جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا...... دیر ہو گئی تو ساری زندگی پچھتاتے رہو گے۔'' سائیں نے ذو معنی انداز میں کہا اور ماسٹر باسط علی نے حیرت سے سائیں کی جانب دیکھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے......؟ ماسٹر باسط علی نے پوچھا۔

''ماسٹر...... کچھ باتیں وقت سے پہلے بتا دی جائیں تو بڑے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں...... تو...... بس...... اس تک پہنچنے کی کوشش کر...... جا...... اب چلا جا......'' سائیں اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

ماسٹر باسط علی نے مصافحے کے لئے پہلی بار اپنے ہاتھ اس کی جانب بڑھائے۔ سائیں کے ہاتھ انتہائی یخ تھے اور چھونے میں روئی سے بھی زیادہ نرم محسوس ہوئے...... ایسے ہاتھوں کا لمس ماسٹر نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا، ان ہاتھوں کی لطافت ان کے رگ و پے میں اتر گئی...... انہوں نے جھرجھری لی...... اور ان کے سارے جسم میں اک عجیب سی برقی لہر دوڑ گئی اور سارا جسم کپکپانے لگا۔

''اللہ...... نگہبان۔'' سائیں نے ماسٹر باسط علی کی بدلتی کیفیت دیکھ کر اپنے ہاتھ چھڑائے اور مسکرا کر ان سے جدا ہو گیا۔ ماسٹر باسط علی دم بخود رہ گئے۔ سائیں اپنی لاٹھی سے چھن چھن کرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ماسٹر باسط علی حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ اچانک ایک بس ان کے پاس آ کر رکی...... اور...... وہ اس میں سوار ہو گئے۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا گیا اور اپنی لاٹھی کو ٹٹولتے ہوئے اس کے سہارے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ جب سے نازی اس کے پاس سے گئی تھی، وہ کئی روز سے اضطراب میں مبتلا رہا تھا...... اور...... اب دو تین راتوں سے وہ عجیب وغریب خواب دیکھ رہا تھا۔ کبھی نازی کو پریشان دیکھتا تو کبھی باسط علی کو...... مگر آج رات اس نے جو کچھ خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے اسے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور صبح ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ اس کے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں اور اسے صبح کی آمد کے بارے میں آگاہ کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد بہرام خان اس کے کمرے میں آیا...... اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔

''شاہ زیب...... بھائی...... کیا بات ہے......؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں...... خیریت تو ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ہاں...... سب ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا

''یوں لگ رہا ہے...... آپ رات بھر نہیں سوئے۔'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ہاں...... اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا...... کوئی...... خواب دیکھا ہے؟'' بہرام خان قدرے متجسس ہو کر اس کے بہت قریب بیٹھ کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''ہاں......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا دیکھا ہے......؟''

''بہرام خان...... میرا آخری وقت آنے والا ہے۔ شاید ابھی، دوپہر کو، یا رات کو، یا پھر کل، یا پرسوں، مگر بہت جلد...... لیکن وعدہ کرو...... کسی کو نہیں بتاؤ گے۔'' شاہ زیب نے بہرام خان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بوکھلا کر بولا۔

''جو مجھے بتایا گیا ہے...... وہی بتا رہا ہوں۔''

''مگر...... یوں...... اچانک...... اتنی جلدی......'' بہرام خان بے ربط انداز میں بولا۔

''پوری کائنات امرِ کُن کی محتاج ہے...... جلدی...... یا دیر کی نہیں...... جب اس کا حکم آتا ہے تو پوری کائنات اور اس میں موجود ہر شے کو اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''مگر...... ہم...... آپ کے بغیر......؟'' بہرام خان رونے لگا۔

''ہر ایک کو اپنا وقت پورا کرنا ہے...... سب زندہ رہتے ہیں۔ چاہے وہ کتنا واویلا کیوں نہ کریں...... ہر شے اس کی مرضی کے مطابق چلتی ہے......'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

بہرام خان سسکیاں بھرنے لگا۔

''سنو...... میرے بعد...... یہاں ایک شخص آئے گا...... اسے میری قبر پر ہی روک لینا۔ اسے کہیں جانے مت دینا...... اس کی عزت کرنا...... اور اماں جی کو کہنا کہ اس سے کوئی شکایت نہ کریں...... اور اسے میری طرح ہی سمجھیں۔'' شاہ زیب نے آہستہ آہستہ سے بتایا۔

''کون...... ہے...... وہ......؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے...... کوئی...... اس کا یہاں ٹھہرنا تم لوگوں کے لئے بہتر ہے۔ اسے جانے مت دینا...... میرے بارے میں جب تم سے پوچھے تو اسے کہنا کہ میں نے اسے معاف کیا...... وقت بہت کم ہے، لوگ ڈیرے پر میرے منتظر ہوں گے...... چلو...... چلتے ہیں۔'' شاہ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھئے...... میں ڈرائیور کو کہتا ہوں کہ گاڑی نکالے۔ بہرام خان اپنے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈیرے پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ کئی تو صبح ہونے سے پہلے ہی وہاں آ گئے تھے۔ شاہ زیب کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر سب اس کی جانب لپکے اور عقیدتاً اس کے ہاتھوں کو چومنے اور بوسہ دینے لگے۔

''سلام...... شاہ جی...... ہم غریبوں کے لئے دعا فرمائیں۔ ہم بہت پریشان ہیں......'' ہر کوئی اپنی اپنی حاجت بتانے لگا۔ شاہ زیب خاموشی سے سنتا رہا۔

''کیا بات ہے...... شاہ جی...... آج آپ کچھ بول نہیں رہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' کئی لوگوں نے سوال کیا، مگر شاہ زیب خاموش رہا۔

''میرا خیال ہے...... آج تم لوگ چلے جاؤ...... شاہ جی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' بہرام خان نے سب لوگوں سے کہا تو وہ سب اس کے لئے دعائیں کرتے ہوئے چلے گئے...... شاہ زیب اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اسے ان کے جانے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ بہرام خان اس کی جانب بغور

دیکھتا رہا اور پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں...... آپ کیوں اداس ہو رہے ہیں...... زندگی بھر کیف زندگی ہے...... موت کا تصور ہی انسان کا دل دہلا دیتا ہے......''

بہرام خان نے بلا واسطہ انداز میں کہا تو شاہ زیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''موت کا تصور ان کو دکھی کرتا ہے، جن کو زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ جن کے لئے زندگی صرف دن اور رات گزارنے کا نام ہو...... وہ بھلا زندگی سے کیا محبت کریں گے۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

''پھر...... آپ کیوں اداس ہو رہے ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''جب سوچتا ہوں کہ زندگی میں کیا کھویا...... کیا پایا...... ؟ کہیں زندگی کا یہ سفر رائیگاں تو نہیں گیا...... تو اداسی کی اک لہر سی اٹھتی ہے، جو روح کو بے قرار کرنے لگتی ہے۔ زندگی میں خسارے زیادہ نظر آتے ہیں...... اور حاصل بہت کم......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ معاملہ تو ہر انسان کے ساتھ ہے۔ شاید قدرت نے انسان کو ایسا ہی بنایا ہے...... یا پھر اس کی قسمت میں خسارے زیادہ لکھ دیئے ہیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ...... وہ کچھ نہیں حاصل کر پاتا...... جس کی تمنا وہ اندر سے کرتا ہے۔'' بہرام خان نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا، جو اس کی صحبت میں رہ کر قدرے روحانی گفتگو کرنے لگا تھا۔

''میرے لئے دعا کرنا...... اور اسے بھی کہنا...... جو یہاں آئے گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''آپ کے لئے کوئی...... کیا دعا کرے...... آپ تو خود دوسروں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔'' بہرام خان نے کہا۔

''دعا کی ضرورت تو ہر انسان کو ہوتی ہے...... کونسا انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی ساری دعائیں پوری ہوتی ہیں اور ویسے بھی جب خسارے انسان کا مقدر ہوں...... تو اسے دعا کی بھی اتنی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب بھائی...... میں جب آپ کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو بہت حیران ہوتا ہوں۔ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں...... قدرت نے آپ کو کیسے بدل دیا۔ انسان کو کیا خبر ہوتی ہے کہ آئندہ آنے والے وقت میں اس کے ساتھ کیا ہونا ہے...... اور...... وہ کیا ہو جائے گا؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں خود بھی سوچتا ہوں تو بہت حیران ہوتا ہوں۔ ایک ان پڑھ انسان پر اللہ اتنا کرم کر دے کہ اسے بہت سی چیزیں بن کہے اور بن بتلائے سمجھ میں آنے لگیں تو ایسے انسان پر یہ خدا کی نظر کرم نہیں تو اور کیا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اور...... یہ کرم بہت خاص لوگوں پر ہوتا ہے۔'' بہرام خان نے کہا۔

جواباً شاہ زیب خاموش ہو گیا۔

''بہرام خان بھی اس کی جانب دیکھتا رہا اور اسے دیکھ کر اس کے اندر غم اور اضطراب پیدا ہوتا رہا۔ شاہ زیب اپنی لاٹھی کے سہارے اپنے حجرے کے اندر چلا گیا اور بہرام خان وہیں بیٹھا اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دکھی ہوتا رہا کہ اس کے بغیر وہ سارے کام کیسے چلائے گا...... اور

اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو کتنا ادھورا محسوس کرے گا۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہونے لگیں...... اور وہ آہیں بھرنے لگا...... دکھی دل کے ساتھ وہ ڈیرے کے مختلف کاموں میں مصروف رہا، مگر ایک لمحے کو بھی شاہ زیب اس کی سوچوں سے محو نہیں ہوا۔

شاہ زیب حجرے میں چارپائی پر لیٹا چھت کو اپنی تاریک آنکھوں کے ساتھ گھورتا رہا...... اور اپنی سوچوں میں مگن رہا۔

نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا، اسے کوئی خبر نہ تھی، مگر ہر سو چھائی گہری خاموشی سے وہ رات کی تاریکی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اب حجرے کے باہر قدموں کی کوئی چاپ بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ بہرام خان کو اچانک شہر جانا پڑ گیا تھا۔ ان کے ایک ڈرائیور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بہرام خان کا وہاں پہنچنا بہت ضروری تھا۔ وہ شاہ زیب کو بتا کر چلا گیا...... اور اس کے جانے کے بعد دو تین بار ملازمین اس سے مختلف ضروریات کے بارے میں پوچھنے کے لئے آتے رہے، مگر اسے کسی شے کی طلب نہ تھی...... اس کے ذہن میں پچھلی رات کو دیکھا ہوا خواب بار بار گھوم رہا تھا۔ اس نے بہت واضح انداز میں ایک قبر دیکھی تھی اور قبر کے باہر اس نے باسط علی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ باسط علی کے پاس کھڑا ہو کر بہت حیرت سے قبر کی جانب دیکھتا ہے اور سوال کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔

"یہ آپ کی قبر ہے۔" باسط علی اسے بتاتا ہے۔

"میری......؟" شاہ زیب حیرت سے سوال کرتا ہے۔

"ہاں...... بہت جلد...... آپ اس میں دفن کئے جائیں گے۔...... اور میں ہر روز اس پر پھول چڑھایا کروں گا...... یہ کام میرے ذمہ لگایا گیا ہے۔" باسط علی اسے بتاتا ہے اور گلاب کے پھول اور پتیاں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی قبر پر پھیلانے لگتا ہے اور آنکھیں بند کر کے دعا میں مصروف ہو جاتا ہے۔" خواب ختم ہو جاتا ہے۔

"باسط علی کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے...... وہ خواب دیکھنے کے بعد مسلسل یہی سوچتا رہا اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ اللہ سے جو سوال پوچھتا تھا اس کا جواب اسے فوراً مل جاتا تھا۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ وہ کوئی سوال کرتا اور اسے جواب نہ ملتا۔ وہ صبح سے رات تک...... اٹھتے...... بیٹھتے...... لیٹے اور جاگتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوال پوچھ رہا تھا، مگر اسے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ ہر بار گہری خاموشی چھا جاتی۔

"باسط علی...... ہی کیوں......؟" اس کے ذمہ یہ کام کیوں لگایا گیا ہے......؟ میرا اس کے ساتھ کبھی بھی بہت گہرا تعلق نہیں رہا...... اس نے تو مجھے دھوکہ دیا...... اور...... میں نے کبھی اسے دل سے اچھا نہیں سمجھا...... اس سے تو کبھی ملنے کی تمنا بھی نہیں کی...... اسے کبھی اتنا اہم نہیں سمجھا کہ میرے بعد اسے میرا ایک کام سونپا جاتا...... اسے اپنے اور باسط علی سے تعلق کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی...... اور یہ بات اس کے لئے بہت الجھن پیدا کر رہی تھی۔

اچانک اسے پانی کی شدید پیاس سی محسوس ہونے لگی...... اس کے حجرے کے باہر برآمدے میں پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ...... ٹٹولتا ہوا بڑی مشکل سے...... ٹھوکریں کھاتا ہوا گھڑے تک پہنچا۔ گھڑے پر کوئی ڈھکن نہیں تھا...... اس نے پاس رکھے گلاس کو ٹٹول کر گھڑے میں ڈال کر پانی نکالا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ پورا گلاس پی کر وہ پھر حجرے میں چلا گیا اور چارپائی کے ساتھ بچھی چٹائی پر

کھڑا ہو کر نماز ادا کرنے لگا......اس کا دل بہت شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی معافی طلب کرے......نجانے کونسا لمحہ......اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو......وہ جیسے ہی نماز کے لئے کھڑا ہوا......اس کی طبیعت گھبرانے لگی، پیٹ میں درد کے ساتھ ابکائیاں آنے لگیں۔ وہ وہیں تیورا کر گر گیا......اس نے مدد کے لئے کسی کو بلانا چاہا، مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ یونہی تڑپنے لگا......اس نے چھڑی کے سہارے اٹھنا چاہا اور چارپائی پر بیٹھنا چاہا، مگر نہ تو اس کی ابکائی رک رہی تھی اور نہ ہی درد......کتنی ہی دیر وہ اسی اذیت بھری کیفیت سے دوچار ہوتا رہا......اور پھر آنکھیں بند کر لیں......اس کی سانس رک گئی......ہمیشہ کے لئے......صبح ہوتے ہی بہرام خان ڈیرے پر پہنچا......تو......جلدی سے حجرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چٹائی پر شاہ زیب کے مردہ جسم کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ شاہ زیب کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا اور منہ سے ہلکی ہلکی جھاگ بھی نکل رہی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی زہریلی شے کھائی ہو۔ بہرام خان نے ملازموں کو بلایا، اس وقت اکا دکا ڈیرے پر موجود تھے۔

''شاہ جی......نے رات کو کیا کھایا تھا؟'' اس نے سب سے پوچھا۔

''انہوں نے تو رات کو کھانا بھی نہیں کھایا......تھا......کوئی شے بھی نہیں کھائی۔'' بہرام خان کو بتایا گیا۔

''پھر......انہوں نے کیا کھایا......؟ بہرام خان نے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے نیلے ناخن دیکھتے ہوئے سوچا اور ان کا جسم اچھی طرح دیکھنے لگا کہ کسی سانپ یا بچھو نے......ڈسا نہ ہو......مگر جسم پر کہیں کوئی نشان نہ تھا، وہ پریشان ہو گیا۔

''خان جی......ہوسکتا ہے شاہ جی نے گھڑے میں سے پانی پیا ہو۔'' ایک ملازم نے جو کہ دروازے میں کھڑا تھا۔ اچانک گھڑے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......دیکھو......اس میں کوئی......'' بہرام خان نے کہا تو اس ملازم نے جلدی سے گھڑے کے اندر جھانکا اسے کوئی شے نظر آئی اور اس نے جلدی سے گھڑا زمین پر توڑ دیا، اس میں ایک چھوٹا سا مرا ہوا سانپ پڑا تھا......سب حیرت اور خوف سے اسے دیکھنے لگے۔

''اف......میرے خدایا......یہ کیا......؟ یہ شخص جو بڑے بڑے سانپوں اور اژدھوں سے کبھی نہیں ڈرتا تھا......سانپ، کیکڑوں اور بچھوؤں کو اپنے ہاتھوں سے مار دیتا تھا، اس کی موت اس سانپ سے ہوگئی ہے۔'' بہرام خان بری طرح سسکنے لگا۔

یہ سانپ تو اک وجہ ہے......ورنہ وہ تو کل صبح ہی اپنی موت کی پیشین گوئی کر بیٹھا تھا......یہ بات صرف بہرام خان جانتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ شاہ زیب کی موت کی خبر ہر طرف پھیلنے لگی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ زیتون بانو کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ گاؤں کے ہر فرد کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کی عمر صرف چالیس سال تھی اور اس کا وجود پورے گاؤں کے لئے اک رحمت بن چکا تھا۔ اس نے نہ کبھی مزارعوں کو ڈانٹا تھا نہ کبھی تنگ کیا تھا، نہ کبھی ان کی حق تلفی کی تھی اور نہ ہی انہیں کبھی شکایت کا موقع دیا تھا......اس کی موت پر لوگ دل سے دکھی ہو رہے تھے۔ کسی گھر میں چولہا نہ جلا تھا......سب لوگ اسے دل سے چاہتے تھے۔ اس کا کہا کبھی کسی نے نہیں ٹالا تھا اور جب سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس کی مانگی ہوئی دعائیں پوری ہوتی ہیں، تو وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی گہرا اور خاص تعلق ہے، اس لئے وہ شاہ زیب خان سے 'شاہ جی' مشہور ہو گیا۔ لوگ

بہت پرامید ہو کر اس کے پاس آتے تھے، وہ کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرتا تھا کہ وہ کوئی اللہ والا ہے...... یا...... کوئی پیر...... فقیر ہے۔ وہ سب کے لئے ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرتا تھا۔ کسی کی کیا دعا ہوتی، کب اور کیسے پوری ہوتی، اسے خود بھی خبر نہ ہوتی۔ اسے تب پتہ چلتا جب لوگ اس کے پاس شکریہ ادا کرنے آتے اور ان کو خوش اور مشکور دیکھ کر وہ خدا کا شکر بجالاتا۔ اس کی ساری زندگی لوگوں کے سامنے ایک کھلی کتاب تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ یہ جان نہیں پائے تھے کہ اچانک شاہ زیب کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ وہ اللہ والا ہو گیا تھا...... وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اس کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں اور انہوں نے دنیا کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

"باہر کی دنیا نظر آنا بند ہوئی...... تو...... اندر کی دنیا دکھائی دینے لگی۔" لوگ ایک دوسرے کو کہتے۔

"لیکن...... ایسا تو بہت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، مگر ہر ایک پر ایسا کرم کہاں ہوتا ہے جیسا شاہ جی پر ہوا...... وہ اللہ کے خاص بندے تھے۔" انہیں میں سے کوئی جواب دیتا۔

"ہاں...... یہ تو...... مولا کے نظر کرم کی بات ہے...... ہر کوئی...... اس قابل کہاں؟ کوئی اور جواب دیتا۔

"شاہ جی کے جانے سے یہ گاؤں خالی ہو گیا ہے۔ اب...... کوئی اور ایسا دکھائی نہیں دیتا، جو ان کی جگہ لے۔"

ہاں...... "وہ سب مایوسی سے باتیں کرتے۔

سارا گاؤں حویلی کے وسیع و عریض صحن میں جمع تھا۔ زیتون بانو نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتیں...... تھوڑی دیر کے لئے ہوش آتی...... شاہ زیب کی کفن شدہ میت کو دیکھتیں اور پھر گر جاتیں۔

"بہرام خان...... اب کس بات کی دیر ہے...... شام ہو رہی ہے۔ نماز جنازہ ادا کر دینی چاہئے۔" شاہ زیب کے ماموں نے کہا۔

"ہاں...... بس مولوی صاحب کا انتظار ہے...... وہ ساتھ والے گاؤں میں ایک جنازہ پڑھانے گئے ہیں، ابھی تک نہیں لوٹے۔" بہرام خان نے جواب دیا۔

"کیا...... تم نے ان کو نماز جنازہ پڑھانے کو کہا تھا؟"

"کہا تھا......" بہرام خان نے جواب دیا۔

سب منتظر تھے کہ کب مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں، اچانک تیز آندھی چلنے لگی...... اور اس کے ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی، سب گھبرا گئے۔ میت کو اندر کمرے میں رکھا گیا، لوگ تتر بتر ہو گئے، کچھ اپنے گھروں کو چلے گئے، ساری رات بارش ہوتی رہی، پورے گاؤں میں جل تھل ہو گئی۔ ہر طرف کیچڑ اور بارش کا پانی اکٹھا ہو گیا تھا۔ اگر شاہ زیب نیک انسان نہ ہوتا تو ہر کوئی یہی کہتا کہ یہ سب اس کے گناہوں اور برے اعمال کا نتیجہ ہے کہ قدرت نے اتنا طوفان برپا کر دیا ہے...... مگر شاہ زیب کی عصمت و عظمت کا ہر کوئی گواہ تھا، اس کے بارے میں کوئی برا لفظ کہنا بھی اس کی شان میں گستاخی کے برابر تھا۔ نجانے قدرت کی کیا مصلحت تھی کہ جو رات اس نے قبر میں گزارنی تھی، وہ حویلی کے کمرے میں اپنے عزیزوں کے درمیان گزاری۔ صبح ہوتے ہی بارش تھمی...... اور...... موسم قدرے خوشگوار ہو گیا۔ صاف شفاف نیلے آسمان پر سورج بہت پرسکون انداز میں چمک رہا

تھا۔سب نماز جنازہ کے لئے قبرستان پہنچ گئے ۔ ماسٹر باسط علی رات بھر سفر کر کے ڈیرے پر پہنچے تو وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ڈیرے پر اتنی ویرانی اور اداسی تھی......انہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا،جس سے وہ شاہ زیب کے بارے میں پوچھتے۔وہ مخمصے کا شکار ہو رہے تھے۔ڈیرہ یوں کبھی بھی ویران نہیں ہو سکتا......ضرور کوئی خاص بات ہے......اور وہ حویلی جانا نہیں چاہتے تھے۔زیتون بانو سے نظریں ملانے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بیگ اپنے کندھے پر ڈالے ڈیرے کو جاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگے۔

اچانک لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جنازہ اٹھائے ڈیرے کی طرف آتا دکھائی دیا،یوں لگ رہا تھا پورا گاؤں جنازے کے ساتھ ہو...... ماسٹر باسط علی کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔وہ لوگ ڈیرے پر آنے کے بجائے اس سے قدرے فاصلے پر رک گئے اور میت کو دفنانے کی تیاری کرنے لگے۔ماسٹر باسط علی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور شاہ زیب کی میت دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

''جا......جلدی چلا جا......ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' سائیں کے الفاظ ان کے ذہن میں گونجنے لگے۔

''یہ......یہ......کیسے ہو گیا ہے......؟'' ماسٹر باسط علی اپنے حواس پر قابو نہ رکھتے ہوئے چلانے لگے۔بہرام خان نے چونک کر اس اجنبی شخص کو دیکھا اور اسے شک سا ہونے لگا کہ شاید یہ وہی شخص ہے......جس کا ذکر شاہ زیب نے کیا تھا۔

''آپ......کون ہیں؟ بہرام خان نے ماسٹر باسط علی سے پوچھا۔

''ماسٹر باسط علی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا،وہ بلند آواز میں روتے رہے۔ان کی آہ وبکا دیکھ کر سب لوگ حیران ہونے لگے۔

''بہرام خان......جلدی کرو......پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' شاہ زیب کے ماموں نے کہا اور سب نے مل کر شاہ زیب کو لحد میں اتارا۔ سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور دعا پڑھنے کے بعد ان کی قبر پر پھول چڑھائے۔سب آہستہ آہستہ وہاں سے جانے لگے،مگر بہرام خان کی نظر ماسٹر باسط علی پر تھی،جو ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر شدت سے آنسو بہا رہے تھے۔سب کے جانے کے بعد بہرام خان ان کے پاس آیا۔

''آپ......کون ہیں......اور کہاں سے آئے ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ایک......گنہگار'' ماسٹر باسط علی سسکتے ہوئے بولے۔۔

''کیا......آپ......شاہ زیب......بھائی......کو جانتے تھے؟'' بہرام خان نے پوچھا

''مجھ سے زیادہ......کون......ان کو جانتا ہو گا......میں ان کا گنہگار اور مجرم ہوں......ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا،نجانے کیوں دیر ہو گئی......'' ماسٹر باسط علی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے آپ کو معاف کر دیا تھا۔'' بہرام خان نے کہا۔

''ک......کیسے ماسٹر باسط علی نے پوچھا......'' وہ بہت اللہ والے تھے......ان کو آپ کی آمد کی خبر ہو چکی تھی۔'' بہرام خان نے کہا۔

''تم نہیں جانتے......وہ کون ہے......؟ سائیں کے الفاظ پھر ماسٹر باسط علی کے ذہن میں گونجے۔

''اللہ......والے......'' ماسٹر باسط علی بڑبڑائے۔

''ہاں......اللہ کے خاص بندے...... جب سے ان کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی۔ اللہ نے ان کے دل کی آنکھوں کو روشن کر دیا تھا۔ ان کو بہت سچے خواب آنے لگے تھے اور ان کی کہی ہوئی باتیں اور دعائیں پوری ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے کل مجھے اپنی موت کی خبر بھی دے دی تھی۔''
بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی چونک کر اس کی باتیں سننے لگے...... انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سائیں گا بے بگا بے شاہ زیب کے بارے میں اسے جو کچھ ذومعنی انداز میں بتاتا تھا، وہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی کے اندر وہی اضطراب پیدا ہونے لگا جو انہوں نے سائیں کی وساطت سے آسمان کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ ان کے اندر پھر ویسے ہی دریچے کھلنے لگے تھے۔ روشنی کی وہ لہر پھر نمودار ہوئی تھی، جوان کے قلب و روح کو بے قرار کر رہی تھی۔ رگ و پے میں برقی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ ان کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

''آپ......کو......کیا ہو رہا ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' ماسٹر باسط علی نے اپنے سرخ، تپتے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہاں سے جانے کے لئے مڑنے لگا۔

''آیئے...... آپ بھی قبر پر پھول ڈال دیں۔'' بہرام خان نے کہا اور ماسٹر باسط علی اس کی سنگت میں قبر پر چلے گئے...... اور جیسے جیسے قبر پر پھول ڈالنے لگے۔ ان کے اندر کے اضطراب کو سکون سا ملنے لگا...... برقی لہر جو رگ و پے میں آگ لگا رہی تھی۔ سرد پڑنے لگی۔ ان کے بے قرار وجود کو سکون سا میسر آنے لگا۔ ایسا سکون انہیں بہت عرصے کے بعد پہلی بار میسر آ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ جس آگ میں بری طرح تڑپ رہے تھے اور سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آ رہا تھا۔ اس لمحے ایسا سکون ان کی روح میں اتر رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران ہو رہے تھے۔ دعا کے لئے ہاتھ بلند کرتے ہوئے وہ سسکنے لگے۔

''شاہ جی...... میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آپ نے مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا۔ شاید قدرت کو منظور نہیں تھا...... میں آپ کا سب سے بڑا گنہگار ہوں...... خطاوار ہوں...... آپ کا مجرم ہوں، آپ دوسروں کے لئے دعائیں کرتے رہے...... میرے لئے بھی خدا کے حضور دعا فرما دیں......'' ماسٹر باسط علی دل ہی دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کرنے لگے...... اور...... دعا کرنے کے بعد وہ بیگ اٹھا کر واپس جانے کے لئے مڑے۔

''شاہ جی کا حکم تھا...... کہ آپ کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔'' بہرام خان نے کہا۔

''کیا...... مطلب......؟'' ماسٹر باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

''شاید آپ کو شاہ جی کی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ کام کرنے ہیں۔'' بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''میں...... اس قابل کہاں؟'' ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

اللہ کا فضل موسلا دھار بارش کی مانند ہوتا ہے، جس انسان پر برس جائے...... وہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔ آپ خوش قسمت انسان ہیں، جن پر قدرت مہربان ہو رہی ہے اور اپنا خاص کرم کر رہی ہے۔'' بہرام خان نے ماسٹر باسط علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ماسٹر باسط علی کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے۔ ’’اللہ واقعی بہت رحیم و کریم ہے۔ انسان کو وہاں سے عطا کرتا ہے، جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا...... قدرت شاید انہیں کوئی منصب عطا کرنے جا رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان کے اندر پھر ہلچل سی پیدا ہونے لگی، پھر آگ سی بھڑ کنے لگی...... اور طوفان سا برپا ہونے لگا۔ انہوں نے بے قرار ہو کر پھر پھول دونوں ہاتھوں میں لیے اور قبر پر ڈالنے لگے۔ انہیں پھر وہی سکون ملنے لگا...... وہی قرار، وہی ٹھنڈک، ایک دم بھڑکتی آگ سرد پڑنے لگی۔

’’اب...... میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا...... ایسا قرار مجھے کہیں نہیں ملے گا...... جو سکون اس قبر پر پھول ڈالنے سے مل رہا ہے، اس سے قبل کبھی نہیں ملا...... کبھی نہیں ملا......‘‘ ماسٹر باسط علی نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔

’’میں یہاں شاہ جی کا مزار بنواؤں گا اور آپ یہیں رہیں گے...... اس مزار پر۔‘‘ بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا دیے۔ دونوں ہاتھوں میں پھول بھر بھر کر قبر پر ڈالنے لگے تو ان کے چہرے پر طمانیت سی پھیلنے لگی۔

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجّال...... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

حصہ سوئم

(۱)

بڑی سرکار کے عظیم الشان شاہی دربار میں حاضرین خاموش کھڑے تھے۔انسانوں کو اذیت میں دیکھ کر وہ بھی مضطرب ہو رہے تھے اور بے شمار سوالات ان کے ذہنوں میں جنم لے رہے تھے۔یہ کیسا شاہکار ہے جو اتنی اذیتیں اٹھا رہا ہے۔کیا یہ صرف تکلیفیں اٹھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ یہ کیسا انسان ہے......جس کے لئے نعمتیں بھی آزمائش بن گئی ہیں۔کوئی عطا بھی اذیت سے خالی نہیں۔وہ سوچ رہے تھے اور مضطرب بھی ہو رہے تھے،مگر ابھی انہیں بڑی سرکار سے کچھ بھی پوچھنے کا اذن نہیں ملا تھا......اس لئے وہ خاموش تھے۔اچانک کسی مضطرب انسان کے شکوؤں اور آہوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔آہوں کی بازگشت شاہی دربار میں گونجنے لگی،حاضرین نے حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھا،مگر صدائیں کہیں اور سے آرہی تھیں۔انہوں نے نیچے دیکھا۔

☆

شدید سردی کا موسم تھا،آدھی رات کا وقت تھا،ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی،شہیر اپنے بیڈروم میں بیڈ پر کمبل اوڑھے نیم دراز تھا۔اس کا دو سالہ بیٹا علی اس کے سینے پر سر رکھے سو رہا تھا۔اس نے بہت مشکل سے اسے سلایا تھا۔حرا کی نائٹ ڈیوٹی تھی،اس لئے شہیر کو اسے سلانا پڑا۔شہیر کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔اس کے سر کے بال قدرے سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات نمایاں تھے،آنکھوں میں ایک اداسی سی ٹھہر گئی تھی۔رات کی اس تنہائی میں اسے زنل بہت یاد آرہی تھی،وہ کبھی بھی اسے بھول نہیں پایا تھا......گو کہ بہت مشکل سے اس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ زنل کو پانا کبھی بھی ممکن نہیں۔زنل اس کے لئے آسمان پر چمکتے ستارے کی مانند تھی......جس کو دیکھ کر اور جس کو یاد کر کے وہ صرف خوش ہو سکتا تھا،مگر کبھی اسے پا نہیں سکتا تھا۔اس نے اس کو پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔مگر قدرت نے ہر بار اسے بری طرح مات دی تھی......اور اسے ایسی شکست سے دوچار کیا تھا،جو ہر وقت اسے اندر ہی اندر مضطرب اور بے چین رکھتی۔وہ جب بھی تنہا ہوتا تو زنل اس کے پاس آجاتی۔زنل کی یاد سے فرار ناممکن تھی......اس کی یادیں اسے اور بے چین کرنے لگتیں۔لوگ کہتے ہیں......جذبے سچے ہوں تو آرزوؤں کی تکمیل ضرور ہوتی ہے،مگر سچی محبت ہر بار کیوں ہار جاتی ہے......؟ کیا سچی محبت کی قسمت میں ایسی ہی ناکامی اور شکست لکھی گئی ہے......؟ محبت کی ساری داستانوں میں یہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئی ہے......محبت ہر بار ادھوری کیوں رہ جاتی ہے اور یہ ادھوری محبت کتنا تڑپاتی ہے......کتنا مضطرب رکھتی ہے......کاش کوئی سمجھ سکے......! اس نے چھت کی طرف اپنی نم آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دل میں خدا سے شکوے کرنے لگا۔

”دنیا میں بہت سے لوگ محبت کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو تو ملا بھی دیتا ہے......میں نے کیا گناہ کیا تھا کہ تو نے مجھے ہر بار بری طرح شکست دی......میں نے اس کو پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا......اُسے یقین دلانے کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگایا......اسے پانے کے لئے

ارسلان جیسے اچھے انسان کو اپنے راستے سے ہٹا دیا...... میں گنہگار اور قاتل بن گیا...... میں اپنی محبت کی شدت میں اس قدر جذباتی اور اندھا ہو رہا تھا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا...... میرا کوئی بھی مقصد نہیں تھا...... سوائے زل کو پانے کے...... اور جب وہ مجھے ملنے کے قریب تھی...... تو پھر تو نے اس کو مجھ سے چھین لیا۔ ہر بار میرے ساتھ ایسا کیوں کیا......؟ اگر تو نے اسے میرے نصیب میں نہیں لکھا تھا...... تو پھر اس کی محبت میرے دل میں کیوں ڈالی...... اور اس کی محبت میرے دل میں ڈال کر اس کے دل میں کسی اور کی محبت ڈال دی...... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے...... میں زل اور ارسلان کا مجرم بھی ٹھہرا...... اور اپنی نظروں میں بھی گنہگار......؟ وہ سسکنے لگا۔

''محبت...... میرے لئے اتنی بڑی آزمائش بن جائے گی...... کاش مجھے معلوم ہوتا...... تو میں کبھی زل کی طرف بھی نہ دیکھتا...... مگر کسی کو چاہنا اور نہ چاہنا، نہ انسان کے بس میں ہوتا ہے اور نہ اس کے اختیار میں......

میں حرا کا بھی مجرم ہوں...... جس نے نارمل زندگی تک لانے میں...... میرا کتنا ساتھ دیا، کتنی جدوجہد کی، کتنی قربانیاں دیں، اپنی محبت بھی قربان کر دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ سمیر سے بہت محبت کرتی ہے اور سمیر اس سے، مگر میں کتنا غاصب نکلا کہ دونوں کو آزمائش میں ڈال کر ان سے ان کی محبت چھین لی اور وہ خاموش رہے...... شاید ان کی بددعا ہی مجھے لگ گئی ہے کہ مجھے میری محبت ملتے ملتے رہ گئی۔

''ہاں...... شاید...... یہ حرا کی بددعائیں تھیں...... میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی...... اسے بہت اذیت میں ڈالا۔'' شہیر کا دل بری طرح کانپنے لگا۔

''نہیں...... حرا...... مجھے بددعا نہیں دے سکتی...... کبھی بھی نہیں...... وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہے...... ''محبت''......؟ اس کے دل نے حیرت سے سرگوشی کی۔

''حرا...... مجھ سے کیسے محبت کر سکتی ہے......؟ جبکہ میں نے کبھی بھی اس سے ویسی محبت نہیں کی، جیسی زل سے کی ہے...... جبکہ زل نے تو میرے لئے کبھی بھی کچھ بھی نہیں کیا تھا، جو کچھ حرا نے میرے لئے کیا ہے۔ زل کے کینیڈا جانے کے بعد حرا نے کس کس طرح اس کے ٹوٹے دل کو سنبھالا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اس نے زل سے اپنی شدید محبت کی ایک ایک بات اسے سنائی تھی اور وہ سب کچھ خاموشی سے سن کر اس کی دلجوئی کرتی رہی، کس عورت میں اتنا ظرف ہو سکتا ہے، جتنا حرا میں تھا۔

زل کو کینیڈا گئے پانچ سال ہو گئے تھے...... اور حرا سے شادی کو دس سال گزر گئے تھے۔ کتنے کٹھن مراحل طے کر کے اب وہ ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ شہیر نے اپنے فن میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی تھی اور اس مقام تک پہنچانے میں حرا نے ہر قدم پر اس کا بہت ساتھ دیا تھا...... اس نے اس کی ڈرنک کی عادت چھڑائی تھی...... اس کی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کے احساسات اور جذبات کی بہت پروا کرتی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ شہیر کو دے دیا تھا۔ شاید محبت بھی......''

''نہیں...... وہ مجھے کبھی بھی نہیں دے سکتی، جو اس کے دل میں سمیر کے لئے مخصوص تھی...... جس طرح میں زل کی محبت اسے کبھی نہیں دے پایا۔

علی نے کروٹ بدلی اور رونا شروع ہو گیا۔ شہیر نے اسے گلے سے لگایا اور چپ کرانے لگا، مگر وہ روتا ہی چلا جا رہا تھا، وہ اسے اٹھا کر گلے

سے لگا کر کمرے میں چکر لگانے لگا اور اسے محبت سے والہانہ انداز میں چومنے لگا۔

”یہ محبت کتنی مختلف ہے، اس محبت سے جو میں زمل سے کرتا ہوں..... محبت کا ہر روپ کتنا انوکھا اور دلفریب ہے..... علی کو کچھ ہو جائے میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ علی کو میں اپنے آپ سے جدا بھی نہیں کر پاؤں گا..... یہ میرے وجود کا حصہ ہے..... میرا خون ہے..... میری نسل ہے..... میری محبت کی نشانی ہے..... شاید میرا سب کچھ ہے، مگر اس کے لئے محبت اور ہے.....اور زمل کے لئے اور.....اور..... حرا کے لئے.....؟ حرا سے میں کیسی محبت کرتا ہوں.....؟

”حرا مجھے کمرے میں نظر نہ آئے تو میں اسے مس کرتا ہوں۔ دکھائی نہ دے تو دیکھنے کو بے تاب ہو جاتا ہوں..... وہ روٹھ جائے تو مضطرب ہو جاتا ہوں۔“ رات گئے تک وہ اسے مس کالز دیتا رہا.....

”پھر بھی..... میں حرا سے زمل جیسی محبت کیوں نہیں کر پایا..... وہ علی کو کندھے سے لگائے کمرے کا چکر کاٹتے ہوئے سوچنے لگا۔

اس کا موبائل بجنے لگا، حرا کا فون تھا۔

”کیا آپ سو رہے تھے؟“

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“

”علی اٹھ گیا تھا۔ اس کو سلا رہا ہوں..... اب سویا ہے۔“ شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”کیا آپ نے میڈیسنز لی ہیں؟“

”ہاں.....“

”اپنا خیال رکھیے گا..... اور..... سو جائیں۔“ حرا نے کہا۔

”تھینکس.....“ وہ بولا۔

”حرا.....“ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

”جی.....“ وہ ایکدم یوں بولی جیسے وہ کچھ سننے کے لیے شدید بے تاب ہو۔

”حرا..... تھینکس..... فار یور کیئر..... اینڈ۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا۔

”اینڈ.....؟“ وہ پھر بے صبری سے بولی۔

”یور..... لو..... (Your Love) آئی.....“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

”آئی.....؟ کیا.....؟“ حرا نے متجسس ہو کر پوچھا۔

”آئی..... مس..... یو“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

محی الدین نواب کے قلم سے معاشرے کے ارد گرد گھومتی ہوئی کہانی
کچے رشتے
قیمت-/150 روپے

''آپی......تو......؟......'' وہ مایوس کن لہجے میں بولی۔

''بائے......اپنا خیال رکھنا......سردی بہت ہے۔'' شہیر نے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

''میں حرا سے کبھی بھی اظہار محبت کیوں نہیں کر پاتا......میری زبان کیوں رک جاتی ہے......الفاظ میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیتے ہیں......میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس کا معترف ہوں، اس سے محبت بھی کرتا ہوں......مگر اس سے کہہ کیوں نہیں پاتا۔ شاید اس لئے کہ ڈرتا ہوں کہ وہ میری محبت پر یقین نہیں کرے گی......اور مجھے ازل سے اپنی محبت کا بھرم بھی تو رکھنا ہے......کہ میں اس جیسی محبت کسی اور سے نہیں کر پاؤں گا۔''

''یا خدایا! یہ تو نے ہمارے ساتھ کیسا کھیل کھیلا ہے......تو نے ہمیں کتنا الجھا دیا ہے......تو نے ہمیں کتنا مضطرب کر دیا ہے۔ کاش......! تو یہ سب کچھ نہ کرتا......کاش......! محبت کو ہمارے لئے اتنی بڑی آزمائش نہ بناتا......کاش......تو......؟ شہیر اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگا اور سسکنے لگا۔ اس کی آہیں اور سسکیاں سن کر حاضرین محفل بھی مضطرب ہونے لگے......اور سفید روشنی کی طرف استفہامیہ اور حیران کن نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ مگر ہر طرف گہری خاموشی تھی۔

☆

باہر شدید دھند اور سردی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ حرا کی ایمرجنسی روم میں نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رات کو ایک بجے......ایک عورت ایمرجنسی حالت میں لائی گئی تھی......اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی تھی اور اس کیس سے فارغ ہو کر حرا اپنے روم میں آ کر بیٹھی تھی۔ سردی اور تھکاوٹ سے اس کا جسم درد سے کراہ رہا تھا......اسے رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس میں پہلے جیسی ہمت اور طاقت نہ رہی ہو......اس کے اعصاب تھکنے لگے تھے۔ زندگی کے اتنے سال انتہائی جدوجہد میں ہی تو گزارے تھے۔ پہلے تعلیم حاصل کرنے کی تگ و دو اور پھر شادی کے بعد اپنے آپ سے لڑنے، سمجھانے اور شہیر کو سنبھالنے میں گزر گئے۔

دس سال اس نے جس طرح گزارے تھے یہ وہی جانتی تھی۔ اس نے اپنا اوور کوٹ اتار کر شال اوڑھی اور ہیٹر آن کیا۔ تھرماس میں سے گرم پانی کپ میں ڈال کر کافی بنائی اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔ جسم میں کچھ حرارت سی پیدا ہونے لگی۔ اس نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور ایمرجنسی روم میں مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک راؤنڈ لینے چلی گئی۔ واپس کمرے میں آئی تو اس کے موبائل پر شہیر کی دو تین مسڈ کالز تھیں۔ اس نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شہیر ابھی تک نہیں سویا تھا۔ اس نے اس کا نمبر ملایا۔ شہیر نے پہلی بیل پر فون اٹھایا۔ خیریت......آپ نے فون کیا تھا......؟ حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......آج باہر بہت سردی ہو رہی ہے......آپ ٹھیک ہیں نا......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ہاں......میں ٹھیک ہوں......اور آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں......علی تنگ تو نہیں کر رہا؟'' حرا نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نہیں......وہ سو رہا ہے......''

''اور......آپ......؟'' حرا نے متجسس انداز میں پوچھا۔

''نیند نہیں آ رہی......''

''کیوں......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا......'' حرا نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں......''

''پھر......نیند کیوں نہیں آ رہی؟'' حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''آئی واز مسنگ یو......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''تھینکس......'' وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''اگر ہوگی......تو کیا آپ دینے آئیں گے؟'' حرا نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''تھینکس......'' وہ قدرے پر مطمئن لہجے میں بولی۔

دونوں خاموش ہو گئے جیسے شہیر کچھ کہنا چاہتا ہو اور حرا کچھ سننے کے لئے بے تاب ہو مگر شہیر کچھ نہ بولا۔

''اپنا خیال رکھنا'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''تھینکس......اور آپ بھی سو جایئے'' حرا نے مایوس کن لہجے میں قدرے سنجیدگی سے کہا اور موبائل آف کر دیا۔ وہ کرسی کی پشت کے ساتھ دوبارہ سر ٹکا کر چھت کو گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔

میں شطرنج کی بساط پر پٹا ہوا مہرہ ہوں جسے خود بھی معلوم نہیں کہ اسے کیسے کیسے اور کس کس نے مات دی ہے......؟

محبت نے......؟

سمیر نے......؟

شہیر نے......؟

زل نے......؟

قسمت نے......؟

یا پھر......

خدا نے......؟

اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

محبت...... مجھے اس قدر آزمائے گی۔ مجھے معلوم نہ تھا...... میں تو اسے انتہائی خوبصورت اور لطیف جذبہ سمجھتی تھی...... بڑے مان سے میں نے اس کی شاہراہ پر قدم رکھا تھا...... سمیر کی محبت نے مجھے اتنا سرشار کر دیا تھا کہ مجھے دنیا کی ہر شے...... ہر شخص اور ہر جذبہ...... سمیر اور اس کی محبت کے سامنے بے معنی اور فضول محسوس ہوتا تھا۔ سمیر کی محبت نے مجھے اتنا خوش اور پر اعتماد بنا دیا تھا کہ مجھے اپنی منزل بالکل سامنے نظر آتی تھی...... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ قدرت مجھے اس قدر آزمائے گی...... میری منزل میرے سامنے تھی...... چند قدم کے فاصلے پر...... اور درمیان میں شہیر حائل ہو گیا...... شہیر کہاں سے آ گیا......؟ وہ شخص مجھے ڈیزرو نہیں کرتا تھا...... یا پھر میں سمیر کے قابل نہیں تھی...... کہ خدا نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے چھین لیا......" وہ سسکیاں بھرنے لگی

اور مجھے اس شخص سے ملا دیا...... جسے نہ میری ضرورت تھی اور نہ ہی میری محبت کی...... اسے جس کی تمنا تھی...... اور جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا...... وہ کسی اور کی چاہت تھی...... یہ تو نے کیسی بساط بچھائی ہے؟ جس کا ہر مہرہ اپنی اپنی جگہ پر بری طرح مضطرب ہے...... میں شہیر سمیر...... اور شاید زنل بھی......" اس نے آہ بھر کر سوچا۔

اس کے موبائل پر شہیر کا میسج آیا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا...... علی اٹھ گیا تھا اور اس نے اسے فیڈر پلا کر پھر سلا دیا تھا...... وہ اسے مس کر رہا تھا۔ وہ میسج پڑھ کر زیر لب مسکرائی...... اور گہری سانس لی۔

"تم مجھے 'مس' کرتے ہو...... میں جانتی ہوں......"

"تم میری عزت کرنے لگے ہو...... مجھے معلوم ہے"

"تم میرا بہت خیال رکھنے لگے ہو۔ مجھے اس کا بھی اندازہ ہے"

"شاید...... تم مجھ سے محبت بھی کرنے لگے...... مجھے اس کا اندازہ نہیں"

"شادی کو دس سال گزر جانے کے بعد بھی...... تم نے مجھ سے ایک بار بھی اظہار محبت نہیں کیا...... تم ہمیشہ...... آئی...... کہتے کہتے رک جاتے ہو...... تو میں سمجھ جاتی ہوں...... تم کیا کہنا چاہتے ہو...... مگر تم کہہ نہیں پاتے...... شاید تم ڈرتے ہو...... اظہارِ محبت سے...... یا...... اقرار محبت سے کہ...... شاید میں تمہاری محبت پر یقین کروں یا نہ کروں...... شاید تم اپنے آپ سے بھی ڈرتے ہو کہ "زنل" کی محبت میں مجھے شریک کر کے اس سے کوئی بد دیانتی نہ کر بیٹھو...... شہیر...... میں بے تاب رہتی ہوں...... اور بہت بے قرار بھی...... تم سے یہ سننے کے لئے...... کہ تم مجھ سے بھی ویسی محبت کرتے ہو...... جیسی زنل سے ابھی تک کرتے ہو...... میں جانتی ہوں تمہارے دل میں آج بھی "زنل" ہے...... اور میں کہیں آس پاس...... مگر میں تمہارے دل کے اس مقام تک نہیں پہنچ پائی...... جو اس کے لئے مخصوص ہے...... میں کس قدر محروم ہوں...... کس قدر مضطرب...... کس قدر تشنہ اور بے قرار......

میں نے سمیر کی محبت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی...... اپنا جسم اپنا دل...... اپنی زندگی اور اپنی روح...... اس شخص کو سونپ دی...... جو کبھی میرا نہیں تھا...... اور جس کو اپنا بنانے کے لئے مجھے کتنی کٹھن آزمائش میں سے گزرنا پڑا ہے...... آج وہ مجھ سے شناسائی کے سارے دعوے کر سکتا ہے...... میرے لئے اپنی دولت، اپنا آرام...... اپنی آسائشیں اور شاید اپنی جان بھی دینے کو تیار ہو سکتا ہے...... مگر...... محبت نہیں......" اس نے آہ بھر کر سوچا۔

تونے میری محبت کا کاسہ اتنا خالی کیوں رکھا......؟

محبت کے معاملے میں مجھے اتنا محروم کیوں رکھا......؟

کیا میں کسی کی محبت کے قابل نہیں تھی۔

''نہ شہیر کی......اور نہ ہی سمیر کی......'' وہ سسکیاں بھرنے لگی اور دل میں چپکے چپکے کرنے والے شکوؤں کی بازگشت اور پرشاہی دربار میں سنائی دینے لگی۔ حاضرین افسردہ ہونے لگے۔

☆

شام کے ملگجے سائے ہر جانب پھیل رہے تھے۔ موسم سرد مگر خوشگوار ہو رہا تھا۔ ہر طرف ہوا سے جھولتی درختوں کی ٹہنیاں اور پتے اپنے اندر موسم کی سرشاری بھر رہے تھے اور گردوپیش کی خوبصورتی ندا اور سمیر کے دلوں میں بھی سرشاری اور مسحورکن احساسات پیدا کر رہے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ وہ لندن کے ایک بہت بڑے اور خوبصورت وسرسبز وشاداب پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے......ندا اور سمیر کی شادی کو صرف چند ماہ گزرے تھے۔

سمیر نے شادی نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا......حرا نے شادی کے پانچ سال کس قدر اذیت میں گزارے تھے......سمیر اچھی طرح جانتا تھا حرا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے تھے جب وہ پانچ سال پہلے پاکستان گیا تھا اور شہیر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا......ان دنوں حرا نے شہیر سے خلع لینے کا سوچا تھا مگر شہیر کو بیمار دیکھ کر اور سمیر کے کہنے پر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا......انگلینڈ واپس آنے سے پہلے وہ آخری بار حرا سے ملا تھا۔ ایک بار پھر سمیر نے حرا کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر اسے خلع لینے سے روکا تھا۔

''محبت خودغرض نہیں ہوتی......بہت بے لوث ہوتی ہے......اس کا دامن بہت وسیع ہوتا ہے یہ سب کے درد اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے......میری خاطر......میری محبت کی خاطر......اپنا ارادہ بدل لو'' سمیر نے اسے کہا تو اس نے نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''سمیر......محبت صرف ایک بار ہوتی ہے......بار بار نہیں......تم نے مجھ سے میری محبت کا تاوان لینے کی کوشش کی ہے......اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ تاوان کیسے دیتے ہیں......؟ اس کے بعد حرا نے نہ کبھی اسے فون کیا......نہ اس کی کال اٹینڈ کی اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ رکھا......دو سال پہلے علی کی پیدائش کے بارے میں جان کر وہ بے حد خوش ہوا تھا اور حرا کو مبارکباد کا فون کیا تھا......سمیر بے حد خوش تھا اور وہ اس کی پرجوش آواز سن کر خاموش رہی تھی۔ 'شکریہ' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا......سمیر مطمئن ہو گیا جب اسے معلوم ہوا کہ شہیر......حرا کے ساتھ اچھی اور نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ شہیر آرٹ میں بہت نام پیدا کر رہا ہے۔ سمیر اور حرا نے اپنی محبت کی جو قربانی دی تھی......وہ اس میں کامیاب ہو گئے تھے۔

چار ماہ پہلے حرا نے اسے فون کیا تھا......سمیر ایک آفس میں جاب کرتا تھا......آفس ٹائم تھا جب حرا کا فون آیا تو وہ چونک گیا۔

''حرا تم......؟'' وہ انتہائی پرجوش انداز میں بولا۔

''ہاں......میں......آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں......وعدہ کریں آپ میری بات مانیں گے'' حرا نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''کوئی ایسی بات مت کہنا......جو میرے اعصاب پر بھاری ہو......اور......جو......؟'' سمیر نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں......آپ وعدہ کریں آپ وہی کریں گے جو میں کہوں گی......کیا میں اتنا بھی ڈیزرو نہیں کرتی؟'' حرا نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

سمیر خاموش ہو گیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

''ٹھیک ہے......تم میرے ساتھ اتنی زیادتی نہیں کر سکتی جتنی میں نے تمہارے ساتھ کی ہے......آپ جو کہیں گی میں مانوں گا......'' سمیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ شادی کر لیں......'' حرا نے جلدی سے کہا۔

''شادی......؟'' سمیر کے لئے یہ بات انتہائی غیر معمولی تھی۔

''ہاں......ممی آپ کی وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتی ہیں'' حرا نے کہا۔

''کیا......تم بھی یہی چاہتی ہو......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کس سے شادی کروں......یہ بھی بتا دو؟''

''جس کو آپ کا دل پسند کرے''

''اور اگر اسے پانا......ناممکن ہو......تو......؟''

''پھر......اس سے......جو آپ کو پسند کرے اور آپ سے شادی کی خواہشمند ہو'' حرا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے کتنی بڑی آزمائش میں ڈال رہی ہو......کیا تم جانتی ہو؟''

''اس سے بڑی......آزمائش تو نہیں ہوگی......جس میں......آپ نے مجھے ڈالا ہے'' حرا نے جواب دیا۔

''ہاں......'' سمیر نے مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔

حرا نے فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆

ندا سمیر کے آفس میں جاب کرتی تھی......انگلینڈ میں ہی پیدا ہوئی......اس کی عمر 23 سال تھی اور سمیر اس سے پندرہ سال بڑا تھا مگر وہ بہت ینگ سمارٹ اور ہینڈسم لگتا تھا۔ ندا کی دو سال پہلے اپنے کزن باسط سے شادی ہوئی وہ پاکستان سے آیا تھا مگر ندا کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر سکا اور دونوں میں طلاق ہو گئی۔ ندا بہت پریشان رہتی تھی اور سمیر ہمیشہ اسے دلاسہ دیتا......اور اس کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتا......ندا سمیر میں دلچسپی لینے لگی......جب حرا نے سمیر کو شادی کرنے کو کہا تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے یہ پیغام ندا کے لئے دیا جا رہا ہو......ندا کا دل بہت ٹوٹا ہوا تھا اور وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ سمیر اسے روتے دیکھ کر بہت افسردہ ہوتا تھا......حرا نے اسے شادی کا کہا تو ندا اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

''ندا کو میری ضرورت ہے...... وہ بہت ٹوٹ چکی ہے...... حرا کی طرح۔ شاید میں حرا سے کی گئی زیادتی کی کچھ تلافی کر سکوں'' سمیر نے بہت سوچ کر ندا کو پرپوز کیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ سمیر جیسا زبردست قسم کا انسان...... جس کا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔ نہ آفس میں...... نہ...... آفس سے باہر...... جس کی سب سے دوستی تھی مگر کوئی لڑکی اس کے دل میں نہیں رہتی تھی۔ سمیر جیسا خالص انسان ندا کو مل رہا تھا۔ ندا بے حد خوش تھی۔

سمیر نے ممی اور ڈیڈی کو انگلینڈ بلایا اور وہیں سادگی سے ان کی شادی ہوئی۔ سمیر...... حرا کے سامنے نہ تو شادی کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی ندا کو کبھی لے کر جانا چاہتا تھا...... ممی...... ڈیڈی بہت خوش تھے کہ سمیر کا گھر بس گیا ہے۔ ندا انہیں بھی بہت پسند آئی۔ بہت خوبصورت، دبلی، پتلی، لمبی، سمارٹ، تیکھے نقوش کی مالک...... انہیں بہت بھائی۔ ندا بے حد خوش تھی...... کہ اسے باسط سے اچھا شوہر ملا تھا...... سمیر...... ایسا شخص تھا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے لئے اطمینان کی بات یہ تھی کہ سمیر کے دل میں کوئی لڑکی نہ تھی سوائے ندا کے...... کوئی اور ہوتی تو سمیر اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ سمیر میں کسی بھی بات کی کوئی کمی نہ تھی...... ندا کو بہت خوش فہمی تھی کہ وہ سمیر کی زندگی میں آنے والی ''پہلی'' اور شاید ''آخری'' لڑکی تھی۔ وہ سمیر کے بارے میں بہت پوزیسو تھی...... شادی کے بعد وہ ایک دم بدل گئی...... وہ پہلے بہت سنجیدہ اور سوبر دکھائی دیتی تھی۔ اب ایک دم لاابالی بن گئی۔ اس میں کھلنڈرا پن اور امیچورٹی نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔ ناز نخرے ادائیں...... چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتہائی خوش ہونا...... اپنے معمولی کاموں پر فخر محسوس کرنا...... دن بھر اپنے کیے ہوئے کاموں کو بتا بتا کر تعریفیں کرنا...... ندا کی عادت تھی اور سمیر کو یہ سب کچھ جان کر سخت حیرت اور کوفت ہوتی۔ آفس میں اس کا رویہ قدرے مختلف تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ندا اس قدر بدل جائے گی...... شادی سے پہلے کی ندا اور اب کی ندا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آفس میں وہ سمیر کے سامنے ہمیشہ بہت سنجیدہ...... سوبر اور نم آنکھوں کے ساتھ آئی...... اور اب وہ بے ہنگم انداز میں ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی اور سمیر حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہتا...... مگر کچھ نہ کہتا...... شاید دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا...... یا سوچ میں...... دو مختلف ذہنوں کے لوگ اچانک مل گئے تھے۔ ندا سمیر کو پا کر بے حد مسرور تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نے اپنی سب سے قیمتی شے سے اس کو نواز دیا تھا اور سمیر اسے پا کر بے حد اداس تھا...... اسے ہر لمحہ حرا یاد آتی وہ بھی شہیر کو پا کر یونہی اداس اور پریشان ہوتی ہو گی...... شاید قدرت مجھے اس درد اور اس کرب سے آشنا کرنا چاہ رہی ہے جس کو میں اس طرح محسوس نہیں کرتا تھا جس طرح اب کرتا ہوں...... سمیر وہی کرتا...... جو ندا چاہتی...... وہ تو اس کو خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا تھا اور وہ خود کتنا خوش تھا...... یہ وہی جانتا تھا...... ندا کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا۔ وہ سمجھتی کہ اس میں واقعی کوئی ایسی بات ہے...... ایسا کمال ہے جو سمیر اس کی باتوں کو مانتا ہے...... اور کبھی کبھی وہ کسی شاطر عورت کی طرح اسے ایکسپلائٹ بھی کرتی مگر وہ خاموش رہتا...... سمیر کی زندہ دلی...... زندگی میں جوش، جذبہ تو حرا کی شادی کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر ندا نے پوری کر دی تھی۔

ندا کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ چھٹی کا دن وہ گھر نہیں گزار سکتی تھی جبکہ سمیر کا دل بالکل بھی باہر جانے کو نہیں چاہتا تھا مگر وہ ندا کی خاطر چلا جاتا...... ہر چھٹی کے روز وہ کھانا بناتی اور دونوں پکنک کے لئے باہر چلے جاتے۔

آج بھی دونوں خوبصورت پارک کے ایک بنچ پر بیٹھے تھے...... اردگرد لوگ گھوم پھر رہے تھے...... بچے کھیل رہے تھے۔ ندا بہت خوش تھی۔

''سمیر......اس پارک میں......میں......اور باسط اکثر آیا کرتے تھے'' ندا نے کہا تو سمیر اس کی بات سن کر خاموش رہا۔

''سمیر......تم نے کبھی مجھ سے باسط اور میرے ٹرمز کے بارے میں نہیں پوچھا''

''کیا پوچھوں......؟'' سمیر نے آہ بھر کر پوچھا۔

''کیا یہ بھی نہیں پوچھو گے......کہ میں اس سے زیادہ محبت کرتی ہوں یا تم سے؟'' ندا نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں......پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سمیر نے لا پروائی سے جواب دیا۔

''ہاں......شاید تم اس لئے نہیں پوچھو گے کہ تمہیں محبت کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں'' ندا نے کہا تو سمیر نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''کیا مطلب......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''محبت میں انسان بہت پوزیسو ہوتا ہے۔ وہ کسی کی پارٹنر شپ برداشت نہیں کرتا......اور میں دیکھتی ہوں میں جب بھی باسط کا نام لیتی ہوں تم کچھ بھی ری ایکٹ نہیں کرتے......اگر باسط تمہاری جگہ ہوتا تو وہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہ کرتا......وہ بہت شکی اور تنگ نظر تھا......وہ میری زبان سے کسی کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا......اس کی انہیں باتوں کی وجہ سے مجھے اس سے نفرت ہوگئی اور ہم دونوں میں علیحدگی ہوگئی'' ندا نے کہا۔

سمیر اس کی بات سن کر خاموش رہا......اور معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''میں......باسط سے محبت نہیں کر پائی......جیسی میں تم سے کرتی ہوں......آئی لو یو ٹو مچ'' وہ اس کے بازو کے ساتھ لپٹتے ہوئے بولی۔

''تھینکس......'' وہ آہستہ آواز میں یوں بولا جیسے اسے اس کی محبت کی ضرورت نہ ہو۔

''سمیر......میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں......اتنی......اتنی......اتنی کہ تمہیں بتا نہیں سکتی'' ندا بہت پر جوش انداز میں بولی۔

''رئیلی......'' وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''ہاں......''

''تم......میری محبت میں کیا کر سکتی ہو؟'' سمیر کے منہ سے نادانستہ نکلا۔

''میں تمہارے لئے اچھے کھانے بنا سکتی ہوں......تمہارے کپڑے پریس کر سکتی ہوں جب تم بیمار ہوگے تمہارا خیال رکھوں گی......اور تمہارے بچے پیدا کروں گی......'' وہ شرما کر بولی۔

''اور......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''اور......اور......کیا، کیا جا سکتا ہے؟'' ندا نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر ہم دونوں کی شادی نہ ہوئی ہوتی......مگر تم مجھ سے بہت محبت کرتیں......اور میں تمہیں باسط سے شادی کرنے کو کہتا تو کیا تم میرے کہنے پر اس سے شادی کر لیتی......؟'' سمیر نے معنی خیز انداز میں بولا۔

ندا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کبھی نہیں...... '' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''کیوں......؟'' سمیر کو ایک دم دھچکا سا لگا۔

''تمہاری محبت کی خاطر میں باسط سے کیوں شادی کرتی ......صرف تمہارے کہنے پر میں اپنی ساری زندگی برباد نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا......میری خاطر بھی نہیں؟'' سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......کیونکہ میرے لئے میری 'زندگی' زیادہ اہم ہے۔ 'محبت' نہیں......زندگی ایک بار ملتی ہے اور محبت پھر بھی مل سکتی ہے......اس لئے میں اپنی زندگی کبھی برباد نہ کرتی'' اس نے کہا تو سمیر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اور......وہ جس نے میری خاطر اپنی زندگی، اپنی خوشیاں، اپنی محبت سب کچھ قربان کر دیا تھا......جو کہتی تھی۔

''محبت صرف ایک بار ہوتی ہے......بار بار نہیں اور وہ محبت میں تم سے کر چکی ہوں......تم مجھ سے میری محبت کا تاوان مانگ رہے ہو......اب میں تمہیں بتاؤں گی......تاوان کیسے دیتے ہیں' اور وہ دس سالوں سے تاوان دے رہی تھی۔ سمیر کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ اس نے آہ بھری۔

''کیا ہوا......؟'' ندا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

''پلیز......میری بات سے ہرٹ مت ہونا......آئی ایم وری پریکٹیکل......اور ہر پریکٹیکل انسان اپنے فائدے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے''

ندا نے کہا۔

''اور جو کسی کی خاطر اپنی زندگی......اپنی خوشیوں......اور اپنی محبت کی قربانی بھی دے دیتے ہیں......وہ کون لوگ ہوتے ہیں؟'' سمیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''بے وقوف'' وہ مسکرا کر بولی۔

سمیر حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

''سمیر......ان فیکٹ......تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی ہے نا......اس لئے تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں......محبت کرنے والے بہت پوزیسو ہوتے ہیں وہ اس میں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتے......اور کوئی کسی کی خاطر اپنی محبت کی قربانی کیوں دے گا......نان سینس......آئیڈیا......'' ندا نے کہا تو سمیر اس انکشاف پر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''سمیر......تم بہت پرفیکٹ انسان ہو......مگر محبت کے معاملے میں بالکل خالی......تمہارے خلا کو میں اپنی محبت سے پر کروں گی......تمہارے دل کو اپنی محبت سے بھر دوں گی......پھر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا......محبت کیا ہوتی ہے......اور انسان اس کے بارے میں کتنا پوزیسو ہوتا ہے'' ندا نے فخریہ انداز میں کہا اور اپنی ایک دوست کو پارک میں کھڑے دیکھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ سمیر کو شدید شاک لگا تھا......اس نے بچ کی

پشت کے ساتھ سر ٹکایا اور ملگجے آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''ندا...... تم بہت بے وقوف ہو...... جو محبت کو نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کا دعویٰ کر رہی ہو...... تمہیں کبھی معلوم ہی نہیں ہو پائے گا کہ میرے دل میں کون رہتا ہے اور تم میرے دل کو محبت سے خالی سمجھتی ہو...... جبکہ وہ تو اس کی محبت کے احساس سے ہی سرشار ہے۔

''تم...... کبھی بھی...... میرے دل کے اس مقام تک نہیں پہنچ پاؤ گی...... جو...... 'حرا' کے لئے مخصوص ہے۔ میں تم سے کبھی بھی ویسی محبت نہیں کر پاؤں گا...... جیسی میں حرا سے کرتا ہوں...... کبھی بھی نہیں......'' اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے گہری سانس لی۔

کاش! میں کبھی یہ سب کچھ حرا کو بتا پاؤں کہ میں اس کے بغیر کتنا ادھورا ہوں...... اس کی محبت کے بغیر کتنا بے قرار......؟ اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ جس پر رفتہ رفتہ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

''یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے......؟

مجھے میری محبت کے سامنے ہی مجرم بنا دیا ہے......

ایسا مجرم...... جس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے رشتے کو اپنے فرض کو...... اپنی محبت پر ترجیح دی۔

''کیا میرا جرم اتنا سنگین تھا کہ تو نے مجھے ندا کی صورت میں سزا دی ہے...... جو اپنی عامیانہ اور معمولی محبت سے لمحہ لمحہ میری روح کو کچوکے لگاتی رہے گی اور مجھے ہر پل...... ہر لمحہ...... حرا یاد آتی رہے گی...... تو نے میرے ساتھ بہت برا کیا...... بہت برا......'' وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکنے لگا اور اس کی آہوں کی بازگشت اور پرشاہی دربار میں سب کو سنائی دینے لگی...... ہر طرف افسردگی سی چھانے لگی۔

☆

1947ء کے مظالم کی کہانی

خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب وجگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پرنم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنھوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیار کیا۔

تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ...... کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیشکش...... نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

اس کتاب کو کتاب گھر کے **تاریخ پاکستان** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

آدھی رات کا وقت تھا......باہر گہری تاریکی چھائی تھی اور ہر طرف گہرا سکوت تھا۔

روشنی بہت دنوں بعد گھر آئی تھی اور آتے ہی اس کی بھتیجی عائشہ اسے ایک آرٹ ایگزبیشن میں لے گئی......اور وہ......آرٹ گیلری میں جا کر گویا اپنا ہوش ہی بھول گئی......آرٹ گیلری میں شہیر حسین کی پینٹنگز کی نمائش لگی تھی اور اس کے سامنے شہیر اپنی بیوی حرا کے ساتھ کھڑا تھا......وہ پہلے سے بھی زیادہ ہینڈسم،سمارٹ اور سوبر لگ رہا تھا......اور اس کی بیوی انتہائی خوبصورت،دراز قد،سمارٹ اور پرکشش ماڈرن لڑکی تھی۔

شہیر......روشنی کو دیکھ کر چونکا اور انتہائی خوشی سے پرجوش انداز میں حرا سے اس کا تعارف کرایا۔

''حرا......یہ میری بہت اچھی کلاس فیلو''روشنی''ہیں......آج کل کسی کالج کی پرنسپل ہیں......اور روشنی یہ میری بہت کیوٹ وائف ڈاکٹر حرا شہیر ہیں''شہیر نے محبت سے حرا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا اور اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''ہیلو......نائس ٹو میٹ یو......''حرا نے روشنی سے ہاتھ ملایا۔

''تھینکس......''روشنی نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''روشنی کب آئی ہو......؟''شہیر نے مسکرا کر پوچھا۔

''آج......صبح......اور یہ میری بھتیجی عائشہ ہے......یہ بھی فائن آرٹ میں ماسٹرز کر رہی ہے۔اسے آرٹ سے بہت محبت ہے اسی لئے مجھے بھی ایگزبیشن دکھانے لے آئی''روشنی نے بتایا۔

''پھوپھو کیا یہ آپ کے کلاس فیلو ہیں......فنٹاسٹک......یو......ہی از ویری فینس پرسنالٹی''عائشہ نے بعد میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

شہیر......حرا کو مہمانوں سے متعارف کرا رہا تھا اور وہ دونوں جس جس طرف جاتے......روشنی حسرت سے ان کی طرف دیکھتی......اس کا دل اندر ہی اندر کرچی کرچی ہونے لگا۔

''دونوں کس قدر خوش ہیں......''اس نے آہ بھر کر سوچا۔

''شہیر......حرا سے کتنی محبت کرتا ہے......اس کی طرف کس قدر محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جب وہ اسے روشنی سے متعارف کرا رہا تھا......بار بار اسے اپنے ساتھ لگا رہا تھا۔تو وہ زیادہ دیر وہاں نہ رک سکی۔اس کے دل میں اتنا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا کہ اگر وہ زیادہ دیر وہاں رکتی تو شاید رونے لگتی۔اس کی آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔

وہ شہیر اور حرا سے اجازت لینے کے لئے مڑی......اور شاید آخری بار اسے جی بھر کر دیکھنے کی طلب اسکے اندر بڑھنے لگی تھی۔

''اب......اجازت چاہتی ہوں''روشنی نے شہیر سے کہا۔

''تھینکس فار کمنگ......ایگزبیشن کیسی لگی......؟''شہیر نے پوچھا۔

''بہت اچھی......''وہ آہستہ آواز میں بولی جبکہ اس نے ایک پینٹنگ بھی بغور نہیں دیکھی تھی۔

''روشنی...... کسی روز گھر آنا......'' شہیر نے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... آپ گھر آیئے...... بلکہ میں تو شہیر کے سب فرینڈز کو انوائیٹ کرنا چاہتی ہوں'' حرا مسکرا کر بولی۔

''شہیر...... تم لکی (خوش قسمت) ہو کہ تمہاری بیوی تمہارے فرینڈز سے جیلس نہیں'' روشنی نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں...... کہ حرا میری بیوی ہے'' شہیر نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا...... اور...... کوئی چیز چھناکے سے روشنی کے اندر ٹوٹی۔

''خدا حافظ......'' روشنی نے جلدی سے حرا سے ہاتھ ملایا اور دونوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلی۔

سارا راستہ وہ مضطرب رہی۔ عائشہ، شہیر کے فن کی تعریفیں کرتی رہی...... اور وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

''پھوپھو...... شہیر حسین کی وائف کتنی کیوٹ ہے...... دونوں میں بہت انڈرسٹینڈنگ ہے...... سب ان کو آئیڈیل کپل سمجھتے ہیں'' عائشہ نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

''کون......؟'' روشنی نے چونک کر پوچھا۔

''مسٹر اینڈ مسز شہیر'' عائشہ نے حیرانگی سے جواب دیا۔

''کون آئیڈیل کپل؟'' روشنی نے پھر بوکھلا کر پوچھا جیسے اس کا ذہن کہیں اور ہو...... اور وہ کچھ اور سن رہی ہو...... عائشہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' عائشہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

روشنی نے اس کو دیکھ کر آہ بھری اور پھر دونوں خاموش ہو گئیں۔

گھر جا کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کی ماں کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور وہ کبھی کبھار اپنے بھائی کے پاس آتی تھی...... جب وہ اپنے شہر میں آتی تو اس کا دل اور مضطرب اور بے قرار ہونے لگتا۔ ماضی پرت پرت اس کے سامنے کھلنے لگتا...... شہیر...... اس سے وابستہ یادیں اس کو بے قرار کرنے لگتیں...... اور آج تو وہ اس کے سامنے تھا...... اس کے دل کو کیسے قرار آ سکتا تھا...... جس کی محبت سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوئی تھی...... اس کی ماں مرتے دم تک اسے شادی کے لئے مجبور کرتی رہی مگر وہ نہ مانی۔ اس کا دل شہیر کی محبت میں اتنا بے چین اور بے قرار رہتا تھا کہ اسے کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اس نے شہیر کی خاطر شادی نہیں کی تھی اور وہ شخص اس کے سامنے کسی اور پر اپنی محبت نچھاور کر رہا تھا...... اس کی باتوں میں حرا کے لئے کتنی محبت تھی...... اور اس کی شدید محبت اسے مضطرب کر رہی تھی...... ''روشنی......'' شہیر کی زندگی میں تم کہیں نہیں ہو...... اور کبھی بھی نہیں تھی......

''پہلے زل تھی...... اور...... اب...... حرا......''

تم نے اس یکطرفہ محبت میں اپنی زندگی برباد کر دی ہے...... تمہیں کیا حاصل ہوا......؟ کیا ملا......؟ کچھ بھی نہیں...... اس شخص کو ایک لمحے کے لئے بھی کبھی احساس نہیں ہوا کہ روشنی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی......؟

روشنی تم کس کرب سے گزر رہی ہو......؟ روشنی......تم نے زندگی کے اتنے سال کس کے انتظار میں گزارے......؟

تم نے اپنے جذبوں کو کس کے لئے مخصوص کر رکھا ہے؟

''شہیر......تمہارے دل میں کبھی میرا خیال نہیں آیا......''

''تمہیں میری آنکھوں سے کبھی میرے دل کی کیفیت کا پتہ نہیں چلا۔ کیا محبت اتنی گونگی......بہری ہوتی ہے کہ دوسرے کے دل کی آواز نہ سن سکے......

شہیر کو میرے دل کی آواز کبھی سنائی نہیں دی......اس کا مضطرب دل اس قدر بے چین ہونے لگا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ یکطرفہ محبت بھی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے......جو گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی آگ سلگائے رکھتی ہے......اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی......شہیر کتنا مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا......میں کس آگ میں جل رہی ہوں......اسے خبر ہی نہیں......

مجھے کیا ملا......؟

کچھ بھی نہیں......دو آنسو اس کی آنکھوں سے گرے۔

کیا حاصل ہوا......؟

شدید احساس زیاں......

آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے اور وہ کمرے کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا......صرف چاند ستارے چمک رہے تھے۔ وہ ٹیرس کے فرش پر بیٹھ گئی اور حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔

وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جنہیں تو محبت سے نوازتا ہے......وہ جس کی تمنا کرتے ہیں......انہیں تو عطا کرتا ہے......جیسے زل......اس نے ارسلان کو چاہا اور اسے پالیا......اس کا کزن اس سے محبت کرتا تھا......اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا......زل بہت خوش قسمت ہے......اور حرا بھی......جس کے پاس میری محبت ہے......جس کے لئے میں مضطرب رہتی ہوں......اور وہ اس کی دسترس میں ہے......مجھے جس شے کی تمنا اور طلب ہے......وہ اس سے حرا کو سیراب کر رہا......

حرا......اسے زل سے بھی زیادہ خوش نصیب دکھائی دینے لگی۔ دنیا کی سب سے خوش قسمت ترین عورت......

جس کے پاس شہیر تھا......

اس کی محبت......اور اس کا سب کچھ......

وہ سسکنے لگی۔

اگر وہ میرا نصیب نہیں تھا......اور تو اس کے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ پیدا نہیں کر سکتا تھا......تو پھر میرے دل میں اس کے لئے اتنی محبت کیوں پیدا کی؟

میں کیا کروں......؟

شہیر کے علاوہ کوئی اور میرے دل میں سماتا ہی نہیں......کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔

کتنی بھی کوشش کروں......میرے دل سے شہیر محو نہیں ہوتا۔

جتنا اسے بھلانے کی کوشش کرتی ہوں......اتنا ہی اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔

میں بہت بے بس ہوں

بہت مضطرب......

بہت بے قرار......

یہ کیسی سزا ہے......؟

اور کس بات کی......؟

کاش مجھے بھی کچھ پتہ چلے......میرا قصور......میرا گناہ......؟

میں کس آگ میں جل رہی ہوں؟

یہ کیسی دوزخ ہے......

جو اندر ہی اندر ہر وقت مجھے سلگائے رکھتی ہے......

کبھی سرد نہیں پڑتی......

کاش......کچھ تو پتہ چلے......،

کچھ تو حاصل ہو......!

لا حاصل کے اس سفر میں......سب کچھ رائگاں گیا......کچھ بھی نظر نہیں آ رہا......سوائے خسارے کے......

محبت......اتنا بڑا خسارہ بھی ہو سکتی ہے......مجھے معلوم نہ تھا......

کاش......! وہ آسمان کی طرف دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کاش......! وہ بڑبڑائی۔

کاش......! وہ سسکنے لگی۔

کاش......! اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اور اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ دیا......اور خاموش ہو گئی۔

اس کی آہیں......سسکیاں......ہچکیاں......اور کرب سے ڈوبی ہوئی سرگوشیاں، شاہی دربار میں سنائی دینے لگیں......سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے اور خاموش ہو گئے۔

☆

طاہر جاوید مغل کے قلم سے جہانی استاد
کی ہنگامہ خیز سرگزشت
پندرھواں حصہ شائع ہو گیا ہے
تاوان
قیمت فی حصہ 60/- روپے
مکمل ایک تا پندرہ حصے دستیاب ہیں

شام گہری ہو رہی تھی اور سردی بھی بہت تھی۔ زل اپنے بیڈروم میں ہیٹر آن کیے بیڈ پر لیٹی تھی اور اپنے چار سالہ بیٹے عاصم اور ایک سالہ بیٹی نجل کو اپنے ساتھ لٹا کر سلانے میں مصروف تھی۔ اس کا شوہر ایک کمپنی میں کمپیوٹرسٹ کی جاب کرتا تھا۔ آج کل آفس میں کام بہت تھا۔ اس لئے وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ زل ایک سکول میں آرٹ ٹیچر کے طور پر جاب کرتی تھی۔

اس کی زندگی ظاہراً بہت پُرسکون اور مطمئن گزر رہی تھی۔

زل کو پانچ سال ہو گئے تھے کینیڈا میں مقیم ہوئے...... اور جنید کے ساتھ رہتے ہوئے...... دونوں میں نہ کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا نہ کبھی کوئی بحث و تکرار...... یا پھر دونوں نے ایک دوسرے سے اس حد تک سمجھوتہ کر لیا تھا کہ کسی کی کوئی بات بری ہی نہ لگتی۔ کینیڈا آنے سے پہلے جنید اور زل میں بہت محبت تھی۔ بہت فرینکنس تھی۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ گھومتے پھرتے انجوائے کرتے جھگڑا کرتے ناراض ہوتے اور پھر ایک دوسرے کو مناتے...... کئی کئی دن ایک دوسرے سے ایکسکیوز کرتے رہتے...... اور پھر ایک دوسرے سے صلح کرنے پر ٹریٹ دیتے...... مگر اب تو ان میں کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا تھا...... زل بہت شدت سے محسوس کرتی تھی کہ اب دونوں کے درمیان ایک فاصلہ آ گیا تھا...... ایک دیوار حائل ہو گئی تھی...... جو نظر نہیں آتی تھی مگر جسے دونوں محسوس کرتے تھے...... نجانے وہ کونسی دیوار تھی جس کو دونوں ہی نہیں گرا رہے تھے مگر جو دونوں کے درمیان اضطراب کا باعث تھی۔

زل جنید سے دوبارہ شادی کے لیے صرف اس لئے مانی تھی جب جنید اس کے گھر والوں کے سامنے بہت رویا تھا کہ وہ اب بھی زل سے بہت محبت کرتا ہے اور اس نے کینیڈین لڑکی سے شادی اتفاقاً کی تھی۔ اپنا کیریئر اسٹیبلش کرنے کے لئے اسے اس کی ضرورت تھی اور اب وہ اسے طلاق دے چکا ہے...... اسکے گھر والوں نے بھی زل کو قائل کیا اور ویسے بھی زل جب سے حرا سے ملی تھی...... وہ اپنے اندر بہت بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہاں رہ کر وہ پھر شہیر کی دسترس میں ہوتی اور شہیر کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا...... ایسے میں اسے جنید کا پرپوزل بہت مناسب محسوس ہوا...... اس نے اسے پہلے والا جنید سمجھ کر شادی کی تھی جو اس سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ اس سے...... شادی کے بھی دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے...... مگر ویسی نہیں...... جیسی پہلے کرتے تھے شاید زل اور جنید کے درمیان 'ارسلان' حائل تھا یا جنید کی کینیڈین بیوی۔ وہ دونوں موجود نہیں تھے مگر ان کے 'ہونے' کا احساس دونوں کو مضطرب رکھتا تھا۔

"کیا...... تم ارسلان سے ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی مجھ سے؟" جنید نے کینیڈا آتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

اور وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"زل...... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں" جنید نے پھر پوچھا۔

"نہ...... پوچھو تو بہتر ہے......" زل نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"کیوں......؟"

"تم سچ نہیں سن پاؤ گے......"

''اور میں سچ ہی سننا چاہتا ہوں''

''تم مضطرب ہو جاؤ گے۔''

''اور نہ جان کر زیادہ مضطرب ہوں گا''

''میں ارسلان سے تم سے زیادہ محبت کرتی تھی...... کیونکہ اس نے مجھے اس وقت سنبھالا جب میں بالکل ٹوٹ چکی تھی اور مجھے تو تم نے توڑا تھا...... ارسلان کو نہ میری دولت سے غرض تھی نہ میرے اسٹیٹس سے...... اسے تو بس مجھ سے غرض تھی...... مجھ سے محبت تھی...... میری ذات...... میرا وجود اور میرا ٹوٹا دل اس کے لئے اہم تھا...... اور تم نے اپنے کیریئر کی خاطر مجھے چھوڑا تھا...... اس نے زندگی کی آخری سانسوں تک میری بہت عزت کی...... اور مجھے بہت محبت دی...... اس کی محبت میں کبھی کمی نہ آئی......'' زمل نے کہا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں...... جنید خاموش ہو گیا جیسے اس کے اندر کوئی چیز بری طرح ٹوٹی ہو۔

اس کے بعد جنید نے کبھی ارسلان کا نام نہ لیا...... مگر اس کے جوش میں کمی آ گئی...... اس کی محبت میں نہ سرشاری رہی نہ جولانی...... ایک ٹھہراؤ سا آ گیا...... جیسے کوئی رشتہ نبھانے کے لئے جتنی محبت کی ضرورت ہوتی ہے...... اتنی ہی کرتا ہے یا اتنی ہی جس سے پیاس بجھائی جا سکے...... اور بس...... زمل بھی جنید کو پا کر بہت مضطرب ہو گئی تھی۔

شاید اس نے جنید کی محبت کھو کر ارسلان کی محبت پائی تھی اور ارسلان کی محبت کھو کر جنید کی محبت پائی تھی۔ اس کھونے اور پانے...... اور پا کر کھونے میں اس کا دل کتنا ٹوٹا تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

دونوں کی زندگیاں بہت مصروف گزر رہی تھیں...... ایک مشین کی مانند دونوں کام کرتے تھے اور جب بھی زمل کو چند لمحے میسر آتے تو ارسلان اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ ارسلان کو کبھی نہیں بھول پائی تھی وہ آج بھی اس کے اندر زندہ تھا اس کے دل میں صرف ارسلان تھا...... جنید نہیں...... اسے کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی...... اس کے دل میں محبت کی جوت جنید نے جلائی تھی مگر ارسلان نے اسے روشن رکھا تھا...... نجانے وہ کہاں سے آ گیا...... اور ان دونوں کے درمیان شہیر...... جو...... شاید ان دونوں سے بھی زیادہ اس سے محبت کرتا تھا کہ اپنی جان کے درپے ہو گیا تھا...... مگر وہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پایا تھا...... اظہار بھی تب کیا...... جب بہت دیر ہو چکی تھی...... نجانے شہیر کے ساتھ قسمت کیا کھیل کھیلتی رہی...... جب وہ اس کو پا سکتا تھا...... تو ''ارسلان'' دونوں کے درمیان آ گیا اور پھر...... ''حرا''...... قدرت نے ہر بار اسے مات دی۔

وہ شہیر سے نفرت کبھی بھی نہیں کر پائی تھی...... وہ اسے اچھا لگتا تھا...... شاید ارسلان سے بھی زیادہ...... مگر وہ اس کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا پایا...... نجانے اس کے پیچھے کیا راز تھا...... جس کو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی...... اس کے لئے کس کی محبت شدید تھی......؟ وہ اکثر اپنے آپ سے سوال کرتی۔

ارسلان کی...... جنید کی...... یا پھر شہیر کی وہ سوچتی۔ شہیر کی محبت سب سے شدید تر تھی...... مگر اتنی شدید محبت کے باوجود بھی وہ مجھے حاصل نہ کر سکا...... کتنی عجیب بات تھی...... اس میں کیا راز تھا جس کو وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

اس کے ذہن میں ان گنت سوالات ابھر رہے تھے اور وہ ان کو سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

مجھے ہر محبت کے ساتھ ایسی کسک ملی ہے...... جس نے ہمیشہ میرے اندر کو مضطرب رکھا ہے ارسلان سے شادی کے بعد ہر وقت جنید کی بے وفائی اور شہیر کی جنونی محبت نے مجھے چین نہیں لینے دیا اور اب جنید سے شادی کے بعد ارسلان کی بے لوث محبت مجھے کسی دم نہیں بھولتی۔

محبت کیا کھیل کھیلتی ہے...... ؟ بہت عجیب...... نہ سمجھ آنے والا...... مگر بہت تکلیف دہ...... جو اندر ہی اندر بہت بے چین اور بے قرار رکھتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے...... ؟

''کسی کو پا کر بھی 'قرار' نہیں ملتا اور نہ پا کر بھی 'سکون' نہیں ملتا'' اس نے دکھ سے سوچا۔

''کاش...... تو ارسلان کو مجھ سے نہ چھینتا...... تو آج میں کتنی خوش اور مطمئن ہوتی...... میرا اندر مضطرب نہ ہوتا......''

میں کیا کروں...... ؟ اس اضطراب کو کیسے ختم کروں...... شاید یہ اضطراب اب زندگی بھر ختم نہیں ہوگا...... کیونکہ میں ارسلان کو زندگی کی آخری سانسوں تک نہیں بھول پاؤں گی...... وہ سسکنے لگی۔

بڑی سرکار کے دربار میں اسکی آہوں اور سسکیوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ حاضرین محفل خاموش تھے اور افسردہ بھی۔

بڑی سرکار نے سچ فرمایا تھا۔ محبت...... تحفہ نہیں آزمائش ہوگی۔ محبت اضطراب سے جنم لے گی اس لئے کسی کو قرار نہیں ملے گا...... ایک کو پا کر اور دوسرے کو کھو کر سب ہمیشہ مضطرب ہی رہیں گے۔

انسان کس قدر اذیت میں ہے اسے کوئی شے بھی مکمل نہیں ملی۔

100 نامور خواتین

روبی پبلی کیشنز، لاہور کی خوبصورت پیش کش...... اماں حوا سے بے نظیر بھٹو تک، دُنیا کی 100 نامور خواتین کے حالات زندگی۔ مصنف سلیم شہاب کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ...... کتاب میں شامل ان خواتین کو درج ذیل سیکشن میں تقسیم کیا گیا ہے......

خانوادۂ رسول ﷺ | قرون اولیٰ | عظیم مائیں | عظیم بیویاں | فن و ادب
فلاح عامہ و خاصہ | قیادت و سیادت | کھیل | رنگ و آہنگ | بدنصیب خواتین

ملنے کا پتہ: روبی پبلی کیشنز، 13۔الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور 042-37243301

(۲)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دنیائے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی...... چاند کی غیر موجودگی نے رات کی تاریکی میں مزید اضافہ کر کے اسے ہولناک بنا دیا تھا۔

تمام نوری مخلوق خاموش تھی...... بڑی سرکار کے دربار سے ابھی کوئی نیا حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ کسی کے دل سے انتہائی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں اور پھر چیخیں...... آہوں و سسکیوں میں بدل گئیں۔ حاضرین محفل چونک گئے اور نیچے اس جانب دیکھنے لگے جہاں سے چیخیں...... آہیں اور سسکیاں بلند ہوئی تھیں...... آج پھر کوئی انسان اپنا حال دل بڑی سرکار کو رو رو کر سنانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر رمیض ساری رات کام کر کر کے تھک گیا تھا اور چند ساعتوں کے لئے اس نے جیسے ہی کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکایا تھا اور چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کی تھیں تو اس کی یادداشت میں محفوظ بہت سی بند کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے تھے۔ بہت سی باتیں...... بہت سی یادیں...... بہت سے چہرے...... اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے...... ان میں سے ایک چہرہ ڈاکٹر دریہ اور دوسرا ڈاکٹر دانش کا تھا...... دریہ کو یاد کر کے اس کا دل بری طرح بے تاب ہونے لگا...... چیخیں مارنے لگا وہ اس کے اندر ایک ایسی یاد بن کر زندہ تھی جو اسے ہر پل...... ہر لمحہ رلاتی تھی جو اسے ملی بھی...... اور...... چھن بھی گئی...... وہ اس کی دنیا سے کیا گئی...... اس کے وجود کو خالی کر گئی...... اور ابھی تک اس کا دل ان جذبوں سے خالی تھا...... جو وہ صرف...... اور صرف دریہ کے لئے محسوس کرتا تھا گو کہ انہیں جدا ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے مگر وہ واقعہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج ہی رونما ہوا ہو...... وہ کتنے کرائسس میں سے گزرا تھا...... نروس بریک ڈاؤن ہونے کے بعد ڈاکٹر محسن زیدی نے اسے جس طرح سنبھالا اور اس کا علاج کیا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ وہ زندگی سے اس قدر مایوس اور بددل ہو گیا تھا کہ ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہونے کے بعد اس نے ایک بار خودکشی کی بھی کوشش کی تھی...... دریہ سے جدائی کو اس نے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کیا تھا مگر دریہ کے ساتھ زندگی کی امید...... اور انتھک جدوجہد کا حاصل اس شخص نے چھینا تھا جس پر اس نے بہت اعتبار کیا تھا جس کو انسانیت کے ناتے اپنے سینے سے لگایا تھا جس کے درد کو اپنے دل میں محسوس کیا تھا اور جس کی بیمار مردہ زندگی میں روح پھونکنے کی کوشش کی تھی جس کو اپنے ایثار اور خلوص سے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی...... اور وہی شخص اس سے اس کی زندگی...... اور...... اس کی خوشیاں چھین کر لے گیا تھا۔ اسے کس قدر آسانی سے دھوکہ دے گیا تھا اور اس نے کتنی آسانی سے اس پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔ اس کی عقل کیسے دھوکہ کھا گئی...... اس کے فہم اور شعور پر اس شخص کی مکاری، عیاری اور چالاکی...... حاوی ہو گئی...... اس نے لمحوں میں اس کے ذہن کے اندر شکوک وشبہات کے تناور درختوں کا بیج بو دیا...... اسے سچ...... جھوٹ...... اور جھوٹ...... سچ لگنے لگا...... اس سے قبل اسے کبھی ایسا تلخ تجربہ نہیں ہوا تھا کہ کوئی انسان کسی انسان کو یوں صریحاً دھوکہ بھی دے سکتا ہے...... وہ تو انسانیت پر یقین کرنے والا...... انسانیت کی خدمت کرنے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

والا اور انسانیت کا دکھ درد بانٹنے کا جذبہ اپنے اندر لے کر جوان ہوا تھا۔ اس سے قبل اسے کسی انسان نے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں سنا ضرور تھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا مگر اسے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا اور وہی انسان اسے دھوکہ دے گا جس پر اس نے بہت سے احسانات کیے تھے۔ کوئی انسان اس قدر احسان فراموش، ناشکرا اور دھوکے باز بھی ہو سکتا ہے...... اس نے اس سے اس کی دریہ چھینی...... اس کے گھر کی خوشیاں چھینیں...... اور اس کے بہت سالوں کی جدوجہد بھی لوٹ کر لے گیا...... اس کا انسانیت سے اعتبار اٹھ گیا تھا...... وہ اپنا ملک اور اپنے لوگ چھوڑ کر امریکہ چلا آیا تھا۔ چند ماہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود دل یونہی بے تاب رہا تو کینیڈا چلا گیا...... کینیڈا سے آسٹریلیا اور پھر انگلینڈ...... دو سال یونہی دربدر کی خاک چھانتے گزر گئی...... اس کے اندر کا ڈپریشن اور مایوسی بڑھتی گئی...... نہ کسی سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا اور نہ ہی کسی کام میں دل لگتا تھا۔ ہر شے سے بے زاری...... اور اکتاہٹ محسوس ہوتی۔ زندہ رہنے کے لئے کبھی کسی پٹرول پمپ پر جاب کر لیتا...... کبھی کسی اسٹور میں...... اور کبھی کسی ہوٹل میں ویٹر کی جاب کرتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنا پروفیشن بھول گیا ہو یا پھر وہ خود ہی اسے بھلانا چاہتا ہو...... وہ اپنے حافظے میں موجود ہر اس بات کو کرید کرید کر ختم کرنا چاہتا تھا جو اسے ماضی سے وابستہ کچھ یادولاتی...... ایک اسٹور پر کام کرتے ہوئے اسے جینٹ مل گئی...... خوبصورت، سمارٹ سی لڑکی...... جو اسے ہر وقت گہری سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر پریشان ہو جاتی...... جو ہر وقت گم صم...... کھویا کھویا سا رہتا جو کسی اور کو دیکھتا مگر...... اور اس کی نظریں کہیں اور کو دیکھتیں...... جو کسی سے کوئی بات کرنے کا خواہاں نہیں تھا...... جسے ہر وقت خاموشی اچھی لگتی تھی...... انہی دنوں شدید سردی سے وہ بہت بیمار پڑ گیا...... اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جینٹ اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے آئی اور اس کی بہت دیکھ بھال کرنے لگی...... وہ اس کی اتنی خدمت اور تواضع پر بھی خاموش رہتا...... نہ کبھی کوئی شکوہ کرتا اور نہ ہی شکریہ ادا کرتا...... جینٹ بہت حساس اور نازک دل لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل پریشان ہو جاتا......

''رمیض...... میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں'' جینٹ نے ایک روز اس کی برستی آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔

شادی کے نام پر اس نے چونک کر جینٹ کو دیکھا...... اور خاموش ہو گیا۔

''بولو...... جواب دو...... کیا تم بھی......؟'' جینٹ نے اشتیاق سے پوچھا۔

اس نے انتہائی خاموش آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ بری طرح سسکنے لگا۔

''پلیز...... کبھی کچھ بولو...... کبھی تو کچھ بتاؤ...... تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' جینٹ اس کے پاس بیٹھ کر پر اصرار لہجے میں کہتی اور وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا اور منہ پھیر لیتا...... بہت مشکل سے جینٹ نے اسے شادی کے لئے منایا تھا مگر شادی کے بعد بھی اس کی سرد مہری میں کمی نہ آئی تھی۔ جینٹ تنگ آ کر اسے ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئی...... مختلف قسم کی تھراپیز اور علاج کرانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔ جینٹ اسے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی۔ وہ اسے زندگی کی جانب واپس لانے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ جان کر بے حد خوش ہوتی تھی کہ وہ ایک قابل نیورو سرجن تھا۔ رمیض نے اسے کبھی اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اسے ایک معمولی اسٹور کیپر یا ویٹر ہی سمجھتی رہی تھی۔ اس نے بہت جدوجہد کر کے اس کو ایک نیورو سرجن کا اسسٹنٹ لگوایا تھا۔ آسٹریلوی ڈاکٹر ہاپکنز ایک عمر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رسیدہ تجربہ کار اور حلیم الطبع انسان تھا۔اس نے برین کے بارے میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ڈاکٹر رمیض سے اس کو بہت محبت ہو گئی تھی اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت مریضوں اور ریسرچ میں گزارتا۔ڈاکٹر رمیض کو قدرت نے ایک سنہرا موقع دیا تھا۔وہ جو سب کچھ لٹا کر دیارِ غیر میں آیا تھا تو اسے بہت چاہنے والی بیوی اور اپنے پروفیشن سے متعلقہ اچھے لوگوں سے بھی ملوا دیا تھا۔ڈاکٹر ہاپکنز کی توجہ اور محبت سے اسے دوبارہ اپنے کام اور ریسرچ میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔وہ زیادہ تر وقت اپنی ریسرچ میں مصروف رہتا...... اس کی آدھی کی گئی ریسرچ کو ڈاکٹر دانش نے مکمل کیا تھا مگر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ان کی تیار کردہ ویکسین مخصوص وقت تک کام کرتی اور اس کے بعد مریض پھر پہلے والی حالت میں آ جاتا...... جس ریسرچ نے ان کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔دو ماہ میں ہی وہ دھڑام سے نیچے آ گرے تھے۔ہر طرف ویکسین کی ناکامی کا چرچا ہونے لگا۔ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر ہاپکنز کی مدد سے دوبارہ اس ریسرچ پر کام شروع کیا تھا اور دونوں بہت محنت سے اس پر کام کر رہے تھے۔ابھی ان کی ریسرچ کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا مگر وہ بہت پر امید تھے کہ وہ ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے کیونکہ ان کا مقصد انسانیت کی فلاح اور اس کی خدمت تھا۔

جینٹ نے رمیض سے بہت محبت کی تھی اور اس کی بہت خدمت بھی کرتی تھی۔اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی مگر جیسے ہی وہ نارمل ہوا۔وہ اپنے پروفیشن اور ریسرچ میں مصروف ہو گیا۔دن رات وہ ڈاکٹر ہاپکنز کی لیب میں مصروف رہتا۔جینٹ اس کے معمول سے تنگ آ گئی تھی اور اس کی دلچسپی اپنے ایک کولیگ چارلی میں پیدا ہونے لگی تھی۔رمیض نے دونوں کو کئی بار اکٹھے بھی دیکھا تھا مگر اس نے جینٹ سے کبھی کچھ نہ پوچھا۔ان کو دیکھ کر نادانستہ اس کے ذہن میں ڈاکٹر دانش کے الفاظ گونجنے لگے۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے...... اس پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے...... تمہاری بیوی بھی تم سے بے وفائی کر رہی ہے...... وہ محبت تم سے کرتی ہے مگر اس کے دل میں کوئی اور ہے'' دریہ بھی ایسی ہی تھی...... مگر ڈاکٹر رمیض نے دریہ کو کبھی کسی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا ڈاکٹر دانش نے نجانے کہاں سے ثبوت اس کے خلاف اکٹھے کر لئے تھے اور اس نے یقین بھی کر لیا تھا مگر جینٹ اب سر عام چارلی کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی اور وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا پھر جینٹ نے ایک روز دریہ کے انداز میں ہی اس سے طلاق مانگی تھی۔وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔اس لمحے...... اسے دریہ اور جینٹ ایک جیسی دکھائی دیں...... اور اس نے جینٹ کو بھی طلاق دے دی...... مگر جینٹ کے جانے سے اسے اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا کہ دریہ کے جانے سے ہوا تھا۔اس کی زندگی شدید تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔وہ ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتا...... عورت ذات کو اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ایک ناقابل اعتبار مخلوق...... جس پر اب وہ کبھی اعتبار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس کے اندر بہت ہی عجیب سی تبدیلیاں رونما ہوئیں تھیں۔تنہائی،وہم،وسوسوں کے علاوہ شکوک وشبہات...... تنگ نظری اور چڑچڑا پن آ گیا تھا۔وہ اپنے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔روز بروز ایک complexed پرسنالٹی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا...... ماضی میں وہ ہرگز ایسا نہیں تھا مگر ڈاکٹر دانش نے اس کے اندر کوئی ایسا بیج بو دیا تھا جس نے اس کی مثبت سوچ اور باتوں کو منفی بنا دیا تھا۔وہ اکثر اپنے اندر جنم لینے والی ان باتوں کو ناپسند کرتا...... ان سے نفرت کرتا...... مگر پھر بھی ان سے چھٹکارا پانا اس کے لئے بہت مشکل ہو گیا تھا۔وہ دریہ سے یکدم بہت محبت بھی محسوس کرنے لگتا اور پھر شدید نفرت سے اس کا اندر جلنے لگتا...... جینٹ

اسے اچھی بھی لگتی اور وہ اگلے ہی لمحے اس سے بیزار بھی ہونے لگتا۔ ڈاکٹر ہا پکنز مہربان بھی لگتے اور اگلے ہی لمحے وہ ان کے بارے میں مشکوک ہونے لگتا۔ اس کے اندر نجانے کیسی تبدیلیاں آ گئیں تھیں جنھوں نے اس کی اصل شخصیت کو مسخ کرنا شروع کر دیا تھا...... وہ محبت کرنے والا انسان اب کسی سے محبت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانوں کی محبت کے بارے میں انتہائی مشکوک ہو گیا تھا اور جب اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگتی۔ اسے محبت کی طلب محسوس ہونے لگتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس پاتا، سارا وقت اپنی ریسرچ میں مصروف رہتا...... ڈاکٹر ہا پکنز سے ڈسکشن کے علاوہ وہ کسی سے زیادہ بات چیت نہ کرتا...... وہ اپنے آپ کو فنا کر کے...... اپنی ذات کو مٹا کر اپنے کام میں مصروف رہتا...... جب کبھی بہت تھک جاتا تو رات کی تنہائیوں میں اسے ماضی کی تلخ یادیں ذہنی اذیت سے دوچار کرتیں۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے، اس کا ذہن اس کی سوچوں کے برعکس کام کرنے لگا تھا سوائے اپنی ریسرچ کے۔ اس کے سارے کاموں سے توازن اور ہم آہنگی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا...... اس کے اندر کی آہیں اور سسکیاں اس کے ڈپریشن کو ظاہر کرتیں۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور دل آہوں و سسکیوں سے بے قرار ہو کر صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

''یا خدایا! میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے...... کہ تو پہلے تو مجھے عطا کرتا رہا...... نوازتا رہا اور پھر چھینتا رہا...... تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا...... میری محبت...... بیوی، گھر...... خوشیاں...... سب کچھ...... سب کچھ...... صرف اس لئے کہ میں نے ایک ایسے انسان پر اعتبار کیا...... جو شاید اعتبار کے قابل ہی نہیں تھا...... میری عقل اور سمجھ بوجھ پر کیا پردہ پڑ گیا کہ میں اس سے دھوکہ کھا گیا...... اور اس کی باتوں پر یقین کر لیا...... اس نے مجھ سے یقین اور اعتماد کی دنیا چھین کر ایسا آلودہ کر دیا ہے کہ اب میرا کسی پر بھی اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا...... ہر انسان بے اعتبار اور بے ایمان لگتا ہے...... تو نے مجھے اس کے شر سے کیوں نہیں بچایا...... مجھے اس کی صورت میں کیسی سزا دے ڈالی ہے کہ میں بھی اپنے آپ کو بہت بے اعتبار سمجھنے لگا ہوں...... میں کیا کروں......؟

میں دریہ کے بارے میں ایسا بدگمان ہو گیا کہ اس کی محبت چاہت خلوص اور رفاقت...... کو لمحوں میں بھلا دیا۔ ایسا کنفیوژ ہو گیا کہ جینٹ کی اتنی خدمت کو بالکل نظر انداز کر کے اسے یوں اپنی زندگی سے نکالا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے......؟ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میں وہ کیوں ہو گیا ہوں...... جو...... میں نہیں تھا...... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا...... کیوں......؟ کیا......؟ میرے لئے اتنی بڑی سزا کیوں تجویز کی...... کہ...... میں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہوں...... کاش...... تم میرے دکھ کو سمجھ سکو...... کاش......! سسکیاں اس کے دل کے اندر سے ابھریں اور آہوں میں بدل گئیں وہ بری طرح رونے اور سسکنے لگا تھا...... ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

☆

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی اور ماحول میں اک عجب سی ویرانی چھائی تھی۔ دریہ اپنے بیڈروم میں اپنے ایک سالہ بچے کو کندھے کے ساتھ لگائے اسے سہلا رہی تھی۔ وہ نیند سے بیدار ہو کر رونے لگا تھا اور دریہ اسے دوبارہ سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کافی تگ و دو کے بعد وہ دوبارہ سو گیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ چمٹائے بیڈ پر لیٹ گئی۔ محبت سے اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی رہی اور اس کی

چھوٹی چھوٹی گرم سانسیں اور منہ سے بہتی رال اس کی گردن کو گیلا کرنے لگی۔ دونوں کے دلوں کی دھڑکن ہم آواز ہو کر ایک دوسرے میں جذب ہو رہیں تھی۔ دریہ کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی اور اس نے بیڈروم کی کھڑکی سے باہر تاریک آسمان کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ''یا اللہ! کیا آپ بھی انسانوں سے ویسی محبت کرتے ہیں...... جیسی ایک ماں اپنی اولاد سے کرتی ہے...... مگر اولاد کا دکھ...... ماں تو برداشت نہیں کر سکتی...... پھر آپ ہمیں روتے، سسکتے اور تڑپتے دیکھ کر کیوں کچھ نہیں کرتے...... ہم انسان اذیتوں پر اذیتیں سہتے ہیں...... تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اک عجیب سی بے قراری، بے چینی اور ویرانی ہماری روحوں میں بس گئی ہے۔ نہ دکھائی دینے والا کرب ہر وقت ہمیں اندر ہی اندر کچوکے لگاتا رہتا ہے...... مگر ہم کچھ نہیں کر پاتے۔ ہم کس سے فریاد کریں...... جب تو ہی ہماری کوئی فریاد نہیں سنتا...... اور نہ ہی کوئی التجا تو ہم کہاں جائیں اور کس سے فریاد کریں......؟ کب اس اذیت اور کرب سے ہمیں نجات ملے گی...... جو آپ نے شاید ہماری قسمتوں میں لکھ کر انہیں ہماری 'تقدیر' بنا کر انہیں ہمارے گلے میں لٹکا دیا ہے...... جس سے کسی بھی طرح فرار ممکن نہیں...... یا...... پھر ہمارے اعمال...... ہماری قسمتیں بن کر ہمیں اپنے شکنجے سے نہیں نکلنے دیتے۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی......؟ میری قسمت نے مجھے وہ وہ دن دکھائے ہیں کہ مجھے خود پر بھی یقین نہیں آتا کہ میں اتنی بدل گئی ہوں۔ میں ڈاکٹر رمیض کے ان لفظوں کو برداشت نہ کر سکی اور میری قسمت نے مجھے ان لفظوں کا ایسا اسیر کر دیا کہ میں ان کے حصار سے آج تک نہیں نکل سکی...... اس وقت مجھے اپنے آپ کو 'بے اعتبار' کہلوانا کس قدر گراں گزرا...... اور وہ رشتہ ہی توڑ دیا جس میں بے اعتباری پیدا ہونے لگی تھی اور قدرت نے مجھے ایسے شخص سے ملا دیا...... جو حقیقت میں بے اعتبار ہے جو ہر لمحہ ہر آن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے...... جس کے نجانے کتنے روپ ہیں...... جس کی ہر شخصیت دوسری سے مختلف ہے...... جس کا ہر دن...... پہلے دنوں سے زیادہ کریہہ ہے۔ جس کی ہر حالت پہلے سے زیادہ مکروہ ہے...... جس کی سازشیں...... مکاریاں اور چالاکیاں مجھے ہر دم حیران کرتی ہیں...... جو انسان کم...... حیوان اور شیطان زیادہ ہے اور میں اس بے اعتبار شخص کے ساتھ بے اعتبار زندگی گزارنے پر مجبور ہوں کیونکہ اب میری زندگی میں امید باقی نہیں رہی...... مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رمیض بہت اچھا انسان تھا...... نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا...... اور میری عقل...... فہم و فراست نجانے کہاں گم ہو گئی تھی کہ میں نے ایک مکار شخص کی باتوں پر یقین کر لیا...... اس کی عیاری پر اعتبار کر لیا...... اور اتنی بہک گئی کہ آج تک پچھتاوے میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میرے اندر ہر وقت ایک ایسی آگ لگی رہتی ہے جو کسی وقت بھی سرد نہیں پڑتی...... مجھے ڈاکٹر رمیض بہت یاد آتا ہے...... ہم اچھی اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے کتنی محبت اور چاہت تھی...... ہم دونوں میں پھر نجانے کیا ہو گیا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں ایسے مشکوک ہو گئے کہ ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد ہی ختم ہو گیا...... مگر ہم جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہو سکے...... رمیض آج بھی میرے اندر زندہ ہے...... جب میں شیر افگن کی مکاریوں کو دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے...... جس شخص میں کوئی خامی نہ تھی...... وہ مجھے سب سے بُرا لگنے لگا اور جس شخص میں بے شمار کمزوریاں اور خامیاں ہیں...... میں اس کے ساتھ کتنی خاموشی سے زندگی گزار رہی ہوں۔ کوئی احتجاج بھی نہیں کرتی...... وہ جو کچھ کہتا ہے...... خاموشی سے سنتی رہتی ہوں...... جو کچھ کرتا ہے اسے کرنے دیتی ہوں...... میں کیوں ایسی ہو گئی ہوں...... شاید انسانوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے...... یا پھر قسمت سے...... یا...... پھر اپنے آپ سے؟

یا خدایا......! شاید مجھے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا کسی پر بھی نہیں...... اگر آپ مجھ سے ماں جیسی محبت کرتے تو رمیض مجھ سے کبھی جدا نہ ہوتا اور شیر افگن جیسا بدتر انسان میری زندگی میں نہ آیا ہوتا...... آپ مجھے بچا سکتے تھے مگر آپ نے مجھے نہیں بچایا...... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا...... رمیض میرا گھر...... خوشیاں...... اور سکون...... میں اب زندہ ہوں تو صرف اپنے بیٹے کے لئے...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے محبت سے اپنے بیٹے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے چومنے لگی۔

''کاش......! ایسی محبت آپ بھی مجھ سے کرتے...... تو میں آج اس جہنم میں نہ ہوتی'' اس نے آہ بھری اور پھر سسکنے لگی۔

اس کی زندگی آناً فاناً ایک فلم کے مختلف مناظر کی مانند تبدیل ہوتی گئی۔ اس نے ہر قدم جلد بازی میں اٹھایا وہ اپنی زندگی کے فیصلے عقل و شعور سے نہیں بلکہ دل اور جذبات کی رو میں بہہ کر کرتی گئی۔ اس نے ڈاکٹر رمیض سے شادی کا فیصلہ بھی بہت جلدی میں کیا...... اور طلاق لینے کا فیصلہ اس سے بھی زیادہ جلدی میں...... شیر افگن سے شادی کس طرح اچانک ہوئی...... اسے خود بھی سمجھ نہ آیا...... ڈاکٹر رمیض سے طلاق لینے کے بعد وہ بہت اپ سیٹ رہتی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے پر آتی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر لانگ ڈرائیو پر نکل کھڑی ہوتی...... ایک روز یونہی لانگ ڈرائیو پر جا رہی تھی۔ اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں...... اور کس طرف جا رہی ہے۔ اچانک اس کی گاڑی سفید مرسڈیز کار سے بری طرح ٹکرائی۔ شیر افگن کو کافی چوٹیں آئیں۔ وہ بوکھلا گئی اور انتہائی پریشانی میں اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر ہاسپٹل لے آئی۔ کچھ روز کی تیمارداری اور توجہ سے وہ ٹھیک ہو گیا۔ ان دنوں وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے صرف شیر افگن کی فکر لاحق رہتی تھی اور شیر افگن اس سے بہت متاثر نظر آنے لگا۔ اسے ترقی کرنے والی...... کامیاب عورتیں ہمیشہ سے پسند تھیں ان سے اس کے بہت سے مفادات وابستہ رہتے تھے۔ اسے ہمیشہ سے گھریلو...... عام سی لڑکیاں ناپسند تھیں...... انہیں خوامخواہ میں گھر رکھنا...... ان کی پرورش کرنے کے مترادف سمجھتا تھا۔ فریحہ اس کو بہت پسند تھی اور وہ بھی اس کی کامیابیوں کی وجہ سے...... اور اس نے بہت مشکل سے اسے شیشے میں اتارا تھا۔ اسے کیسے کیسے قائل کیا تھا۔ کس طرح چالاکی سے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا کتنی محنت سے اپنی ذات کو اس کی سوچوں کا محور بنایا تھا مگر دریہ سے ملنے کے بعد وہ فریحہ سے متنفر ہونے لگا۔ فریحہ...... اس کا ابنارمل بچہ...... اس کا شوہر...... اور پھر اس کے بارے میں موصول ہونے والی مختلف کالز نے اسے فریحہ سے دور کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دریہ ایک آسان شکار نظر آئی...... اس نے چند دنوں میں ہی دریہ کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ رمیض کو بھول گئی اور دونوں نے اچانک ہی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے گھر والے بھی اس کے فیصلے پر حیران تھے مگر وہ مطمئن تھی۔ شیر افگن کا معاشرے میں مقام تھا۔ عزت تھی، دولت تھی، وہ خوبصورت اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ گفتگو میں اس سے کوئی آگے نہیں جا سکتا تھا...... دریہ ہار گئی اور وہ جیت گیا...... اس نے دریہ کے دل کو ایسا قابو میں کیا کہ پھر فرار ممکن نہ رہی۔ شادی کے بعد شیر افگن ہر روز نیا رنگ اور روپ بدلنے لگا۔ دریہ پر اس کی حقیقتیں کھلنے لگیں...... وہ عورتوں کا رسیا تھا...... فون پر ہر وقت لڑکیوں سے باتیں کرتا رہتا...... دریہ ناراض ہوتی تو وہ مسکرا کر دل لگی کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ محبت اس کے لئے قابل قدر جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا رنگ برنگی تتلیوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا کھیل تھا جو اسے ہر دم مسرور اور توانا رکھتا...... وہ اس سے ناراض ہوتی، جھگڑتی...... اور وہ مسکرا کر باہر چلا جاتا...... وہ ایسا بے اعتبار شخص تھا جس کے نزدیک نہ کوئی رشتہ قابل اعتبار تھا اور نہ ہی کوئی جذبہ...... دریہ اس کو چھوڑ نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی......

جو پیدا ہوتے ہی چل بسا...... اور اب ولید اس کی گود میں تھا...... شیر افگن اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس نے ایک اور خفیہ شادی کر رکھی تھی جس کا وہ اعتراف نہیں کرتا تھا۔ وہ دریہ کے پاس کبھی کبھار آتا، اس کا آنا اور نہ آنا اس کے لئے برابر تھا...... دریہ اب اس نام نہاد رشتے کو بھی توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا کیس کورٹ میں دائر تھا۔ وہ جلد از جلد شیر افگن سے نجات پانا چاہ رہی تھی اور وہ اس کے لئے نت نئے مسائل کھڑے کر رہا تھا۔ کبھی اسے قتل کی دھمکیاں دیتا...... کبھی اس سے ولید کو چھیننے کی اور کبھی اس کی جائیداد چھیننے کی...... مگر وہ خاموش رہتی...... خاموشی سے سب کچھ سنتی...... وہ آتا...... چیختا چلاتا اور چلا جاتا۔ ایک روز وہ چپکے سے اپنے بچے کو لے کر دوسرے شہر چلی گئی۔ شیر افگن اسے طلاق دے یا نہ دے...... اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا ولید اس کے پاس تھا...... مگر ان چند سالوں میں اس نے جتنی ذہنی اذیتیں اٹھائی تھیں اس کی سکت سے بہت زیادہ تھیں۔ اس کی گزشتہ زندگی کے لمحات انتہائی اذیت میں گزرے تھے۔ ڈاکٹر رمیض سے طلاق کے بعد اس نے زندگی اک عذاب میں گزاری تھی اور اب مزید گزار رہی تھی۔ وہ بے حد پریشان رہتی...... اٹھتے، بیٹھتے...... ہر لحہ ہر آن...... اس کا دل ان باتوں اور فیصلوں پر کٹتا رہتا...... جو اس نے جلد بازی میں کیے تھے...... اس کے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں تھا...... سب سے بڑا پچھتاوا ڈاکٹر دانش کی باتوں پر یقین کرنے کا تھا کاش! وہ اس شخص کی باتوں پر اعتبار نہ کرتی...... اس کے فریب میں نہ آتی...... تو آج وہ ڈاکٹر رمیض کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہوتی۔

کاش...... ایسے انسان دنیا میں نہ ہوں تو دنیا کس قدر پرسکون ہو......!

کاش، ہم جیسے لوگ کبھی بھی شاطر اور مکار لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنی زندگیوں کو پچھتاووں کی نذر نہ کریں...... کاش......! ایسے لوگ دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھولنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے سوچ لیں کہ وہ کس کس طرح انہیں تباہ و برباد کر رہے ہیں...... کاش! وہ ہم جیسے لوگوں کی اذیتوں کا کچھ تو ادراک کر سکیں۔ کاش......! وہ پھر سسکنے لگی...... اور اس کی سسکیاں شکوے آہیں اس کے دل کو چیر کر اور کہیں سنائی دینے لگیں...... سب افسردہ ہو گئے اور آہ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆

رات ختم ہونے کو تھی اس کی تاریکی میں سحر کی روشنی کی آمیزش ہو رہی تھی۔ زینب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکی تھی۔ اس کا بیمار و نحیف جسم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ اسے گھسیٹ گھسیٹ کر بھی چل سکتی۔ اسی لئے وہ سارا وقت چارپائی پر لیٹی رہتی اپنی بے نور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتی...... جیسے کوئی روشنی کی کرن...... کسی امید کی صورت میں اس کے ویران دل کو منور کر دے...... وہ ہر وقت مضطرب رہتی...... قدرت بھی اسے بار بار آزما رہی تھی...... اور ان آزمائشوں نے اس کے وجود اور اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا...... نہ کسی اور بات کا...... سوائے اپنے ڈاکٹر بیٹے کی رکھوالی کے جب سے اس کے دماغ پر چوٹ لگی تھی وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ مکمل پاگل ہو چکا تھا...... اور اس کے صحت یاب ہونے کے چانسز بھی ختم ہو چکے تھے۔ فریحہ نے غصے میں اسے جو کرسی کھینچ کر ماری تھی اس کی ضرب اتنی کاری تھی کہ اس کا دماغ مکمل طور پر damage ہو گیا اس کی یادداشت ختم ہو گئی...... اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ اس کی تمام صلاحیتیں...... ذہانت...... فہم و ادراک...... عقل و شعور سب کچھ کہیں گم ہو گیا...... ڈاکٹروں نے اسے پاگل خانے میں بھجوا دیا...... مگر نذیر حسین سے اخبار میں اس کے ذہنی توازن کے بگڑنے کی

خبر سن کر برداشت نہ ہوا اور وہ اسے گھر لے آیا...... زینب اس کے آنے سے بے انتہا خوش تھی مگر وہ نہ تو ان کو پہچانتا تھا اور نہ ہی جانتا تھا۔ وہ ان کے لئے ایک اجنبی شخص تھا...... جن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ حیرت سے ان کی جانب دیکھتا اور منہ پھیر لیتا...... زینب محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی...... اسے اس کا بچپن اور جوانی یاد دلانے کی کوشش کرتی اور وہ سب کچھ سن کر یوں منہ پھیر دیتا...... جیسے وہ کسی اور کی باتیں اسے سنا رہی ہو۔ وہ اچانک ہنسنے لگتا...... اور کبھی کبھی اچانک ہی رونے لگتا۔ وہ بن بتائے گھر سے باہر نکل جاتا...... فر فر انگریزی بولتا...... کبھی گنگنانے لگتا...... گدھوں، گھوڑوں کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتا...... ان کے ساتھ کھیلنے لگتا تو کبھی بچوں کا ٹیچر بن کر ان کو مارنے لگتا۔ اس کے کپڑے گندے اور پھٹے ہوئے ہوتے۔ گلی محلے کے بچے اس کے پیچھے بھاگتے...... اس پر آوازیں کستے اسے تنگ کرتے اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لئے کبھی ان کو کنکر مارتا...... کبھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر مارتا...... لڑکے خوش ہو کر سیٹیاں بجاتے...... اور وہ کبھی پریشان ہو کر اونچی آواز میں رونے لگتا...... کبھی ہنسنے لگتا۔ نذیر حسین اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا، وہ کبھی کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھا ہوتا، کبھی کسی سڑک پر لیٹا ہوا پایا جاتا۔ کبھی بسوں میں سفر کرتا، کبھی لوگ اس پر ترس کھا کر اسے بھیک دیتے...... کچھ ڈانتے پھٹکارتے...... کسی زمانے میں وہ چہرے سے ہی پڑھا لکھا اور مہذب شخص دکھائی دیتا مگر اب اس قدر گندا اور غلیظ ہوتا کہ اس کے پاس کوئی نہ بیٹھتا...... ایسی بدبو آتی کہ لوگ اسے دیکھ کر ناک منہ چڑھاتے...... اس کو دیکھ کر ہر ایک کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیلنے لگتے...... اسے دیکھ کر کسی کو رحم نہ آتا...... سب اس سے بیزار اور خفا دکھائی دیتے...... وہ گزشتہ پانچ سالوں سے اس طرح کی کریہہ زندگی گزار رہا تھا...... اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ماضی کبھی شاندار بھی رہا تھا...... کبھی وہ نارمل انسان بھی تھا...... کبھی اس نے اچھی زندگی گزاری تھی۔ وہ انتہائی ذہین اور فہم و فراست کا مالک بھی تھا...... کبھی وہ بہت مشہور بھی تھا، اس کی باتیں غور سے سنی اور سمجھی جاتی تھیں...... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ معاشرے کا کوئی ناکارہ اور بیمار حصہ ہو...... نالی کا ایسا کیڑا ہو جو اتفاق سے رینگتا ہوا انسانوں کے درمیان آ گیا ہو اور انسان اب اسے پاؤں تلے روندر ہے ہوں۔ وہ اپنی ذات، شناخت، شخصیت سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ نہ اس میں وہ تکبر رہا تھا...... نہ آن...... نہ شان...... انسانوں کو حقیر سمجھنے والا...... اب انسانوں کے درمیان اک ذرہ خاک بن کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کو رسوا کرنے والا خود ذلیل و خوار ہو رہا تھا...... لوگوں کی زندگیوں میں زہر بھرنے والا اب خود زندگی کے کڑوے گھونٹ پی رہا تھا...... اپنے سازشی ذہن...... اور مکارانہ چالوں سے دوسروں کی زندگیوں کو شدید اذیت سے دوچار کرنے والا اب لمحہ لمحہ زندگی کا عذاب جھیل رہا تھا...... جسے اپنی عقل اور فہم و فراست پر بڑا ناز تھا...... اب اس عقل کے چھن جانے پر کیسے کیسے خوار ہو رہا تھا، جو اپنی کامیابیوں پر قدرے مغرور تھا اور اسے اپنی جدوجہد و محنت کا ثمر جانتا تھا...... جس نے قدرت کی مہربانیوں کو سائنس کی کرشمہ سازیاں سمجھ کر اپنی ذات سے اس کا عمل دخل خارج کر دیا تھا۔ اب قدرت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا کر سرعام رسوا ہو رہا تھا...... جس نے بہت سے لوگوں کی خوشیوں کو لوٹا تھا اور ان کے دلوں کو دکھوں سے بھر دیا تھا...... اور ان کی آنکھوں کو نہ تھمنے والے آنسو دیئے تھے اب سسک سسک کر زندگی گزار رہا تھا۔ لوگ اسے پتھر مارتے تو وہ گالیاں بکتا...... اور لوگ اس پر ہنستے...... اس کو دیکھ کر ناک پر کپڑا رکھ لیتے...... بچوں نے...... بڑوں نے اور بہت سے لوگوں نے اس کے کئی نام بگاڑ کر رکھے تھے۔ شہرت کے آسمان پر چمکنے والے ڈاکٹر دانش کا نام اب لوگ بھول چکے تھے۔ اس نے اپنا اصلی نام بھلایا تھا اور قدرت نے اس کا اپنا نام بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت بوڑھا

لگنے لگا تھا۔ اسکی سانولی رنگت جل کر سیاہ ہوگئی تھی اور اس کے موٹے بھدے نقوش اور بگڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ وہ انتہائی بدصورت اور کریہہ نظر آتا۔

زینب کو نذیر حسین کچھ باتیں بتاتا اور بہت سی چھپا لیتا مگر محلے کے بچے آکر اسے ہنس ہنس کر اس کے بارے میں قصے سناتے تو زینب کا دل کٹنے لگتا وہ چارپائی پر پڑی کراہنے لگتی، سسکنے لگتی۔

دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا مگر زینب کے لئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں قدرت نے ایسی تاریکی بھر دی تھی جو کسی طرح بھی کم نہ ہوتی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔۔۔۔۔ اپنے رب سے فریاد کرنے لگتی اس سے شکوے کرتی۔

''یاالٰہی۔۔۔۔۔ یہ تو نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا۔۔۔۔۔؟ اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔۔۔۔۔ اس کو اتنا بڑا دماغ دے کر اب اس کے دماغ کو خراب بھی کر دیا۔۔۔۔۔ اتنی عزت اور شان دے کر اب تو اسے یوں گلیوں۔۔۔۔۔ بازاروں میں رسوا کر رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ اتنا بے عقل ہو گیا ہے کہ اسے نہ اپنے آپ کی ہوش ہے نہ کسی اور کی خبر۔۔۔۔۔ نہ وہ ماں کو پہچانتا ہے نہ باپ کو۔۔۔۔۔ یا اللہ۔۔۔۔۔! یہ تو نے کیا کیا۔۔۔۔۔؟ کیوں کیا۔۔۔۔۔؟ میرا اتنا لائق بچہ۔۔۔۔۔ سارا وقت پڑھتا ہی رہتا تھا۔ اس نے دن رات اتنی پڑھائی کی اتنی محنت کی۔۔۔۔۔ اپنی زندگی بنائی۔۔۔۔۔ اور تو نے اس سے اسکا سب کچھ چھین لیا۔۔۔۔۔ وہ ہم سے نہیں ملتا تھا مگر یہ سکون تو تھا کہ وہ اپنی زندگی میں خوش ہے۔۔۔۔۔ اس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔۔۔۔۔ بہت محنت سے اپنی زندگی بنالی ہے۔۔۔۔۔ اور اب تو۔۔۔۔۔ نے۔۔۔۔۔ اسے ہم سے ملا کر ہمیں اور دکھی کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے خراب دماغ اور اس کی پاگلوں جیسی حرکتوں کا سن کر میرا دل کتنا دکھی ہوتا ہے۔ میں کتنا روتی رہتی ہوں۔۔۔۔۔ کتنا تڑپتی ہوں۔۔۔۔۔ اسے کچھ خبر نہیں۔۔۔۔۔ مگر تو۔۔۔۔۔ تو سب جانتا ہے۔۔۔۔۔ یا اللہ!۔۔۔۔۔ میرے بچے کو ٹھیک کر دے۔۔۔۔۔ اس کو عقل اور سمجھ دے دے۔۔۔۔۔ اس کے بدلے میں۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ میری جان لے لے۔۔۔۔۔ میرا دماغ لے لے۔۔۔۔۔ میری عقل اور سمجھ بوجھ لے لے۔۔۔۔۔ مگر اسے سب کچھ عطا کر دے۔۔۔۔۔ وہ بری طرح سسکنے لگی، وہ رات بھر گھر نہیں آیا تھا اور نذیر حسین اسے ساری رات تلاش کرتا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور زینب ساری رات اس کی آمد کی منتظر رہی تھی۔۔۔۔۔

پتا نہیں۔۔۔۔۔ اس نے روٹی بھی کھائی یا نہیں۔۔۔۔۔ پچھلی دفعہ وہ گھر سے غائب ہوا تو اگلے روز ملا۔۔۔۔۔ اور نذیر حسین نے بتایا کہ جب اسے بھوک لگی تو اس نے درختوں کے پتے اور کاغذ کھائے تھے۔۔۔۔۔ زینب یہ سن کر بری طرح روئی تھی اور پھر نذیر حسین نے اس کے نام اور ایڈریس کی تختی اس کے گلے میں لٹکا دی تھی جسے وہ اکثر غصے میں آکر اتار پھینکتا تھا۔ اب بھی وہ غائب تھا اور زینب بے حد پریشان تھی۔ بُرے بُرے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ نجانے وہ کہاں چلا گیا ہے؟ نجانے اس نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔

دروازہ زور سے کھلا اور نذیر حسین گھبرایا ہوا اندر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔۔۔ سسکیاں بھرنے لگا۔ ک۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''زینب۔۔۔۔۔ تیرے بیٹے کی اب وہ حالت ہوگئی ہے کہ اب تو خدا سے اس کے مرنے کی ہی دعا کر'' نذیر حسین ہچکیاں بھرتے ہوئے بولا۔

''خدا نہ کرے۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ یہ دعا کیوں کروں۔۔۔۔۔؟ کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے بھلا ایسی بددعا کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے بتا۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔ اسے؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''ٹرین کے نیچے آ کر اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی ہیں'' نذیر حسین نے بمشکل روتے ہوئے بتایا۔

زینب نے زور سے چیخ ماری......اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''یا اللہ! تو میرے بچے کے ساتھ اتنا ظلم......کیوں کر رہا ہے......اتنا......ظلم......اتنا......'' وہ چیخیں مارنے لگی اور بری طرح سسکنے لگی۔

''اگر تو نے اس کے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا......تو پھر اسے کیوں پیدا کیا......کیوں پیدا کیا؟'' زینب نے انتہائی دردناک آوازیں نکالیں۔

''یا اللہ! تو اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے'' زینب نے آسمان کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کہا اور چیخیں مار کر رونے لگی۔ نذیر حسین بھی سسکتا رہا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ زینب اور نذیر حسین کی سسکیاں اور آہیں......اوپر......ہر جانب سنائی دے رہی تھیں۔

تمام نوری مخلوق خاموش بھی تھی اور حیران بھی......انسان کی جرأت پر وہ حیران ہو رہے تھے جو برملا بڑی سرکار کو 'ظالم' کہتے تھے اور اپنی تمام اذیتوں......تکلیفوں اور پریشانیوں کی وجہ بڑی سرکار کو جانتے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ بڑی سرکار غصے میں آ کر کوئی حکم نہ جاری کر دے مگر سفید روشنی بدستور روشن تھی اور اس سے نورانی شعاعیں نکل کر ماحول کو پرسکون بنا رہی تھیں اس کا مطلب تھا......بڑی سرکار انسانوں کے شکوے سن کر غصے میں نہ آتی تھی بلکہ بڑے تحمل اور بردباری سے سب کچھ سن رہی تھی۔ ان کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی......وہ بھی خاموش رہے مگر ان کے دل اندر ہی اندر مضطرب ہو رہے تھے۔

☆

سپر ایجنٹ صفدر

سپر ایجنٹ صفدر، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور ناول ہے۔ مظہر کلیم کے اس ناول کا تھیم سیکریٹ سروس کے ایجنٹوں کی انفرادی کارکردگی اور صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ مظہر کلیم اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی ناول لکھ چکے ہیں جیسے ''ڈیشنگ ایجنٹ'' اور ''جولیانا مشن'' وغیرہ۔ اس بار پاکیشیا سیکریٹ سروس کے چیف ایکس ٹو نے صفدر کو ایک انتہائی خطرناک مشن سپرد کیا ہے اور وہ مشن ہے دشمن ملک کی فوجی لیبارٹری سے ایک اہم فارمولا کی چوری۔ یہ لیبارٹری بہت خطرناک صحرا کے وسط میں واقع ہے جہاں ہر وقت طوفانی ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور ان ہواؤں کو پار کر کے اس لیبارٹری تک پہنچنا ناممکن۔ صفدر کو اکیلے اس ناممکن مشن کو ممکن بنانا ہے اور خود کو سپر ایجنٹ ثابت کرنا ہے۔ کیا صفدر اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گیا؟ کیا باقی سیکریٹ سروس محض تماشائی بنی رہی؟ کیا عمران موت سے پنجہ آزمائی کر کے صفدر کی مدد کو پہنچا؟ ان سب سوالوں کے جواب جاننے کے لئے پڑھیے ناول ''سپر ایجنٹ صفدر''۔

''**سپر ایجنٹ صفدر**'' کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شام کا ملگجا اندھیرا ہر جانب پھیل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی جس نے ماحول اور اس میں متحرک زندگی کو بھی قدرے سست بنا دیا تھا۔ زیادہ تر لوگ سرِ شام ہی اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے جوں جوں شام بڑھنے لگی تھی۔ دھند نے بھی ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فریحہ اپنے بیڈروم میں ہیٹر کے سامنے فلور کشن پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے سامنے رکھے بہت سے اخبارات کو دیکھ رہی تھی جس میں انتہائی نمایاں انداز میں اس کی تصاویر شائع ہوئیں تھیں اور اس کے بارے میں انتہائی تعریفی کالمز شائع ہوئے تھے۔ ہر اخبار نے اس کی خدمات کو بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ صبح سے اس کے موبائل پر اسے مبارکباد کی فون کالز موصول ہو رہی تھیں اور اب اس نے موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ وہ ایک اخبار اٹھاتی اس میں اپنی تصاویر دیکھتی...... اپنے بارے میں رپورٹ پڑھتی...... گہری آہ بھرتی اور اخبار دوسری جانب رکھ دیتی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ، چھ اخبارات یونہی پڑھ کر دوسری جانب رکھ دیے تھے...... اور ہر اخبار نے اس کے اندر کے کرب میں اضافہ کیا تھا۔

کسی اخبار نے اسے انسانیت کی 'مسیحا' لکھا تھا کسی نے دکھی دلوں کا مرہم...... کسی نے امید کی کرن...... الغرض ہر اخبار نے اسے بھرپور خراج تحسین پیش کیا تھا...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے......

کبھی کبھی انسان کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کام کر رہا ہے...... کس لئے کر رہا ہے......؟ اس کا محرک کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے......؟ اور وہ کیوں اتنی جدوجہد اور کس کے لئے کر رہا ہے؟

دنیا سمجھتی تھی کہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے یہ کام کر رہی ہے...... مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کس کے لیے یہ سب کر رہی تھی...... اپنی بے کار زندگی کو مصروف بنانے کے لئے...... اس نے عاصم کی یاد میں 'عزم' کے نام سے ابنارمل بچوں کے لئے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا تھا۔ پانچ سالوں میں اس ادارے کی برانچز چار بڑے شہروں میں بھی کھولی تھیں...... جہاں ابنارمل بچوں کا مفت علاج بھی کیا جاتا اور ان کی پرورش و تعلیم و تربیت بھی کی جاتی...... شدید ذہنی معذور بچوں کے لئے نرسنگ کیئر سنٹر قائم کئے گئے تھے۔ فریحہ نے خود آرکیٹیکچر میں زبردست نام اور شہرت حاصل کی تھی۔ وہ اپنی کمائی ان اداروں پر خرچ کرتی یا مخیّر افراد اس کی معاونت کر دیتے۔ اس نے ان اداروں کی زبردست پلاننگ کی تھی۔ انتہائی پرسکون، خوشگوار اور تمام ضروری سہولیات ان سنٹرز میں میسر تھیں بہت سے غریب، پسماندہ علاقوں کے والدین ان سنٹرز کے قائم ہونے سے خوش تھے اور فریحہ کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں کرتے تھے۔ ان سنٹروں کی سالانہ تقریبات میں ان کی کارکردگی کی رپورٹیں ہر سال شائع ہوتی تھیں اور چند روز پہلے تمام شہروں میں سالانہ تقریبات منعقد ہوئی تھیں اور فریحہ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس نے جب سے 'عزم' کے نام سے ادارے قائم کئے تھے۔ اس کی عزت اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی، اس کا بہت احترام کیا جاتا اور اسے بہت عزت دی جاتی۔ ایسی عزت اور نیک نامی قدرت چند مخصوص لوگوں کی قسمت میں لکھتی ہے اور قدرت اسے اس عزت سے بھرپور انداز میں نواز رہی تھی...... قدرت اسے جتنا عطا کر رہی تھی اس میں اتنی ہی بے نیازی آتی جا رہی تھی۔ اسے رحمدلی اور منکسر المزاجی کی علامت سمجھا جانے لگا تھا جو بے غرض اور بے لوث ہو کر بغیر کسی مقصد کے انسانیت کی خدمت کر رہی تھی۔ اسے قابل فخر اور عظیم انسان سمجھا جانے لگا تھا۔ ایسا انسان جس کے دل میں قدرت نے اپنے ہی جیسے لوگوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

صحافی ہمیشہ اس سے یہی سوال کرتے تھے کہ اس نے اس نیک کام کو کیونکر شروع کیا......

کیا انسانیت کی خدمت کے لئے......؟

کیا کسی اور جذبے کے تحت......؟

کیا کسی مشن کی خاطر......؟

اور وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتی......''اپنے بیٹے عاصم کی یاد میں''

''آپ کا بیٹا کہاں ہے؟'' ہر کوئی اس کا جواب سن کر پھر سوال کرتا اور وہ اس سوال کا جواب نہ دے پاتی بس خاموش رہتی اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

اس نے اخبارات کو لپیٹ کر ایک جانب رکھ دیا اور ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر چھت کو گھورنے لگی۔

کیسے سب کو بتاؤں......کہ......میرا بیٹا کہاں چلا گیا؟ اس کو کس نے چھین لیا......؟

اس شخص نے جو اس کا باپ تھا۔ اس نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی امید چھین لی......اس نے مجھے اتنا تنہا اور بے آسرا کر دیا کہ زندگی کا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا......اسے یاد آنے لگا کہ عاصم کے بعد وہ گھر آنے کی بجائے رات کو دیر تک آفس میں بیٹھی رہتی......نہ کام کرنے کو دل چاہتا اور نہ ہی آرام کرنے کو......نہ اسے نیند آتی اور نہ ہی کھانا کھانے کو دل چاہتا......عاصم کی وفات اور اس کے بعد شیر افگن کی بے وفائی......اس کو اندر ہی اندر ہر لمحہ رلاتی رہتی......وہ ہر وقت سوچوں میں گم کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر روتی رہتی......اس نے اتنے بڑے گھر کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔ اماں اسے بہت سمجھاتی مگر اس کا دل اور دماغ ایسے خالی ہوئے تھے کہ کسی بھی بات کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ زندگی اس قدر بے معنی، خالی اور فضول لگتی کہ اس کا دل چاہتا وہ بھی خودکشی کر لے۔ ڈاکٹر دانش نے نجانے اس سے کیسا انتقام لیا تھا کہ بڑی چالاکی سے منصوبہ بندی کر کے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ ہر وقت اندر ہی اندر سسکتی اور کڑھتی رہتی......مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بیمار ہونے لگی۔ وہ تب چونکی جب اس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا......ہر وقت کی کھانسی نے اسے بے حال کر دیا تھا......اماں کے ناراض ہونے پر وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو گئی......وہاں اس کی ملاقات ایک سوشل ورکر خاتون مسز نجیب سے ہوئی۔ مسز نجیب ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں جو وہیل چیئر پر ٹی بی کے مریضوں میں ہر رات پھل بانٹنے آتی تھیں۔ فریحہ نے ایک پرائیویٹ روم لے رکھا تھا۔ ایک رات یونہی وہ باہر نکلی اور مسز نجیب کے آنے پر مریضوں کی خوشی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ سب لوگ ان کے گرد جمع تھے اور وہ سب سے بہت محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ وہ جانے لگیں تو فریحہ کو ایک بنچ پر اداس و پریشان بیٹھی دیکھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

''بیٹا......آپ اتنی اداس کیوں ہیں......کیا یہاں......اس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں؟'' مسز نجیب نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

فریحہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ محبت کے اس لمس میں نجانے کیا سحر تھا کہ وہ ان کی طرف نم آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''کس غم کو اتنا دل سے لگایا ہے کہ اس بیماری کا روگ لگا لیا ہے'' مسز نجیب نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''خالی اور بے معنی زندگی میں صرف غم ہی باقی رہ جاتے ہیں'' فریحہ نے بمشکل کہا اور سسکنے لگی۔

''تم تعلیم یافتہ اور باشعور لگتی ہو...... پھر ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟'' مسز نجیب نے پوچھا۔

''میری زندگی سے امید ہی تو ختم ہو چکی ہے'' فریحہ نے کہا۔

''کیسے......؟'' مسز نجیب نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک شخص نے...... جو کبھی میرا شوہر تھا...... مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گیا...... اب کچھ بھی باقی نہیں رہا...... سوائے مایوسی...... بے بسی اور دکھی سوچوں کے'' فریحہ نے افسردگی سے جواب دیا اور کھانسنے لگی۔

''انسان...... انسان سے اس کی امید چھین سکتا ہے مگر ''اللہ'' نہیں'' مسز نجیب نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ چونک کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کا دل جیسے ٹھہر سا گیا ہو...... ان کی بات اس کے دل میں کہیں اپنا گھر کر رہی ہو......

''ایک رات...... ڈاکو ہمارے گھر آ گئے...... میرے شوہر اور میرے جوان بچے کو انہوں نے گولیاں مار دیں...... میں بھاگنے لگی تو میری دونوں ٹانگوں پر فائر کر دیا...... ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گئے...... میں زندہ لاش کی مانند تڑپتی رہی بستر سے ہی نہ اٹھ پائی تھی...... اس قدر مایوس ہو گئی کہ مرنے کی دعائیں کرتی تھی...... خدا سے ہر وقت شکوے کرتی کہ اس نے میری ہری بھری بستی اجاڑ دی پھر اسی خدا نے مجھے حوصلہ دیا۔ میرے شوہر بہت اچھے انسان تھے۔ غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے ہر ویک اینڈ پر اس ہسپتال میں ہم دونوں آتے تھے اور مریضوں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میں پورے دو ماہ یہاں نہ آئی تو ہاسپٹل سے فون جانے لگے کہ مریض نجیب صاحب کا پوچھتے ہیں...... اور پھر میں ان کی یاد میں...... میں ہر روز یہاں آتی ہوں، ہماری ایک فلور مل ہے اور گاؤں میں زمینیں ہیں...... میں اپنی زیادہ تر آمدنی ان غریبوں پر خرچ کرتی ہوں...... اور خوش ہوتی ہوں کہ خدا نے مجھے ان کے لئے ایسی امید...... اور ایسی خوشی بنایا ہے جو مجھے اندر سے خوش کرتی ہے...... ان کی دعائیں مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں...... اب میں اپنے مرنے کی نہیں بلکہ اپنی زندگی کی دعا کرتی ہوں...... میرے مر جانے سے ان کا بہت کچھ چھن جائے گا...... اس لئے بیٹا...... لوگوں کے لئے ایسی امید بن کر جیو...... کہ...... جو تمہیں...... کبھی مرنے نہ دے...... اور تمہاری امید تمہارے اندر ہے اس سے مدد طلب کرو'' مسز نجیب نے محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگایا اور بہت دعائیں دے کر چلی گئیں...... فریحہ کے دل میں اچانک کچھ ہونے لگا...... نیا جوش، جذبہ پیدا ہونے لگا۔

''اس عورت کے پاس تو سب کچھ اچھا تھا جو چھن گیا اور میرے پاس تو کچھ بھی اچھا نہ تھا...... بدترین شوہر...... معذور بیٹا...... اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے محبت کا نام نہاد دعوے دار......'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے اندر مثبت تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ وہ ہر شام مسز نجیب کی شدت سے منتظر رہتی اور ان سے باتیں کرتی ان کی باتوں سے اسے حوصلہ ملتا...... وہ جلد صحت یاب ہونے لگی...... اور مسز نجیب کے مشورے سے ہی اس نے عاصم کی یاد میں 'عزم' جیسے ادارے کی بنیاد رکھی...... مسز نجیب نے ہی اس کا افتتاح کیا...... وہ بہت خوش تھیں کہ فریحہ میں زندگی کی امید پیدا

ہوگئی تھی...... مسز نجیب کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے مگر وہ آج بھی فریحہ کے اندر زندہ تھیں۔ ایسی امید بن کر جو اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہیل چیئر پر اپنے بیمار، لاغر اور معذور جسم کے ساتھ وہ لوگوں کو امید کا پیغام دیتی تھیں...... فریحہ بھی ان کی ڈگر پر چل رہی تھی۔ اسے نہ شہرت کی طلب تھی نہ نام کی خواہش...... اور نہ ہی کوئی اور ہوس تھی وہ تو مایوس لوگوں کی آنکھوں میں امید کی کرنیں دیکھ کر خوش ہوتی تھی...... لوگ اس کے لئے ویسی ہی دعائیں کرتے تھے جیسی مسز نجیب کے لئے کرتے تھے۔ اس کو ویسی ہی عزت اور پروٹوکول دیتے تھے جیسے مسز نجیب کو۔

فریحہ نے آہ بھری...... اور خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے چھت کو دیکھنے لگی۔

''زندگی کس قدر عجیب ہے...... اور انسان اس سے بھی زیادہ عجیب مخلوق ہے...... کوئی انسان ساری امیدیں چھین لیتا ہے اور کوئی انسان اتنا پر امید بنا دیتا ہے کہ کبھی کبھی اس پر بھی یقین نہیں آتا...... اگر میں عاصم کی صورت میں ابنارمل بچوں اور ان کے کرب سے آشنا نہ ہوتی تو کبھی 'عزم' جیسے ادارے قائم نہ کرتی۔ اگر میں بیمار نہ ہوتی تو مسز نجیب سے کیسے ملتی اور ان کی باتیں مجھ میں امید کیسے پیدا کرتیں...... زندگی کے پر پیچ راستے اور اس کے الجھے ہوئے دھاگے قدرت نے کس قدر باریک بینی اور گہری منصوبہ بندی سے انسان اور اس کے حالات وواقعات کے ساتھ جوڑے ہیں کہ انسان خود بھی دنگ رہ جاتا ہے۔

''یا اللہ! بے شک تو بے نیاز ہے...... میں تیری ہستی کو سلام کرتی ہوں......'' فرطِ جذبات سے فریحہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ سسکنے لگی...... اس کا دل خدا کی حمد و ثناء کرنے لگا۔ اس کے دل کی صدائیں اوپر سُنی جانے لگیں۔ تمام نوری مخلوق نے چونک کر انہیں سنا اور حیران ہونے لگے۔ ہر انسان خدا سے شاکی تھا...... اکثریت شکوے کر رہی تھی...... اور اتنے بہت سے لوگوں میں سے صرف ایک خدا کی معترف تھی اور اتنی بہت سی آزمائشوں کے بعد اس کا شکر اور اس کی تعریف کر رہی تھی۔ یہ بات ان کے لئے انتہائی حیرت کا باعث تھی۔

ان کے لیڈر کے چہرے پر مایوسی سی پھیلنے لگی جو چپکے چپکے یہ منظر دیکھ اور سن رہا تھا۔

سب نے سفید روشنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی جانب آنکھ بھر کر دیکھ سکتے۔ روشنی ایک دم زور سے چمکی...... جیسے یہ باتیں اور منظر دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ ہر طرف انتہائی خوشگوار تاثر پیدا ہونے لگا۔

(۳)

شاہی دربار میں سراسیمگی کا عالم تھا۔ حاضرین محفل خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں انسانوں کے ادھورے پن، غربت و مفلسی کے ہاتھوں اٹھانے والی ذلتوں، بھوک اور شہوت سے جنم لینے والی رسوائیوں نے افسردہ کر دیا تھا۔

انسان کس لیے اور کیوں اتنا کرب اٹھا رہے ہیں؟

اتنی اذیتوں کا حاصل کیا ہے......؟

جنم لینے سے مرنے تک صبر آزما کٹھن مراحل سے گزرنے کی وجہ کیا ہے......اور......کون اس کا ذمہ دار ہے......؟ کیا انسان خود...... یا......پھر کوئی......اور......؟

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھے......اور منتظر تھے کہ بڑی سرکار کے دربار سے ان کی سوچ کے بارے میں کیا رائے دی جاتی ہے......مگر انہیں نہ تو کوئی رائے ملی......اور......نہ ہی کوئی فرمان جاری ہوا......ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

اچانک مختلف صداؤں کا شور بلند ہوا......وہ بغور سننے لگے اور حیرت سے نیچے دیکھنے لگے۔

چاند کی چودھویں رات تھی اور چاند کی چاندنی نے رات کی تاریکی کو اپنی خوبصورت اور نرم و لطیف، ٹھنڈی روشنی سے منور کر رکھا تھا۔ حسن و خوبصورتی اور لطافت کے سحر انگیز احساس نے پورے ماحول کو سرشار کر رکھا تھا۔

حویلی میں رقص و سرور کی محفل عروج پر تھی۔ دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار، ڈھولک کی تھاپ، طبلے کی تال اور آواز کے سُر......اور جادوئی سحر نے اک حسین سا تاثر پیدا کر رکھا تھا......حاضرین محفل دو رقاصاؤں کے رقص اور ان اداؤں سے جی بہلا رہے تھے......خوش اور مسرور ہو رہے تھے......رقاصاؤں کی شوخ اور چنچل اداؤں پر ان کے دل باغ باغ ہو رہے تھے......حویلی کی تیسری منزل پر موجود رقص ہال میں عیش و نشاط کی محفل سرگرم تھی اور حویلی کے پچھواڑے میں شب غم اپنی تمام تر اداسیوں اور مایوسیوں کے ساتھ ڈیرہ ڈالے وہاں رہنے والی طوائفوں کے دلوں کو افسردہ بنا رہی تھی......چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہنے والی طوائفیں اپنے آپ کو بند قفس میں پھڑ پھڑاتے پر کٹے پرندوں کی مانند محبوس اور بے بس پا کر سسک رہیں تھیں۔ کچھ ہنس گا رہی تھیں۔ کچھ گڑگڑا کر شکوے کر رہی تھیں کبھی کسی کی سسکیوں کی آواز بلند ہوتی......تو......کبھی کسی کے رونے کی......کبھی کسی کی ہنسی اور گانے کی تو کبھی کسی کی آہوں اور شکووں کی......

ریناا پنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی کھول کر چاند کی چاندنی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی کو رشک سے بھی دیکھ رہی تھی اور حیرت سے بھی سیاہ رات کے دامن میں خوبصورت، چمکتے چاند کے اندر چھپی داستان غم میں اپنے داغ دل اور زخمی روح کے نشانات کھوج رہی تھی......

”تمہارا اندر...... بھی...... میری طرح بنجر اور ویران ہے...... باہر کی چمک دمک اور خوبصورتی دوسروں کو دیوانہ بنا دیتی ہے...... لوگ سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں...... مگر تمہارے دکھ کو کوئی نہیں جان سکتا...... کاش کوئی تمہارے اندر بھی جھانک سکے اور میرے اندر بھی...... مگر اندر تک کسی کی رسائی ممکن نہیں...... سوائے اس کے جو جسم اور قلب و روح کے اندر موجود ہے...... جو سب کچھ خاموشی سے سنتا ہے...... ہر وقت، ہر لمحہ...... دن اور رات کی تاریکیوں میں بھی سنتا ہے مگر جواب نہیں دیتا...... نجانے وہ کیوں جواب نہیں دیتا...... شاید وہ ہم جیسی بے بس اور دھتکاری عورتوں کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا...... لیکن میں آج اُسے سنا کر رہوں گی...... وہ سب کچھ...... جو میرے دل کے اندر غبار بن کر اڑ رہا ہے اور مجھ سے اس غبار کے دھوئیں میں سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔

”یا اللہ! تو نے انسان کو کیوں بنایا اور اگر بنا ہی دیا تو اس کے پاؤں میں مجبوریوں کی بیڑیاں، گلے میں رسوائیوں کے طوق اور دلوں میں خواہشات کے انبار کیوں لگا دیئے۔

تو کہتا ہے انسان ’نادان‘ ہے...... جلد باز ہے...... اور کمزور ہے مگر تو...... تو عقل کل ہے...... تجھے تو انسان کے ماضی حال اور مستقبل کا علم ہوتا ہے...... انسان نے کہاں اور کس رستے پر چلنا ہے...... تجھے سب معلوم ہوتا ہے...... پھر تو انسان کو کیوں ان راستوں کی طرف جانے دیتا ہے جو کھائیوں کی طرف جاتے ہیں جن میں گر کر انسان کو سوائے رسوائی اور ذلت کے کچھ بھی نہیں ملتا...... تو کہتا ہے کہ تو انسان سے بہت محبت کرتا ہے...... یہ کیسی محبت ہے کہ انسان کو نشان ذلت بنا کر اس کی بے بسی اور لاچاری کا تماشا دیکھتا ہے...... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے...... جس کے جال میں تو نے ہم انسانوں کو پھنسا رکھا ہے...... نہ اس سے فرار ممکن ہے اور نہ ہی اس میں سکون ہے...... وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کرنے لگی...... اس کی نظریں چاند پر تھیں۔

”ہر انسان خوبصورت اور چمکیلی چیزوں کو پانے کی خواہش کرتا ہے...... تو اُس کے دل کے اندر اس خواہش کے لئے اتنی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ جب تک انسان اپنی اس خواہش کو پا نہیں لیتا وہ مضطرب رہتا ہے...... انسان کے اندر ’خواہش‘ بھی تو پیدا کرتا ہے اور اس کو پانے کی سزا بھی ’تو‘ ہی دیتا ہے۔

”میں نے بھی ایسی ہی ایک خواہش کی...... نگار بیگم بننے کی مگر تو جانتا تھا کہ نگار بیگم کی حقیقت کیا تھی...... تو مجھے ان راستوں پر لایا...... اسے دکھایا اور پھر میرے اندر اس جیسا بننے کی شدید خواہش پیدا کر دی...... میں اپنے اندر کی بھوک، گھر کی غربت اور مفلسی سے تنگ آ گئی تھی...... زندگی کی خوشیوں اور آسائشوں کو پانے کی تمنا کرتی تھی...... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے مجھے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی...... میں کیا سے کیا بن گئی؟ بھکارن سے ملازمہ...... ملازمہ سے طوائف اور فلمی ہیروئن اور اب رقاصہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بدنام اور ’ذلیل عورت‘ اس نے گہری سانس لی اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

انسان کہاں غلطی کرتا ہے......؟

کیا...... جب وہ کوئی خواہش کرتا ہے......؟

ان دیکھی دنیا کو پانے کی تمنا کرتا ہے......؟

مگر

انسان کو کیا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک خواہش کے لئے اسے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے اس کے لئے زندگی کا مقصد اس خواہش کا پورا کرنا ہوتا ہے......جس کے لئے وہ گڑگڑا کر دعائیں بھی کرتا ہے......اور کوشش بھی...... تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے اور ذلت بھی......مگر جب وہ خواہش اتنی تکالیف اور کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد پوری ہوتی ہے تو وہ خواہش مکمل طور پر اس صورت میں سامنے آتی ہے کہ انسان خود چونک جاتا ہے اس کی ساری خوشی ختم ہو جاتی ہے......اس نے اس کو پانے کے لئے جتنی اذیتیں اٹھائی ہوتی ہیں......وہ سب یاد آنے لگتی ہیں......تو پھر وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش! اس نے یہ خواہش نہ کی ہوتی......

میں نے نگار بیگم کو قتل کر دیا......کیونکہ میں اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی......اور مجھے اپنی خواہش کی تکمیل کرنا تھی......اور جب میں نگار بیگم بن گئی......تو......میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا......اپنی عزت......محبت......پاکیزگی......سب کچھ۔

دلبر مجھ سے روٹھ گیا......

کیا ہر انسان جو زندگی میں کچھ پانے کی تمنا کرتا ہے......کیا تو انہیں ایسی ہی سزائیں دیتا ہے......؟

تو انسان سے اس کے اندر کا سکون چھین لیتا ہے......

اس کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑتا ہے......اور

پھر وہ خالی ہاتھ کھڑا بے بسی سے تیری طرف دیکھتا رہ جاتا ہے......

یہ کیسی محبت ہے جو تو ہم انسانوں سے کرتا ہے......

یہ کیسی عطا ہے......جس میں تو رسوائیاں اس کے مقدر میں لکھ دیتا ہے......

اور یہ کیسا کرم ہے کہ تو سب کچھ چھین کر اسے خالی ہاتھ کر دیتا ہے......

اگر

تو نے ہمارے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا تو ہمیں پیدا کیوں کیا؟

ہم تو اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتے......اور نہ ہی سکون سے جی سکتے ہیں......

تو نے مجھے کیا کیا کچھ دکھایا......اور......پھر سب کچھ چھین لیا......

کیا یہ سب میری تقدیر تھی......؟ یا

میری خطا......؟ یا

میرے گناہ......؟ یا

علیم الحق حقی کے شہرہ آفاق قلم سے
نئی سج دھج کے ساتھ دو بہترین کتابیں
شناخت
قیمت=/100 روپے
گھروندا
قیمت=/100 روپے

میری آزمائش......؟یا

میرا امتحان......؟

مگر جو کچھ بھی ہے اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے......

یہ زندگی ہے یا سزا......؟

میں اپنی خواہشوں کو اپنی زندگی سمجھ بیٹھی اور ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہی مگر وہ خواہشیں سراب ثابت ہوئیں۔ایسے سائے جو پلک جھپکتے ہی غائب ہو جاتے ہیں......میں مانتی ہوں میں نادان تھی......کچھ سمجھ نہ سکی......مجھے کسی بھی شے کا نہ علم تھا اور نہ ہی تجربہ......مگر میری اک بھول کی تو نے اتنی کڑی سزا دی......ایسی سزا جس کے بعد کوئی سزا، سزا نہیں لگتی......

زندگی کی آخری سانسوں تک تو نے میرے اندر ایسی آگ بھڑکا دی ہے جس کے شعلے ہر وقت مجھے اپنی لپیٹ میں لیے رکھیں گے......جو کبھی ٹھنڈی نہیں پڑے گی......جس کی تپش سے میرا دل اور روح ہر وقت جلتی رہے گی......تو نے مجھے ایسے پچھتاوے دے دیے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے......ایسی تنہائی اور اداسی میرے اندر بھر دی ہے کہ دنیا کی کوئی رنگ برنگی محفل بھی اس اداسی اور تنہائی کو ختم نہیں کر سکے گی......میرے اندر سے تمام امیدوں کو تو نے ختم کر دیا ہے......امیدوں کے سہارے انسان جیتا ہے......امیدیں انسان کو مرنے نہیں دیتیں......اور......میرے اندر تمام امیدیں دم توڑ چکی ہیں......

اب زندگی کی آخری سانسوں تک ان پچھتاوؤں پر آنسو بہاؤں گی......

میں ایسے کٹہرے میں کھڑی ہوں جہاں میں مجرم ہوں بھی اور نہیں بھی......

میں نے گناہوں کی دلدل میں قدم رکھا......اور اس میں دھنستی چلی گئی......مگر تو نے بھی تو مجھے نہیں بچایا......تو تو بچانے والا ہے......تو نے کہاں میرا ساتھ دیا؟ تو نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور میں کٹی پتنگ کی طرح ادھر سے ادھر پھرتی رہی......اب اتنی شکستہ حالت میں گری ہوں کہ کوئی پرسان حال نہیں......

میں فریب پہ فریب کھاتی رہی......

اپنے آپ سے......لوگوں سے......اور تم نے بھی تو مجھے فریب ہی دیا......قوس قزح کے رنگ دکھا کر میری زندگی کے رنگ چھین لیے......تو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا......

مجھے کہیں بھی تھوڑی سی رعایت نہیں دی......

میری خواہشوں کو پورا کر کے مجھے ادھورا کر دیا......

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......اس کی آہوں اور سسکیوں کی آواز سن کر بڑی سرکار کے شاہی دربار کے حاضرین افسردہ ہونے لگے......اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

☆

"ہائے ربا...... مجھ دکھیاری کی بھی فریاد سن......"

تمام حاضرین نے چونک کر اس آواز کو سنا اور اس کی طرف دیکھنے لگے......

رات کی تاریکی ختم ہونے کو تھی...... پو پھٹنے والی تھی...... ہر طرف ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا...... دن اپنی باری کا انتظار شدت سے کر رہا تھا...... کہ...... کب رات ختم ہو اور وہ نمودار ہو......

برکتے صحن میں چارپائی پر لیٹی کراہ رہی تھی...... تڑپ رہی تھی...... اس کے آنسو شدت سے بہہ رہے تھے...... کبھی وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتی...... پھر لیٹ جاتی اور لیٹ کر آسمان کی طرف بے قراری سے دیکھنے لگتی۔

"ربا...... تو کا ہے کو ہم غریبوں کو پیدا کرتا ہے...... ارے اب تو دکھ سہہ سہہ کر تھک گئے ہیں...... مگر نہ تو ہمارے دکھوں کو کم کرتا ہے...... نہ ہماری فریاد سنتا ہے...... اتنے دکھ...... اتنے دکھ...... کلیجہ پھٹے جا رہا ہے...... مگر نہ اس بڈھے جسم سے جان نکلتی ہے...... نہ دکھ کم ہوتے ہیں...... ارے...... تو نے سارے دکھ غریبوں کے لیکھوں میں ہی کیوں لکھ دیے ہیں...... کچھ تو رہنے دیتا...... پتہ نہیں...... ہم نے کیا گناہ کیے ہیں...... کیا جلم کیے ہیں...... جو تو ہم سے غصے ہی ہوئے جاتا ہے...... ہماری طرف دیکھتا ہی نئیں...... کبھی ہماری سنتا ہی نہیں...... وہ سسکنے لگی۔

"ہائے...... میری رانی کو گئے اتنے سال ہو گئے ہیں...... نہ وہ ملی ہے اور نہ اس کی کوئی خبر آئی ہے...... ارے کہاں چلی گئی...... اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا...... میری جواں دھی کہاں گم ہو گئی...... اس کی یاد میں رو رو کر میری اکھیوں کا پانی خشک ہو گیا ہے...... پر...... تجھے مجھ بڑھیا پر رحم نہیں آتا...... تو کب مجھ پر رحم کھائے گا؟

ربا...... کس کس کو روؤں...... گڈی کو یا رانی کو...... گڈی میری دھی کتنی سوہنی جوان تھی...... جالموں نے اتنا جلم کیا اور تو دیکھتا رہا...... تو نے کسی کو سزا نہ دی...... کسی سے نہ پوچھا...... ہائے...... ہم تیرے کتنے بے بس بندے ہیں جن کے پاس چار پیسے بھی نہیں تھے کہ پولیس میں رپٹ لکھواتے...... میری جوان دھی مٹی کے نیچے دب گئی...... اور سب بھول گئے...... پر...... میں کیسے بھولوں...... جس نے اسے پیدا کیا...... اسے پالا...... میری دھی مر گئی اور میں بڈھی جندہ رہ گئی...... تو میری جان لے لیتا...... پر اس کو تو چھوڑ دیتا...... اس کی سادی بھی بنائی تو اس بدماش رجو کے ساتھ جس نے اس کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ اور نجو خوش باش پھرتے ہیں...... مگر...... میری دھی تو چلی گئی......

دن نمودار ہو چکا تھا...... اور سورج کی پہلی کرنوں نے ماحول کو روشن کرنا شروع کر دیا تھا...... اس کے پاس پپو اور مجو چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ وہ اب کافی بڑے ہو چکے تھے پپو دس سال کا اور مجو بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ پپو ایک درزی کے پاس سلائی سیکھتا تھا اور مجو ایک چھوٹے ہوٹل میں ملازم تھا...... اس نے آہ بھر کر بچوں کی طرف دیکھا۔

کیسے بدنصیب بچے ہیں...... جن کو نہ پیٹ بھر کر روٹی نصیب ہوتی ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا...... سوچا تھا مجو ڈرائیوری سیکھ کر کمائی کرنے لگے گا تو مجھ نصیبوں جلی کے دن بھی پھر جائیں گے...... مگر...... وہ تو سادی بنا کر اپنی دلہن کے ساتھ یہاں سے چلا گیا...... بولتا تھا......

"اماں...... کب تک تیرا اور تیرے بچوں کا پیٹ پالوں...... اب مجھے اپنے بچوں کی بھی فکر کرنی ہے"۔

برکتے سسکنا شروع ہوگئی..... وہ بھی ٹھیک کہتا تھا..... بچہ سا تھا جب سے بھیک مانگنے نکلتا تھا..... چھوٹے چھوٹے ہاتھ لوگوں کے آگے پھیلاتا تھا تو میرا دل کتنا روتا تھا مگر ملکے نے سب کو ہی اس دھندے پر لگا دیا..... میں خوش ہوں اب نوکری تو کرتا ہے اس کے ہاتھ میں ہنر ہے..... وہ بھیک نہیں مانگتا مگر ماں کو ماں نہیں سمجھتا..... اک بوجھ سمجھتا ہے..... کبھی بھول کر بھی نہیں آتا..... اسے خبر ہی نہیں کہ ماں اس کی جدائی میں کتنا روتی ہے.....

جدا تو وہ نمانا (بیچارہ) بھی ہوگیا..... جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا..... نجانے وہ کہاں ہوگا..... ملکے نے تو اس کے ساتھ بڑا ہی جلم کیا..... مجھے اسے اپنی گود میں بھی نہ لینے دیا اور نہ ہی دودھ پلانے دیا..... نجانے اسے کہاں پھینک آیا..... ہائے اتنا چھوٹا بچہ..... کہاں گم ہوگیا..... ہائے میرے بچوں کو تو کسی کی نجر ہی کھا گئی..... سب ہی گم ہوگئے ہیں..... کوئی کہیں..... کوئی کہیں..... ہائے میں نے تو کسی کے ساتھ کبھی جلم نہیں کیا تھا..... اور تو نے میرے ساتھ اتنا بڑا جلم کردیا..... ملکا مجھے ہی الجام دیتا تھا کہ میں نے ایسا بچہ پیدا کیا.....تو بتا..... کیا اس میں میرا قصور تھا؟ کیا میں نے کوئی گناہ کیا تھا جس کی تو نے مجھے یہ سجا (سزا) دی..... ارے مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے..... کہ میں نے کیا کیا گناہ کیے ہیں؟

سورج کی تیز روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی..... پپو اور مجو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے کام پر چلے گئے.....

برکتے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھی جب سے اس کے کولہے کا آپریشن ہوا تھا وہ ٹانگ گھسیٹ کر مشکل سے چلتی تھی وہ گھر میں بیٹھ کر کڑھائی کا کام کرتی تھی۔ پپو، مجو اور وہ مل کر مشکل سے گھر کا خرچہ چلاتے تھے۔شوہر بھی ایسا ملا تھا جو بہت لالچی، خود غرض اور کمینہ انسان تھا جس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔اس نے کبھی ان لوگوں کی خبر نہ لی تھی.....

مٹھو کمائی کرنے بڑے شہر چلا گیا تھا..... اسے سال ہونے کو آرہا تھا مگر وہ کبھی کبھار آتا..... نہ ماں کو کوئی پیسہ دیتا اور نہ ہی بہن بھائیوں کو..... وہ شہر میں کہیں اچھی نوکری کرتا تھا مگر چھ سات ماہ سے وہ گھر نہیں آیا تھا..... برکتے نے مجو کو بہت پیغام بھیجے اور اس کا پتہ کرنے کو کہا..... اور وہ جو خبر لایا اسے سن کر برکتے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا..... جو کماتا تھا وہ نشے میں اڑا دیتا تھا..... اٹھتے بیٹھتے وہ اس کے لئے دعائیں کرتی تھی کہ وہ ٹھیک ہوجائے..... وہ اچھا خاصا اس کے پاس سے گیا تھا نجانے وہاں جا کر وہ کیوں بھٹک گیا۔

وہ کس کس کو روتی..... اس کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوتے تھے..... شبو کسی کے گھر کا کام کرتی تھی اچھے پیسے کما لیتی تھی مگر وہاں اس نے کسی ملازم کے ساتھ شادی کرلی..... وہ اس کے ساتھ کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ دونوں خوش تھے اور وہ کبھی کبھار برکتے سے ملنے آجاتی۔ برکتے کے پاس صرف پپو اور مجو تھے اور دونوں ہی معذور تھے مگر تھوڑا بہت کما لیتے تھے جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔زندگی کی گاڑی چل رہی تھی مگر اس گاڑی میں اس کے ساتھ سفر کرنے والے اس کے بچے گم ہوگئے تھے..... سب بکھر گئے تھے..... اور اس کی زندگی کا ساتھی ملکا..... اس نے کبھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی تھی..... بھاگی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا..... اسے نہ برکتے کی پرواہ تھی نہ بچوں کی..... اس کے نزدیک نہ رشتے اہم تھے اور نہ ہی انسان..... اسے اپنی زندگی، اپنی خوشیاں اور اپنا کھانا پینا عزیز تھا..... ایسے بے فکرے انسان کو نہ اولاد کے بچھڑنے کا غم تھا اور نہ ان کے مرنے کا۔ نہ کسی کے گم ہونے کا اور نہ ہی کسی کے معذور ہونے کا..... ایسے بے حس انسان کو دوسرے حساس انسان دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں جن پر نہ کسی کا کوئی دکھ اثر کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی آنکھ کا آنسو..... وہ اپنی ذات میں مگن رہنے والے چوپائے نما انسان، لاپرواہی سے

اپنا وقت گزارتے ہیں اور کچھ لوگوں کو دکھ اندر ہی اندر مار دیتے ہیں...... جیسے برکتے کو...... جس کی ہر سانس سے آہیں نکلتی تھیں...... اور بات بے بات آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے تھے...... دل ہر وقت پریشان رہتا تھا...... کس کے غم کو بھولے اور کس کو یاد کرے...... کچھ غم انسان بھلائے بھی نہیں بھول پاتا وہ اندر ہی اندر انسان کو دیمک کی طرح کھاتے رہتے ہیں اور انسان کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ برکتے ہر رات یونہی گزار دیتی اور صبح...... دوپہر شام...... وہ چہرے اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے...... اور ان کے دکھ کو وہ اپنے سینے میں اتارے بے دلی سے پھرتی رہتی...... کام کرتی مگر دل ہر دم پریشان رہتا...... تھک ہار کر خدا سے شکوے کرنے لگتی...... ہر رات اپنا ایک ایک دکھ اسے سناتی...... ایک ایک بات اس کے آگے دہراتی...... وہی باتیں کسی اور کو سناتی تو شاید وہ اکتا جاتا اور کبھی اس کی چوکھٹ پر نہ آتا...... مگر خدا کا حوصلہ بہت بلند ہے...... جو ہر انسان کے شکوے سنتا رہتا ہے...... خاموشی سے...... اور انسان اسے کہتے نہیں تھکتا۔ برکتے بھی ہر رات اسے سب کچھ سناتی اور وہ سنتا رہتا...... ”ربا...... تو ہم انسانوں کے ساتھ بہت برا کھیل...... کھیل رہا ہے۔ تو ہمیں رلاتا ہے...... مگر پھر بھی تجھے ہم پر رحم نہیں آتا...... کیسا بے پرواہ ہے تو...... ؟ ہمیں دنیا میں بھیج کر ہم سے بے نیاز ہو گیا ہے...... پتہ نہیں کس گناہ کی سزا کاٹ رہے ہیں...... عمر قید...... جو ختم ہی نہیں ہو رہی...... ٹھیک ہے...... تو خوش ہو لے......“ برکتے بے بسی سے آسمان کو دیکھ کر سسکنے لگی۔

حاضرین محفل کی آنکھیں برکتے کا دکھ سن کر اشکبار ہونے لگیں...... انہوں نے بڑی سرکار کی پُر عظمت اور شان و شوکت والی اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا...... وہ پرامید تھے کہ برکتے کے شکوے سن کر کوئی جواب آتا ہے...... مگر وہاں ہر طرف اطمینان کی فضا تھی...... روشنی کی چمک میں تھوڑا سا بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا...... وہ بدستور چمک رہی تھی...... جیسے مکمل طور پر مطمئن اور پُر اعتماد ہو...... حاضرین حیران ہونے لگے...... ان کے لئے یہ اطمینان انتہائی حیران کن تھا۔

☆

اچانک کسی کے سرپٹ بھاگنے سیٹیاں اور تالیاں بجانے ہانپنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سب نے حیرانگی سے اس جانب دیکھنا شروع کر دیا جہاں سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا...... فردوس میلے کچیلے کپڑوں میں، بوسیدہ سی پھٹی پرانی چادر لیے خستہ حال گھر سے نکلی تو محلے کے چھوٹے بڑے بچوں نے اس پر آوازیں کسنا شروع کر دیں...... وہ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے ”ہیجڑا“...... ”ہیجڑا“...... پکارتے چلے جا رہے تھے اور وہ پیچھے مڑ مڑ کر انہیں گالیاں دیتی ہوئی ان کے آگے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکے اس پر قہقہے لگا رہے تھے...... بچوں کو دیکھ کر پاس سے گزرنے والے مرد و زن بھی کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتے اور اس پر ہنستے...... کوئی ایک بھی نہیں تھا جو ان کو روکتا...... وہ تیز تیز قدموں سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ سامنے سے تین چار آوارہ لڑکوں کا گروپ آ رہا تھا وہ بری طرح ان سے ٹکرائی ایک نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگانا چاہا...... دوسروں نے چٹکیاں کاٹیں...... ایک نے اس کے سر سے چادر ہٹائی تو اس کی گندی، اکڑے بالوں والی وگ نیچے گر گئی...... اس کے نیچے سے اس کا گنجا سر نکل آیا۔ سب اس کے گنجے سر پر ہاتھ مار مار کر گنگنانے لگے اور ہنسنے لگے...... فردوس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا...... اپنی وگ سر پر رکھ کر وہاں سے

بھاگی......وہ سرپٹ بھاگتی رہی......اس کی سانس پھولنے لگی......اسے کافی عرصے سے دمے کا مرض لاحق ہوا تھا۔ وہ بے دم ہو کر گندگی کے ایک ڈھیر کے پاس گر گئی......اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور عجیب طرح کی گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے سینے کو زور سے بلایا۔ بمشکل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے کرتے کی جیب سے inhaler نکال کر منہ میں اسپرے کیا......تھوڑی دیر بعد اس کی سانس بحال ہونے لگی......وہ ڈھلتے سورج کی روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے وسیع وعریض زمین پر گندگی کے ڈھیر کے پاس چت لیٹی تھی اس کی آنکھیں آسمان پر مرکوز تھیں۔ زبان خاموش مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی جو آنکھوں سے بہتے ہوئے مٹی میں جذب ہو رہے تھے......اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

''اتنی ذلت......اتنی بے عزتی......اتنی رسوائی......تو سب دیکھ رہا ہے نا......اسی لئے ہمیں پیدا کیا ہے......ہمارا تماشا دیکھنے کو......ہمیں دنیا والوں کی نظروں میں ذلیل کرنے کو......تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا......؟

اس لئے کہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں......ہم پر طعنے کسیں ہم پر ہنسیں......ہمیں تنگ کریں......اور ہمیں ذلیل کریں......پتہ نہیں تو کیا چاہتا ہے......؟ کاش تجھ سے کبھی سامنا ہو تو ضرور پوچھوں گی......کہ تو نے ہمارے ساتھ کیسا بھیانک مذاق کیا ہے......ہم ادھورے انسانوں کو بنا کر تو نے ہم پر اپنی زمین اور اس کی خوشیاں بھی تنگ کر دی ہیں......انسانوں، جانوروں، پرندوں، چوپایوں اور درندوں کی بھی شناخت ہوتی ہے......ان کی بھی گروہ بندی ہوتی ہے......تو نے ہمیں صرف انسانوں کا ڈھانچہ دے کر ہمیں اندر سے کھوکھلے اور ادھورے انسان بنا کر ہمارے ساتھ کتنی بڑی زیادتی اور کتنا ظلم کیا ہے......کاش! تجھے ہمارے دکھوں کا اندازہ ہو......کاش! تو ہمارے صرف ایک دن اور ایک رات کا حساب رکھے تو تجھے پتہ چلے کہ تیری اس دنیا میں ہم جیسے نامکمل اور ادھورے انسانوں کا رہنا کتنا مشکل ہے......تو کیسا رب ہے......؟ تو کیسا اللہ ہے......تو کیسا خالق اور مالک ہے؟ جسے ہمارے دکھ درد کا ذرا بھی احساس نہیں......لوگ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں......تو دیکھ رہا ہے نا......اور......پھر بھی تو انہیں ہی نوازتا ہے......انہیں ہی رہنے کو اچھے گھر اور مال و دولت دیتا ہے......غربت، تنگی، مفلسی اور بے روزگاری تو ہمارے حصے میں آئی ہے......تو انہیں رشتے، ناتوں سے نوازتا ہے......اور......ہم سے ہمارے اپنے بھی چھین لیتا ہے......کوئی ہم جیسوں کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آتا ہے......تو کوئی سرِ راہ......جب دنیا والوں کو ہماری ضرورت نہیں تھی تو پھر کیوں ہمیں پیدا کیا......ہمیں ذلیل کرنے کو۔'' وہ سسکنا شروع ہو گئی اور بڑی مشکل سے اپنے بوڑھے وجود کو سہارا دے کر اٹھایا اور اٹھ کر چلنے کی کوشش کی مگر اس کی سانس ٹھیک طرح بحال نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی......نماز ختم ہونے کے بعد نمازی باہر نکل رہے تھے۔ جو کوئی بھی اسے سیڑھیوں میں بیٹھا دیکھتا اس کے چہرے پر حقارت اور ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوتے......جیسے انہیں اس کا وہاں بیٹھنا بہت برا لگ رہا ہو مگر شاید کچھ خدا کے خوف سے وہ اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتے......وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کبھی کبھار سر اٹھا کر اللہ کے بندوں کو دیکھتی ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر پھر سر جھکا لیتی......ان کی آنکھوں میں چھپی چبھن سیدھی اس کے دل میں نشتر چبھوتی وہ گھبرا کر آہ بھرتی......اور اٹھنے کی کوشش کرتی مگر اس میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔

''ارے......یہ ہیجڑا یہاں کیوں بیٹھا ہے......کیا اس کو پتہ نہیں کہ یہ اللہ کا گھر ہے......یہاں ناچ گانا نہیں ہوتا'' ایک شوخ مزاج آدمی

نے مسجد سے نکل کر چونک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے یہ بھی نماز پڑھنے آیا ہو'' دوسرے نے مذاقاً کہا۔

''یہ لوگ نماز بھی ناچ گا کر پڑھتے ہوں گے...... ان کو مسجد میں گھسا کر نمازیوں کا اخلاق کیوں خراب کرنا ہے...... اٹھاؤ اس کو یہاں سے...... حلیہ تو دیکھو اس کا...... یوں جیسے گندگی کے ڈھیر سے اٹھ کر آیا ہو...... مسجد میں پاک صاف ہو کر جاتے ہیں اور یہ تو خود ہی غلاظت کا ڈھیر معلوم ہو رہا ہے مسجد کو بھی ناپاک کر دے گا'' دوسرے تیز طرار آدمی نے کہا تو دونوں اسکی طرف چلے آئے اور اسے گھورنے لگے۔

''اوئے...... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو...... معلوم ہے کہاں بیٹھے ہو......؟ اٹھو یہاں سے...... اٹھو یہاں سے...... کسی اور جگہ جا کر بیٹھو...... مسجد کو گندا مت کرو'' دوسرے نے غصے سے کہا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی اور ان آدمیوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد دور کھڑی ہو کر مسجد کی طرف حسرت اور شکوے بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''دیکھ لیا...... تو نے......؟ یہ صرف تیرے بندے ہیں اور تو ان کا رب ہے، ہمارا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں...... تو بھی نہیں...... جب تو نے ہم پر رحم نہ کھایا تو پھر یہ کیوں ترس کھائیں...... تو نے ہمیں دھتکارا ہے...... تو پھر یہ کیوں ہمیں کچھ جانیں...... پتا نہیں زندگی کا یہ عذاب کب تک سہنا پڑے گا...... اچھا ہوا نرگس مر گئی...... بے بی مر گیا اور میں زندہ رہ گئی...... لوگوں کی گالیاں اور مار کھانے کو......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... وہ کتنی ہی دیر روتی رہی...... اور پھر اٹھ کر یونہی ادھر ادھر گھومنے لگی...... اسے بہت بھوک بھی لگ رہی تھی...... مگر اس کی جیب میں ایک روپیہ بھی نہ تھا کہ وہ کچھ خرید کر کھا سکتی...... اس نے ایک شاپنگ سنٹر کا رخ کیا...... وہاں اکثر عورتوں سے بھیک میں چند سکے مل جاتے تھے اور عورتیں شاید ان کے لئے نرم گوشہ رکھتی تھیں...... وہ ہیجڑوں کے ساتھ ویسی بدتمیزی نہیں کرتی تھیں جیسا کہ مرد کرتے تھے...... اسے بھیک میں چند روپے مل گئے اور اس نے ان سے پکوڑے اور روٹی خرید کر کھالی۔

وہ حسرت بھری نگاہوں سے خواتین کو شاپنگ بیگ اٹھائے، ہنستے مسکراتے، اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے دیکھنے لگی...... کچھ کے ساتھ ضد کرتے اور روتے چلاتے بچے بھی تھے۔ وہ حیرت سے سب کی طرف دیکھتی کبھی عورتوں کی طرف تو کبھی بچوں کی طرف......

''تم لوگ کتنی خوش نصیب ہو...... جنہیں رب نے کتنا کچھ دیا ہے...... خوبصورت گھر...... شوہر، بچے، خاندان...... رشتے دار...... بہن بھائی...... دوست...... اور...... ہمیں...... ان میں سے کچھ بھی نہیں......'' اس نے آہ بھری اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''اچانک ایک ماڈرن سا لڑکا اپنی کار سے نکلا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت سا چھوٹا سا کتا تھا...... جس کے سفید ریشم جیسے بال ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر ہل رہے تھے...... اس لڑکے نے باہر نکل کر اسے گود میں اٹھایا...... اسے پیار کیا اور سنٹر کے اندر چلا گیا...... فردوس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کتے کی طرف دیکھا۔

''ہم سے تو اچھے یہ کتے ہیں...... جنہیں انسان پیار کرتے ہیں...... ہماری اوقات اتنی بھی نہیں کہ کوئی جانوروں جتنی توجہ بھی ہمیں دے سکے...... اپنے اپنے نصیب کی بات ہے......'' وہ کتنی ہی دیر ادھر بلاوجہ بیٹھی سوچتی رہی...... اور پھر بوجھل قدموں سے اٹھ کر بھیک مانگنے لگی...... شام

گہری ہونے تک اس نے چند پیسے اکٹھے کر لیے تھے جن سے رات کا کھانا کھا سکتی تھی...... وہ رات گئے گھر جا رہی تھی تو ایک لڑکا راستے میں مل گیا۔

''اے فردوس...... آج شام کو ہمارے گھر شادی ہے...... آ جانا'' لڑکے نے کہا۔

''اے مبارک ہو...... کس کی شادی ہو رہی ہے؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''میرے بھائی کی......'' لڑکے نے جواب دیا۔

''تو فکر نہ کر...... میں پہنچ جاؤں گی......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اور...... سن...... اچھے کپڑے پہن کر آنا...... امیر لوگوں نے آنا ہے...... میرا مطلب سمجھ گئی ہونا'' لڑکے نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ارے تو فکر ہی نہ کر...... ایسی چھمک چھلو بن کر آؤں گی...... سب دلہن کی بجائے مجھے ہی دیکھیں گے'' فردوس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں جا رہا ہوں...... تم آ جانا'' لڑکا کہہ کر مسکراتا ہوا چلا گیا...... اور اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک چمکدار جوڑا...... میک اپ، زیورات، چوڑیاں، لمبے بالوں والی وگ نکالی...... جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی...... اپنے بوڑھے اور جھریوں زدہ چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی۔ خوشی خوشی گنگناتے ہوئے میک اپ کی تہیں چہرے پر جمانے لگی...... تیار ہو کر اور وگ پہن کر اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بجائے کوئی اور کھڑا ہو...... اس سے اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

''انسان کیسے کیسے روپ بدلتا ہے...... ایک چہرے پر دوسرا چہرہ...... آنسوؤں کے ساتھ ہنسی...... غمی دل کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ...... اصل انسان کہاں ہے؟'' اس نے آہ بھر کر سوچا...... آج جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا...... تقریباً ہر روز ہوتا تھا پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ وہ پھر سے پر امید ہو کر نیا دن گزارنے پر آمادہ ہو جاتی تھی...... انسان بھی کتنا ناقابل اعتبار ہے...... لمحوں میں بدل جاتا ہے...... کبھی ایک دم مایوس ہو جاتا ہے...... تو کبھی اچانک ہی پر امید ہو کر پر عزم...... اس نے اپنے سارے غم اور دکھ کہیں وقتی طور پر چھپا دیے تھے اور پر امید ہو کر تیار ہو رہی تھی...... تیار ہو کر اس نے اپنے آپ کو مسکرا کر دیکھا اور نادانستہ پرفیوم پکڑ کر اپنے اوپر چھڑکاؤ کیا...... اسے یاد ہی نہ رہا کہ ڈاکٹر نے اسے تیز پرفیوم لگانے سے منع کیا تھا اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی اور اس کی سانس خراب ہونے لگی...... اس نے پھر inhaler نکالا اور اسپرے کیا...... تو اس کی طبیعت بہتر ہو گئی......

اس نے خاموشی سے وگ اتاری...... میک اپ کی تہیں صاف کیں اور کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گئی......

''میں اب مزید نہیں ناچ سکتی...... میرا جسم ہار گیا ہے...... میری سانس اب میرے جسم کا ساتھ نہیں دیتی......'' اس نے بے بسی سے سوچا۔

اسے یاد آنے لگا...... چند روز پہلے جب وہ ایک شادی پر ناچ رہی تھی اچانک اس کی سانس اکھڑ گئی تھی اور وہ بے دم ہو کر گر پڑی تھی...... سب لوگ اسے لعن طعن کرنے لگے کہ اگر وہ بیمار تھی تو کیوں آئی...... سب لوگوں نے اسے بہت ذلیل کیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے وہاں سے چل کر آئی تھی۔

''فردوس اب تجھ میں ہمت نہیں رہی...... تو بوڑھی ہو گئی ہے۔ تیرا جسم بیمار ہو گیا ہے...... میں اپنے آپ کو کتنی امیدیں دلاؤں...... کتنا حوصلہ دوں...... مگر اب میں ہار گئی ہوں...... جب تو ہرانے پہ آتا ہے تو انسان ہارتا ہی چلا جاتا ہے...... اور جب تو ذلتوں کے ہار گلے میں پہنا کر بھیجتا

ہے تو پھر انسان کو عزت کہاں سے ملتی ہے...... میں اپنے ٹوٹے دل، بیمار جسم اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ کب تک ماری ماری پھرتی رہوں گی...... بھیک مانگتی رہوں گی...... میں ہار گئی ہوں...... بہت بے بس ہو گئی ہوں'' اور اس نے اپنی وگ پکڑ کر اس کا ایک ایک بال نوچ ڈالا...... سارا میک اپ توڑ دیا اور چمکیلے دوپٹے کو تار تار کر دیا...... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

''اب تو بس کر دے...... کہ مجھ سے سانس لینا مشکل ہو رہا ہے......''

اس کی سسکیاں اور آہیں بلند ہونے لگیں۔ بڑی سرکار کے دربار میں موجود حاضرین کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور کچھ نے انسانوں کے اس دکھ کو محسوس کرتے ہوئے گہری سانسیں لیں...... ہر طرف ایسی خاموشی چھائی تھی جو سب کو ڈس رہی تھی اس خاموشی میں کرب اور دکھ کا ملا جلا احساس تھا۔

کچھ حاضرین نے بڑی سرکار کے خیالات واحساسات جاننے کے لئے اس مخصوص روشنی کی طرف دیکھا...... روشنی کی لو قدرے دھیمی ہو گئی تھی جیسے کسی کے دکھ کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے کوئی دکھی ہو جاتا ہے...... شاید اس احساس سے ہی سارا ماحول افسردہ ہو گیا تھا...... شاید بڑی سرکار کو بھی دکھ ہو رہا تھا...... یہ دیکھ کر...... جو انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کر رہے تھے......

سب نے گہری سانس لی۔ ہر طرف سوگواری سی محسوس ہونے لگی۔

☆

اچانک کسی کے آہوں کی صدا سنائی دینے لگی......

سب چونکے اور اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا جہاں سے آہیں بلند ہو رہی تھیں۔

آدھی رات کا وقت تھا...... ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی کیونکہ آج چاند نمودار نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے جنہوں نے چاند کو بھی چھپا دیا تھا...... شاید آسمان کا دل بھی زمین والوں کے دکھ دیکھ دیکھ کر بادلوں سے بھر گیا تھا اور بھرپور انداز میں بارش برسا کر اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ شامو پارلر سے لوٹا تھا...... وہ بہت تھکا ہوا تھا مگر پھر بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سینے میں عجیب سی گھٹن محسوس کر رہا تھا...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس بند ہو رہی ہو...... وہ اپنے محل نما گھر کے وسیع وعریض لان میں چکر لگانے لگا۔ اس کا دل بہت افسردہ ہو رہا تھا اور وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا لمبی آہیں بھر رہا تھا......

''مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں...... کہ تو نے مجھے کچھ نہیں دیا...... تو نے مجھے بہت کچھ دیا ہے...... بہت کچھ...... مگر یہ سب کچھ میرے لیے کتنا بے معنی ہے شاید تمہیں بھی اس کا اندازہ ہے...... اتنے بھرے گھر میں میرا ادھورا اور خالی وجود کیا معنی رکھ سکتا ہے...... میں اپنے آپ کو ٹیبل پر رکھے ایک ڈیکوریشن پیس سے بھی زیادہ اہم نہیں سمجھتا...... وہ ڈیکوریشن بھی کسی شے کی شان بڑھاتا ہے...... اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے اور میں...... میں کیا ہوں؟ کیوں ہوں...... ؟ اور کس لئے ہوں...... ؟ میرا وجود کسی کے لیے اہم نہیں...... یہ سوالات مجھے ہر وقت اندر ہی اندر کتنا دکھ دیتے ہیں...... شاید کوئی اس دکھ کو محسوس کر سکے...... میں ہنر سیکھ کر سمجھتا تھا کہ میں اہم ہو گیا ہوں...... جب لوگوں کو میری ضرورت محسوس ہوتی تو میرے اندر میری اہمیت کا احساس پیدا ہونے لگتا کہ میں لوگوں کی ضرورت بن گیا ہوں...... ان کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ

احساس ہونے لگا ہے کہ نہیں...... میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اگر میں آج دنیا سے چلا جاتا ہوں...... تو...... کل کو سب مجھے بھول جائیں گے اور بس...... میری کہانی ختم......" اس نے گہری سانس لی۔ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی اور وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ شیشے کی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بارش انتہائی تیز تھی...... ہر طرف جل تھل ہو گیا...... ایسی ہی بارش اس کے اندر بھی ہو رہی تھی...... آج اس کا دل بہت بری طرح ٹوٹا تھا...... وہ جو بہت عرصے سے مثبت سوچنے کی کوشش کر رہا تھا...... اچانک کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا تھا...... وہ اپنی ذات کی پرچھائیں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا...... اپنے آپ کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا تھا...... اور...... دن رات اپنے آپ کو بھلا کر زندگی کا حصہ بننے کی جدوجہد کر رہا تھا...... اچانک ٹوٹ گیا تھا...... ایسا وہ کئی بار ٹوٹا تھا...... جب وہ چودہ سال کی عمر میں اپنے گھر والوں کو تلاش کر کے انہیں ملنے گیا تھا...... اس کے بہن بھائیوں نے اسے دروازے سے ہی دھتکار دیا تھا......

"ہمارے گھر کبھی کوئی ہیجڑا پیدا نہیں ہوا...... اور...... تم کیا سوچ کر آئے ہو...... کہ...... ہم کسی ہیجڑے کو اپنے گھر گھسنے دیں گے...... یہ ہمارا گھر ہے کوئی تھیٹر نہیں...... جہاں تم اپنے ناچ گانے اور پھکڑ بازی سے ہمارا دل بہلاؤ گے...... بھاگو یہاں سے...... اور یہاں کبھی نہ آنا......"

اس کے بڑے بھائی نے غراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی ماں سے ایک بار ملنے تو دو...... جب سے آنکھ کھولی ہے ماں کو دیکھنے کو ترس گیا ہوں" شامو نے روتے ہوئے کہا۔

"خبردار...... جو ماں کا نام لیا...... نجانے کون ہو...... اور...... کہاں سے آئے ہو...... یہاں تمہاری ماں نہیں رہتی" اس کے بھائی نے غصے سے کہہ کر دروازہ بند کر دیا...... اور وہ کرچی کرچی دل اور بہتی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے لوٹ آیا اور دوسری بار جب نرگس نے اسے گھر سے نکالا تھا...... کہ وہ اب اس کو مفت میں روٹی نہیں کھلا سکتی کیونکہ وہ اس کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ رات اس کی زندگی کی بھاری ترین رات تھی...... اسے تب سمجھ آگئی تھی کہ اسے زندگی کا سفر تنہا ہی کاٹنا ہے...... اسکی زندگی میں اس کا ساتھ دینے والا...... اس سے محبت کرنے والا...... اس کے لئے کچھ محسوس کرنے والا کوئی نہیں...... مگر استاد جمالے سے ملنے کے بعد اس کا ذہن اور سوچ بدلنی شروع ہو گئی...... کہ انسان کی زندگی میں سگے رشتے ہی نہیں...... غیر لوگ بھی اہم ہوتے ہیں...... اور جو کسی کے لئے دکھ درد محسوس کرے...... وہی اپنا ہوتا ہے...... وہی دل کے قریب ہوتا ہے...... اور وہ ہر دکھی انسان کی آگے بڑھ کر مدد کرتا تھا...... ہر ایک سے محبت سے بات کرتا تھا...... لوگ اس سے محبت کرنے لگے تھے...... انسانیت سے محبت کا جذبہ اسے دوسرے انسانوں کے قریب لا رہا تھا...... وہ اپنے ادھورے پن کو بھولنے لگا تھا خود کو انسان سمجھنے لگا تھا......

مگر......

آج...... وہ پھر وہیں کھڑا ہو گیا تھا...... جب چودہ سال کی عمر میں وہ دھتکارا گیا تھا...... تب سگے رشتوں نے دھتکارا تھا اور آج انہوں نے...... جو...... غیر تو تھے مگر جنہیں وہ اپنا سمجھتا تھا...... ایسی دھتکار وہ رانی کے ہاتھوں بھی سہہ چکا تھا مگر رانی کی بات اور تھی...... رانی نے اسے محبت کے راستے پر ڈالا تھا اور اس کی زندگی بن گئی تھی وہ انسانیت کے رشتے پر یقین کرنے لگا تھا...... مگر آج وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا جس پر اس کو بڑا ناز تھا...... پارلر میں ایک جواں سال لڑکی روزی کو پارلر میں نوکری کرتے ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے...... وہ جب سے پارلر میں آئی، ہر وقت روتی

رہتی تھی کیونکہ اس کے باپ کو ٹی بی کا مرض لاحق تھا اور وہ ہر وقت اپنی غربت اور باپ کی بیماری کی وجہ سے دکھی اور غمگین رہتی تھی...... شمی اسے دیکھ کر بہت افسردہ ہوتا تھا ہر روز چپکے سے اسے پیسے تھما دیتا تھا...... وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ اسے مسکرا کر کہتا۔

''کہ تم میری چھوٹی بہن ہو......'' تو وہ مسکرا دیتی۔

وہ پارلر میں آتے ہی اپنے گھر کی ساری باتیں اسے بتاتی...... اس کے باپ کو رات بھر کتنی تکلیف تھی اور وہ کس طرح رات بھر جاگتی رہی۔ اس کی ماں مرچکی تھی صرف دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا...... روزی کے علاوہ ان کا کمانے والا اور کوئی نہ تھا...... شمی کی ہر روز کی مدد سے روزی کی پریشانی کافی کم ہوگئی تھی...... روزی اس کے لئے گھر سے کھانا بنا کر لاتی، اسے محبت سے بھائی کہہ کر بلاتی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا...... دونوں میں کافی دوستی ہونے لگی تھی...... جو اکثر لڑکیوں کو کھٹکتی تھی...... شمی کو اسلم نے کسی کام کے سلسلے میں اپنے آفس بلایا تھا۔ وہ پارلر میں نہیں تھا...... وہ پورے پارلر کا انچارج تھا۔ اسلم نے اس کی ترقی کردی تھی۔ اب وہ صرف امیر اور انتہائی اہم و مشہور خاندان کی خواتین کا میک اپ اور کٹنگ کرتا تھا...... ورنہ اس سے پہلے وہ پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں کی نگرانی کرتا...... وہ بہت احسن طریقے سے پارلر چلا رہا تھا۔ اسلم اس سے بہت خوش تھا...... شمی کی موجودگی میں اکثر لڑکیوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا...... اس کا ایک مخصوص کیبن تھا جہاں ٹی وی پر سارے پارلر کی کارکردگی کیمروں کے ذریعے دکھائی جاتی تھی اور شمی وہاں بیٹھ کر سب کو آبزرو کرتا رہتا تھا...... جب ضرورت محسوس کرتا تو باہر جاتا ورنہ اندر ہی بیٹھا رہا......

''شمی پارلر سے باہر گیا ہے......'' ایک لڑکی نے بتایا۔

''اچھا...... کب......؟'' دوسری نے پوچھا۔

کافی دیر ہوگئی ہے۔ دوسری نے جواب دیا اور دونوں اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں...... اور تھوڑی دیر بعد فارغ ہوکر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئیں...... لاؤنج کی ایک کھڑکی شمی کے کیبن میں کھلتی تھی اور اکثر وہاں ہونے والی گفتگو شمی کے کیبن میں سنی جاتی تھی...... شمی پچھلے دروازے سے کیبن میں آکر بیٹھا ہی تھا...... کہ باہر سے مختلف آوازیں اسے سنائی دیں۔

''ہیلو...... روزی...... کہاں سے آرہی ہو؟'' صوفے پر بیٹھی ایک لڑکی نے پوچھا۔

''ابو کو ہاسپٹل لے کر گئی تھی'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اب وہ کیسے ہیں......؟'' دوسری نے پوچھا۔

''بہتر ہیں...... کیا شمی بھائی اپنے کیبن میں ہیں؟'' روزی نے پوچھا۔

''نہیں...... اور...... سنو...... تم انہیں شمی بھائی، مت کہا کرو'' دوسری لڑکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' روزی نے چونک کر پوچھا۔

''کیا تمہیں کچھ معلوم نہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں......'' روزی نے معصومیت سے جواب دیا۔

"یہ تو انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ وہ بھائی ہیں یا بہن" دوسری لڑکی نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

"ک......کیا......مطلب......؟" روزی نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی......وہ......ہیجڑا ہے" لڑکی نے رازدارانہ انداز میں قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"ک......کیا......مطلب......؟" روزی کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہونے لگی۔

"یہ بالکل سچ بات بتا رہی ہوں......یقین نہ آئے تو اپنے بھائی سے ہی پوچھ لینا......تمہیں تو وہ سگی بہن سمجھتے ہیں" بیچارے" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تو روزی دم بخود وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"چلو اب چلتے ہیں......لیڈیز ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی" وہ دونوں لڑکیاں اندر چلی گئیں اور روزی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو شمی کو آدمی نہیں فرشتہ سمجھتی تھی اور وہ تو آدمی بھی نہیں نکلا تھا......اس کا مطلب ہے میں ایک ہیجڑے کی کمائی سے اپنے باپ کا علاج کراتی رہی اسے کراہت سی محسوس ہونے لگی اور وہ بوجھل قدموں سے پارلر کے اندر چلی گئی۔

شمی نے ساری باتیں سن لی تھیں اور اس کا دل بری طرح ٹوٹا تھا......وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ یہاں پر کام کرنے والے سب لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں......اس سے محبت کرتے ہیں......اسے انسان سمجھتے ہیں......اور اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھتے تھے اور اس پر کس طرح ہنستے تھے......وہ پریشان سا سر جھکا کر بیٹھا تھا جب روزی اس کے کیبن میں داخل ہوئی، اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"آؤ......روزی......کیسی ہو......؟ اور تمہارے ابو کیسے ہیں؟" شمی نے اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں......اور......یہ آپ کے پیسے......باقی جو آپ نے میری مدد کی......میں وہ سب جلد لوٹا دوں گی......" روزی نے نم آنکھوں سے کہا۔

"کیا مطلب......اور یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے کچھ واپس لینے کی خاطر تو تمہاری مدد نہیں کی تھی......اور میں نے مدد بھی نہیں کی......میں تو تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کسی ہیجڑے کی بہن نہیں ہوں......اور......نہ ہی کسی ہیجڑے کی کمائی سے اپنے باپ کا علاج کرانا چاہتی ہوں......میں......یہ پارلر چھوڑ کر جا رہی ہوں......ہمیشہ کے لئے......آپ کے پیسے آپ تک پہنچ جائیں گے" روزی کہہ کر اس کے کیبن سے نکل گئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ روزی نے اس کے چہرے پر ایسا طمانچہ مارا تھا کہ اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے......اس طمانچے کی جلن وہ اپنی روح میں محسوس کر رہا تھا......اس کا دل خون کے آنسو بہانے لگا۔ اس نے بہت مشکل سے پارلر میں وقت گزارا اور گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا......اتنا رویا کہ اس کی سانس رکنے لگی......مگر آنسو کسی طرح تھم ہی نہ رہے تھے۔ وہ آنکھیں جھپکاتا تو آنسو گر پڑتے جیسے پلکوں میں کہیں جمع ہو گئے تھے......اور آنکھوں کی ذرا سی جنبش سے وہ تڑپ کر آنکھوں سے گر پڑتے تھے......

"ہم کیسے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں......جن کا نہ کوئی بننا چاہتا ہے اور نہ ہم کسی کو اپنا سکتے ہیں......زندگی میں رشتے کتنے انمول ہوتے

ہیں......اور کتنے اہم......اور ہمارے پاس رشتے ہی نہیں......اور زندگی بھی ادھوری......شاید ہمارے خالی اور کھوکھلے وجود رشتوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے تھے اس لیے خدا نے ہمیں رشتوں سے محروم رکھا۔

''یا اللہ! یہ تو نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے......؟ ہم کو کہاں کہاں رسوا کرتا ہے......؟

ہمارے پاس کچھ ایسا نہیں کہ ہم اپنے آپ پر سے یہ رسوائیاں مٹا سکیں......

ہم کیا کریں......؟

کہاں جائیں......؟

کس سے مانگیں......؟

کون ہے جو ہماری سنے......؟

اور ہمارے دکھ کو محسوس کر کے ہمارے زخموں پر مرہم رکھے......چند بول تسلی کے بولے......ہمارے ٹوٹے دلوں کو جوڑے......ہماری شکستہ روحوں کے دکھ کو محسوس کرے......

کاش! کوئی تو سنے

مگر

کون سنے گا جب تو نہیں سنتا......؟

کون سمجھے گا جب تو نہیں سمجھتا......؟

کون محسوس کرے گا جب تو ہمارا احساس نہیں کرتا......؟

اس کی آہیں......سسکیاں اور آنسو شدت اختیار کرنے لگے۔ آسمان بھی پورے جوش وخروش سے برس رہا تھا جیسے اس کے غم پر کھل کر رو رہا ہو۔

بڑی سرکار کے دربار میں موجود حاضرین نے بھی گہری سانسیں لیں......اور ان کی آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو گئے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی......

متبرک روشنی کی لو بھی مدہم ہونے لگی......جیسے وہ بھی ان کے دکھ سن کر افسردہ ہو رہی ہو۔

مگر ہر جانب مسلسل خاموشی طاری تھی۔

(۴)

کئی روز سے شدید حبس ہو رہا تھا...... گرمی اور حبس سے ہر کوئی پریشان ہو رہا تھا...... زیتون بانو کا دل کمرے کی گھٹن سے بری طرح گھبرا گیا تھا اور وہ صحن میں چار پائی پر سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی...... رات...... آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آسمان پر چاند اور ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی اور ہو کا عالم تھا کہیں کہیں سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں رات کی ہولنا کی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ زیتون بانو کو نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ شاہ زیب کو اس سے جدا ہوئے دس سال ہو گئے تھے مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا اس کا اکلوتا بیٹا...... جسے اس نے بہت منتوں، مرادوں سے خدا سے لیا تھا۔ بہت محبت سے اس کی پرورش کی تھی جسے دیکھ دیکھ کر وہ جیتی تھی...... جس کی ایک خوشی کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ اس کی آنکھ کا ایک آنسو اسے کتنا پریشان کر دیتا تھا...... اور اس کے وجود کی خوشبو سے اس کا گھر مہکتا تھا...... جس کی درازی عمر کے لئے وہ ہر لمحہ دعائیں مانگتی تھی...... وہ اسے روتا تڑپتا چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا تھا۔ اس کی جوان میت کا منظر اس کی آنکھوں سے محو نہیں ہوتا تھا...... وہ صرف چالیس سال کی زندگی لکھوا کر لایا تھا...... اتنی مختصر زندگی...... اور وہ بھی اتنی اذیت ناک......

زیتون بانو کو اگر دکھ تھا...... تو...... یہی...... کہ شاہ زیب کو اتنی تھوڑی زندگی ملی اور وہ بھی اذیتوں سے پر...... اتنا خوبصورت...... نیک اور پارسا انسان...... خوبصورت دل و دماغ کا مالک...... کیسے کیسے دکھ اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اسے زندگی کا کوئی سکھ نہ ملا تھا...... خوشیاں بھی ادھوری ملیں اور خواہشات گویا اس کے اندر تھیں ہی نہیں...... اس نے کبھی کوئی خواہش نہیں کی تھی...... بچپن میں بھی کبھی کسی شے کے لئے ضد نہیں کی تھی...... زیتون بانو اور اس کے شوہر کو حسرت ہی رہی کہ کبھی وہ کسی شے کے لئے ضد کرے اور اس کی ضد پوری کرنے کے لئے پریشان ہوں۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے کس کس طرح زیتون بانو کی دلجوئی کی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ وہ اسے کبھی تنہا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کی ضروریات کا خود خیال رکھتا...... اور وہ اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھی۔

"میری...... کوئی دعا بھی اسے نہ لگی" زیتون بانو نے آسمان کی جانب دیکھا اور سسکنے لگی۔

نہ اس کا گھر بسا...... نہ اچھی گھر والی ملی...... جس نے اسے اپنے قریب ہی نہ آنے دیا...... کتنا صبر تھا...... شاہ زیب میں...... کہ اس نے ماں کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور اپنی بیوی کا بھرم قائم رکھا......

نجانے...... وہ کیسی عورت تھی...... جس کو شاہ زیب جیسے انسان میں کوئی خوبی نظر نہ آئی...... وہ بڑی ہی بے وفا نکلی...... شاہ زیب اس سے وفا نبھاتا رہا اور وہ بے وفائی کی آخری حد تک چلی گئی...... اپنے محبوب کو شوہر کے مقابلے میں کھڑا کر دیا...... ایسی ظالم عورت بھی بھلا کوئی ہو سکتی ہے...... کاش مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں اسے ایک دن بھی اپنے گھر نہ رہنے دیتی مگر یہ شاہ زیب کا ظرف تھا کہ پہلے دن سے ہی اس کی دھتکار

خاموشی سے سہتا رہا اور اف تک نہ کی۔ خدا کرے...... تم کبھی سکھی نہ رہو...... تم اسی اذیت میں سے گزرو...... جس اذیت میں سے میرا بیٹا گزرتا رہا ہے۔ تم نے اس کو بے نام ونشان کیا...... تمہاری جگہ کوئی اچھی عورت ہوتی تو شاہ زیب کے نام کی مالا جپتی رہتی مگر تم تو بڑی ہی کٹھور نکلیں...... نجانے تم کس مٹی سے بنی تھیں......'' زیتون بانو چمکتے ستاروں کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔

''اور...... مولا...... تم نے بھی تو اس کے ساتھ اچھا نہ کیا...... ایسی بدتر عورت اس کے نصیب میں لکھی...... جس نے اس کی ذرا سی بھی قدر نہ کی...... اور نہ اسے محبت دی...... اور...... پھر...... تو نے اس کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی...... وہ کتنا بے بس اور مجبور ہو گیا تھا...... چلتے ہوئے جب ٹھوکریں کھاتا تھا تو میرا دل بری طرح کٹتا تھا...... وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے کتنا محتاج ہو گیا تھا کیا اچھے انسانوں کو ایسی سزائیں دی جاتی ہیں...... اس نے کیا گناہ کیے تھے جو تو نے اسے یہ سزائیں دیں......

آنکھوں کی روشنی جانے کے بعد وہ ایسا خاموش ہوا کہ مجھ سے بھی کوئی بات نہ کرتا تھا اور یونہی چپ چاپ اس نے دنیا چھوڑ دی......

مجھ سے اس کی موت کا صدمہ برداشت نہیں ہوتا...... میں کیا کروں...... جب اتنی زمین جائیداد اور مال ودولت دیکھتی ہوں...... اور ان سب کا کوئی وارث نظر نہیں آتا تو میرا دل کتنا دکھی ہو جاتا ہے...... بہرام خان بھی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ شہر میں جا آباد ہوا ہے...... وہ کبھی کبھار گاؤں آتا ہے اور میں اسے کوئی حق بھی نہیں جتلا سکتی...... کیسے کہوں اس کی اپنی زندگی ہے...... میں اتنی بڑی حویلی میں کب تک ملازموں کے ساتھ زندگی گزاروں گی...... کون اس حویلی اور جائیداد کا وارث ہوگا...... کون یہ سب سنبھالے گا...... کیا کروں...... کس کو سب کچھ سونپ دوں...... تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے...... کوئی راستہ نظر نہیں آتا......؟

زیتون بانو چارپائی سے اٹھ کر سسکنے لگی۔

یا اللہ! تجھ سے کیسے...... تیرا رحم طلب کروں...... اور کیا مانگوں......؟ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے تو نے مجھ بڑھیا کا آخری سہارا چھین کر میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے......

تو کیسا مالک ہے......؟ کیسا رب ہے......؟ جو اپنے بندوں کو یوں بے آسرا کر کے خاموشی سے ان کا تماشا دیکھتا رہتا ہے...... اب کوئی راہ بھی دکھا...... کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ سجھائی نہیں دیتا...... کوئی تو میرے بیٹے کی یاد کو زندہ رکھنے والا ہوتا کوئی تو اس کا نشان باقی رکھتا...... کوئی تو اس کی قبر پر پھول ڈالنے اور دعا کرنے والا ہوتا......؟ کوئی تو ہوتا......؟

زیتون بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس کی آہیں...... سسکیاں...... اور دل سے بلند ہوتی صدائیں...... خاموشی کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی بڑی سرکار کے شاہی دربار میں پہنچ گئیں...... جہاں تمام نوری مخلوق حیرت اور دکھ سے زیتون بانو کی آہ وبکا سن رہی تھی...... انہوں نے سفید روشنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی تاب نہ لا سکے...... وہ بڑی سرکار سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر ابھی انہیں کچھ پوچھنے کا اذن نہیں ملا تھا اس کے لئے وہ خاموش رہے...... مگر انسانوں کی اکثریت کے دکھ اور ان کے شکوے شکایات سن کر وہ بہت مضطرب ہو گئے...... اور بڑی سرکار کا اپنے انسان کو شاہکار کہنے کا دعویٰ مشکوک لگنے لگا۔

☆

شام ہوتے ہی نازی اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی۔اسے شدید ڈپریشن ہورہا تھا...... بہت سالوں کے بعد کسی نے اس کے زخموں کو کریدا تھا...... کئی سالوں سے اس نے اپنے زخموں کو رسنے سے روک رکھا تھا۔آج وہ پھر ہرے ہوگئے تھے اور ان سے خون بہنے لگا تھا۔ان رستے زخموں پر اب کوئی مرہم لگانا مشکل ہورہا تھا...... بہت عرصے بعد اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں تھیں...... ورنہ جب سے وہ حشمت خان کی حویلی واپس آئی تھی اور حشمت خان کی موت کے بعد اس نے زمینداری سنبھالی تھی...... وہ ایک ظالم و جابر زمیندارنی کے روپ میں دنیا کے سامنے آئی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔وہ کیا سے کیا ہوگئی تھی...... وہ خوبصورت،نرم و نازک دوشیزہ سے ایک خوفناک اور سفاک عورت میں بدل چکی تھی۔اس کی پورے گاؤں میں اس قدر دہشت پھیل چکی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر چڑی کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ ہوتی تھی...... وہ حشمت خان سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئی تھی شاید کرداری کی یہ خامی اسے حشمت خان سے ورثے میں ملی تھی...... شاید سفا کی اس کے جینز میں شامل تھی جسے اظہار کا موقع اب ملا تو وہ باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔حشمت خان تو اپنے نافرمانوں کو ایسا غائب کراتا تھا کہ ان کی خبر نہ ملتی تھی اور نازی اپنے سامنے نافرمانوں کو انتہائی دردناک اذیتیں دے کر انہیں قتل کرادیتی اور خوش ہوتی...... ان کی لاشوں کو ایسے ٹھکانے لگاتی کہ ان کا نام و نشان تک نہ ملتا۔اس نے ظلم و بربریت کی ایسی فضا قائم کررکھی تھی جس میں گاؤں کے ہر فرد کے لئے سانس لینا مشکل ہورہی تھی...... لوگ اس کے خلاف بولتے نہ تھکتے تھے مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔اسے سرعام بددعائیں دیتے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی...... اس کے سامنے کسی کو جرأت نہ تھی کہ اونچی آواز میں بات کرسکے۔اس کے ساتھ ہروقت ڈاکو نما کارندوں کا مسلح دستہ اس کے اشارے پر غارت گری کے لئے تیار رہتا...... وہ خود کتنے بے بس و بے گناہ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرچکی تھی...... اس کی پستول کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا...... زمینوں کی دیکھ بھال...... مزارعوں پر ظلم و ستم کے علاوہ...... گاؤں کی کسی لڑکی یا لڑکے کو محبت کی پینگیں بڑھانے کا حق نہیں دیا گیا تھا...... اس کے ڈر سے کئی نوجوان محبت کی راہوں پر قدم رکھنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آتے۔دل کی خواہشات اور ارمان دل میں ہی دبے رہ جاتے کئی آنکھوں نے سہانے خواب دیکھنے سے پہلے ہی محبت کے جگنوؤں کو اپنی آنکھوں سے نوچ ڈالا تھا...... کئی دلوں کی ان کہی اور ان سنی باتیں...... سلگتے ارمانوں میں بدل چکی تھیں...... وہ محبت کی ایسی بدتر دشمن ثابت ہوئی تھی کہ کسی کی محبت کے بارے میں خبر ملتے ہی اسے کٹہرے میں کھڑا کردیتی اور اسے ایسی سزا دیتی کہ وہ دوبارہ محبت کا نام لینا ہی بھول جاتا...... محبت اک سزا بن گئی تھی......؟ اور وہ اس سزا کی اذیت سے لطف اندوز ہوتی۔

اس کی ماں مرچکی تھی...... پورا گاؤں...... حویلی اور مال و دولت پر اس کا قبضہ تھا۔دونوں بہنیں بیرون ملک مقیم تھیں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا...... وہ جو چاہتی...... کرتی...... جو کچھ سوچتی...... اس پر عمل کر دکھاتی۔اس نے اپنی ذات سے نسوانی خواہشات اور نسوانیت بالکل ختم کردی تھی۔وہ مردوں کی طرح لباس پہنتی...... مردوں جیسی باتیں کرتی اور ظلم و ستم میں جابر مردوں سے بھی بڑھ گئی تھی...... اتنے سالوں میں کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں آیا تھا جب اسے کوئی پچھتاوا...... یا...... افسوس ہوتا۔اس کے اندر اتنا تعصب اور بربریت گھر کرچکی تھی کہ اسے اپنے سامنے کھڑا انسان کسی جانور سے زیادہ معلوم نہ ہوتا تھا اور اس کے ساتھ وہ جیسے چاہتی سلوک کرتی...... کوئی احتجاج کرنے والا نہیں تھا...... کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا...... رفتہ رفتہ اس میں اتنا تکبر،انانیت،خود پسندی اور خودغرضی بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو سب کچھ اور مختار کل سمجھنے لگی تھی۔

اس کے گاؤں کی ایک لڑکی رقعیہ شہر تعلیم حاصل کرنے گئی تھی اور اس نے کالج کے ایک لڑکے کو پسند کر لیا تھا اور اس سے شادی پر بضد تھی۔ اس کے ماں باپ وہاں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے جب بات نازی تک پہنچی تو اس نے رقعیہ کو اپنے ہاں طلب کیا......اور اس کو ایسی مار ماری کہ وہ لہولہان ہو گئی۔ اس کے چہرے کو اس نے گرم سلاخ سے داغ دار کر دیا تھا۔ وہ روتی اور چلاتی رہی مگر نازی کو اس پر ذرا سا بھی ترس نہ آیا۔

''کیا اب بھی تم اس سے شادی کرنا چاہو گی؟'' نازی نے پوچھا۔

''ہاں'' وہ چلا کر بولی۔

نازی نے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر لگایا۔

''میں تمہاری بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دوں گی'' نازی نے غصے سے کہا۔

''جو......چاہے......کرلو......میں تم سے نہیں ڈرتی......میں اس سے محبت کرتی ہوں......تمہیں کیا معلوم......محبت اور اس کی طاقت کیا ہوتی ہے......تم جیسی ظالم عورت کو کبھی خدا محبت سے نہیں نوازتا......تمہاری آنکھوں اور دل پر جہالت کے پردے ہیں......جاہلوں کو خدا محبت کا تحفہ کبھی نہیں دیتا'' رقیعہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

رقعیہ کی باتیں سن کر نازی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''تمہاری......یہ جرأت......'' نازی نے ہاتھ لہرا کر اسے زوردار تھپڑ لگانا چاہا مگر رقعیہ نے اس کا ہاتھ روک دیا اور ویسا ہی زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر انتہائی زور سے مارا۔ نازی کا سر بری طرح چکرا گیا اسے قطعی توقع نہ تھی کہ اس کے ایک غریب مزارعے کی بیٹی اتنی نڈر اور بے باک ہو سکتی ہے۔ نازی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پاس پڑے ایک موٹے ڈنڈے کے ساتھ اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ رقعیہ لہولہان ہو رہی تھی مگر اس کی زبان سے نازی کے لئے مسلسل بددعائیں نکل رہی تھیں۔

''اللہ تم پر بھی ایسا ہی ظلم کرے......تجھے کبھی سکون نہ ملے......تو......موت مانگے اور تجھے موت نہ ملے......اللہ کرے......اللہ......اللہ''

رقعیہ بڑبڑاتی ہوئی بے ہوش ہو گئی۔

نازی کے ہاتھ سے ڈنڈا گر گیا۔ اس نے رقعیہ کی جانب غصے سے دیکھا اور پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی۔ اس کے اندر کی آگ ابھی بھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ اسے سکون نہیں ملا تھا۔ ابھی تو وہ اس پر بہت ظلم و ستم ڈھانا چاہتی تھی۔ اسے ایسی مار مارنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے آگے گڑگڑا کر اپنی جان بخشی کے لئے التجائیں کرتی روتی پیٹتی......مگر اس کو......اس پر رحم نہ آیا......مگر رقیعہ تو چند ڈنڈوں کے بعد ہی ڈھیر ہو گئی تھی۔

''اتنی باتیں کر رہی تھی......سارا دم خم نکل گیا......اس کو ہوش بھی آ جائے تو اس کو یونہی پڑے رہنے دینا۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں دینا'' نازی نے غصے سے اپنے کارندوں سے کہا اور تہہ خانے سے باہر نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آئی......تو اس کا سر درد سے پھٹنے لگا......غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا......ایک غریب کمتر لڑکی میں اتنی جرأت اور بے باکی کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

''محبت ایسے ہی نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے......وہ بھی تو شاہ زیب کے سامنے ڈٹ گئی تھی......وہ بھی تو اس وقت سب کچھ کرنے کو تیار تھی......موت کو گلے لگانے میں بھی خوف محسوس نہیں کرتی تھی......محبت کی خاطر......اور محبت اسے پھر بھی نہیں ملی تھی......اگر مجھے محبت نہیں ملی تو میں کسی اور کو بھی اس سے سیراب ہوتے نہیں دیکھ سکتی......کبھی بھی نہیں......میں اسے زندہ درگور کر دوں گی......مگر اسے محبت کی شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی'' نازی نے غصے سے سوچا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔

رقعیہ نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا......وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اٹھ گئی اور اپنا گال سہلانے لگی۔ اسے وہ ابھی تک سرخ اور جلتا ہوا محسوس ہوا۔

میں اس کی سانسوں سے اس جلن کو ٹھنڈا کروں گی۔ اس کے بدن سے ایک ایک سانس کھینچ لوں گی۔ تب ہی مجھے سکون ملے گا۔

''اللہ کرے، تجھے کبھی سکون نہ ملے'' رقعیہ کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے۔

''سکون تو مجھے آج تک نہیں ملا......زندگی میں ایک پل کے لئے بھی نہیں، اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ میں نے تو زندگی میں جس شے کی بھی تمنا کی......وہی نہیں ملی......نہ محبت......نہ سکھ......نہ ہی چین......اس کی بددعا سے میں کیوں ڈروں......میں تو پہلے ہی اس آگ میں جل رہی ہوں......جو اس کو نظر نہیں آئی......

''اللہ کرے تو موت مانگے......اور تجھے موت نہ ملے۔ اللہ تجھ پر بھی ایسا ہی ظلم کرے'' رقعیہ کے الفاظ پھر اس کے ذہن میں گونجے اور اس نے بلند آواز میں قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

''تو......مجھ پر اور کیا ظلم کرے گا......اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے......کہ تو انسان سے وہی چیز چھین لے......جو اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو......وہ خواہش ہی چھین لے......جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرے......مجھ سے پوچھ......تو کتنا ظالم ہے......؟''

''تو......سب سے زیادہ ظالم ہے'' نازی بلند آواز میں چلائی اور مسلسل چلاتی رہی۔

''اللہ......تو......سب سے زیادہ ظالم ہے......تو......انسانوں پر مہربان نہیں......یہ سب جھوٹ ہے۔'' نازی چلاتی رہی......اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ ''میں کسی کو نہیں چھوڑوں گی......میں سب کو تباہ و برباد کر کے رکھ دوں گی......تو نے مجھ سے جتنے بدلے لینے ہیں لے لے......جتنا ظلم ڈھانا ہے......ڈھا لے......مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں......تیری بھی نہیں......جو تو چاہتا ہے......کر لے......'' نازی چلاتی رہی......اور کمرے میں چکر لگاتی رہی۔

تمام نوری مخلوق حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگی......نازی کی بے باکی اور انتہائی گستاخانہ انداز گفتگو سے وہ حیران ہو رہے تھے......انسان اپنے خالق کے بارے میں اس قدر بدگمان بھی ہو سکتا ہے......انہیں یقین نہیں آ رہا تھا......اور ان کی تمام تر گستاخیوں کے باوجود بڑی سرکار انہیں 'اپنا شاہکار' قرار دینے پر تلی تھی۔

''انسان اپنے رب کا اتنا ناشکرا بھی ہو سکتا ہے......؟ اتنا نافرمان......اور اتنا بے باک و گستاخ بھی'' نوری مخلوق سوچ میں پڑ گئی۔

بڑی سرکار بھی خاموشی سے نازی کی آہ و بکا اور شکوے و شکایات سنتی رہی......سفید روشنی بدستور روشن رہی......اس کی لو اور تابانی میں ذرا بھر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

فرق نہ آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا...... جیسے بڑی سرکار بہت مطمئن اور پر اعتماد ہو...... نازی کے شکوے سننے کے باوجود بڑی سرکار بالکل جلال میں نہ آئی۔
نوری مخلوق منتظر تھی کہ بڑی سرکار کے شاہی دربار سے کوئی حکم صادر ہوگا...... ناراضگی کا اظہار ہوگا...... یا پھر...... کوئی اور بات ہوگی...... مگر ہر طرف خاموشی طاری رہی......

بڑی سرکار کی خاموشی اور اطمینان سے وہ حیران ہونے لگے...... اور انسان کے بارے میں مزید مشکوک ہونے لگے۔

☆

تیمور اپنی حویلی کے ایک تاریک کمرے میں کھڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس نے چھت کے پنکھے کے ساتھ ایک رسی کا پھندا بنایا تھا اور اس پھندے کو اپنی گردن کے گرد باندھ کر دیکھ رہا تھا...... یہ کتنے مشکل اور اذیت ناک لمحات تھے جن سے وہ گزر رہا تھا...... وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے جا رہا تھا...... اور اس نے یہ فیصلہ انتہائی مشکل حالات سے گزر کر کیا تھا...... وہ بہت سالوں سے اپنے آپ سے لڑتا آ رہا تھا مگر اب حالات اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے تھے وہ اپنے آپ کو بہت کمزور...... مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی...... ہر راستہ بند مل رہا تھا...... کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی...... یا پھر اس کے اندر اتنی تاریکی چھا گئی تھی کہ اسے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی یا پھر اس کے دل نے امید اور آس کے سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ وہ اس قدر مضطرب اور بے چین ہو گیا تھا کہ کوئی سوچ...... کوئی خیال بھی اسے پر امید نہیں بنا رہا تھا۔

اس نے پھندا گلے سے اتار کر اسے پنکھے کے ساتھ مضبوطی سے باندھا...... اور جیب میں سے سگریٹ نکال کر اس کے گہرے کش لگانے لگا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی...... اور ہو کا عالم تھا۔

وہ کیوں اپنی جان لینے کی کوشش کر رہا ہے؟ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

میں بہت بے بس ہو گیا ہوں...... اپنے آپ سے لڑ لڑ کر تھک گیا ہوں...... میرے اعصاب تھک گئے ہیں اور اب مجھ میں زندگی کا بوجھ سہنے کی مزید سکت نہیں...... زندگی نے مجھے دیا ہی کیا ہے......؟

بہت کم دے...... کر...... میرا سب کچھ چھین لیا ہے...... اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور ایک دم آنسو اس کی آنکھوں سے زار وقطار بہنے لگے...... اس کی آہیں اور سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

اسے نازی سے جدا ہوئے دس سال گزر گئے تھے اور وہ اسے ایک دن کے لئے بھی بھلا نہیں پایا تھا۔ اس نے نازی سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ ایسی محبت وہ زندگی بھر کسی اور سے نہیں کر پایا تھا...... اس کو طلاق دینے کے بعد وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ پھر کبھی نارمل نہیں ہو پایا تھا۔ نازی سے جدائی کا دکھ اس کے دل کو ہر وقت مضطرب اور بے قرار رکھتا...... اسے کوئی شے آرے کی طرح کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی...... اس روح فرسا اذیت اور دکھ سے فرار کے لئے اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب چرس کے بھرے سگریٹ بھی اسے مطمئن نہ کر پاتے تو اس نے ہیروئن پینا شروع کر دی۔ جب وہ نازی کو طلاق دے کر گھر آیا تو ثروت اور مسز وقار نے اس کی خوب بے عزتی کی۔ اس کے چچا دبیر الحسن نے اس کو دو تین تھپڑ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بھی لگائے اور بہت دھمکیاں بھی دیں...... وہ خاموشی سے یوں سب کچھ سنتا رہا جیسے کچھ بھی نہ سن رہا ہو...... اسی وقت شہزادی کو گاؤں سے بلا کر دونوں کا نکاح کر دیا گیا...... وہ ایک بے جان لاش کی مانند بیٹھا رہا...... اس کے چچا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نکاح نامے پر دستخط کیے...... اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے...... اسے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ کر رہا تھا...... یوں جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ اس نے شہزادی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا وہ روتی اور اس سے شکوے کرتی مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا...... وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر دیتا...... وہ اس سے باتیں کرتی اور وہ کوئی جواب نہ دیتا...... وہ اس کے کمرے میں ہی نہ آتا...... جب کبھی اس کا موڈ بہتر ہوتا اور وہ محبت کی باتیں شروع کرتی...... تو وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہتا...... اسے غصہ آتا تو وہ نازی کا ذکر چھیڑ دیتی...... اسے برا بھلا کہتی...... اسے جی بھر کر کوستی تب تیمور غصے سے اسے گھورتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاتا...... زندگی کے کئی سال یونہی گزر گئے تھے۔ شہزادی نہ بیوہ تھی...... نہ سہاگن...... تیمور کو اس کے وجود سے ہی نفرت تھی وہ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا...... ثروت بیاہ کر کے امریکہ چلی گئی تھی اور وہ اپنا بزنس شہزادی کے حوالے کر گئی تھی جسے وہ بہت کامیابی سے چلانے لگی تھی...... تیمور سارا وقت گھر میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا...... یا پھر نشہ کر کے سویا رہتا...... شہزادی جیسے ہی بزنس میں ترقی کرنے لگی وہ تیمور سے متنفر ہونے لگی...... تیمور سے نفرت کی بڑی وجہ نازی تھی...... وہ ان دیکھے نازی سے جتنی نفرت کرتی تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت تیمور سے کرنے لگی تھی...... رفتہ رفتہ شہزادی کی دلچسپی اپنے ایک اسسٹنٹ احسن علی میں بڑھنے لگی۔ مسز وقار کی وفات کے بعد وہ پورے گھر اور جائیداد کی مختار کل تھی۔ اس نے کمال ہوشیاری سے جائیداد اور طلاق کے کاغذات پر تیمور کے دستخط کرا لیے اور احسن علی سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ حویلی میں لے آئی۔ تیمور ہر وقت نشہ کر کے کمرے میں بند رہتا۔

اچانک ثروت امریکہ سے آئی تو تیمور کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے شہزادی پر سخت تنقید کی مگر شہزادی نے اس کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا۔ ثروت کو شہزادی کی دوسری شادی اور فریب سے تیمور کی حاصل کردہ جائیداد کے بارے میں سن کر سخت صدمہ ہوا۔ شہزادی نے جھگڑا کر کے اسے بھی اپنی حویلی سے باہر نکال دیا۔ تیمور کا وجود اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اس لئے اس نے اسے وہیں رہنے دیا...... یا...... پھر دیر الحسن کے ڈر سے اس نے اسے دھکے دے کر باہر نہ نکالا ورنہ وہ تیمور سے سخت نفرت کرتی تھی۔

تیمور بیمار رہنے لگا تھا...... اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ زندگی سے تنگ آ گیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا......

''کسی کو میری ضرورت نہیں...... ایسی بے وقعت زندگی کی بھلا کس کو ضرورت ہو سکتی ہے...... نہ میں اہم ہوں...... اور نہ ہی میری زندگی...... مجھے نفرت ہے اس زندگی سے...... نجانے خدا نے زندگی کا یہ طوق ہم انسانوں کے گلے میں کیوں ڈال رکھا ہے'' اس نے رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا...... اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ شاید...... اس لئے...... کہ ہم سسک سسک کر مریں جائیں۔ اس نے پھندا گلے میں ڈال کر اس کا حلقہ تنگ کیا۔

''زندگی ایک نعمت ہے'' کبھی پڑھا ہوا جملہ اس کے کانوں میں گونجا۔ اس نے آہ بھری۔

''نہیں...... زندگی ایک لعنت ہے...... اک عذاب ہے، بہت بڑی آزمائش ہے...... مجھے اس زندگی سے نفرت ہے...... شدید نفرت......'' تیمور نے آہ بھر کر سوچا اور پھندے کے حلقے کو بہت تنگ کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی...... اور اگلے چند لمحوں میں اس کا مردہ وجود چھت کے پنکھے کے ساتھ بے حس و حرکت لٹک رہا تھا...... کمرے سے بلند ہونے والی...... تیمور کی آخری دردناک صدائیں سن کر نوری مخلوق افسردہ ہونے لگی۔ وہ

مزید بے چین اور پریشان ہو گئے۔ بڑی سرکار کا شاہکار انسان کس قدر بے بسی اور مجبوری سے قابل رحم حالت میں چھت کے ساتھ لٹک رہا تھا...... اللہ کی بخشی ہوئی نعمت زندگی کا اس نے اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر دیا تھا۔

''زندگی...... انسان کے لئے اس قدر تکلیف دہ ہے...... کہ انسان اس کا طوق اپنے گلے سے اتارنے کے لئے ہر دم تیار رہتا ہے......'' ہر وقت کیا زندگی نعمت ہے...... اگر یہ نعمت ہے......؟ تو پھر کیسی نعمت ہے...... جس سے انسان چھٹکارا پانا چاہتا ہے...... انسان کیسی مخلوق ہے......؟ جو نعمت کو نعمت نہیں سمجھتا......

''اُف انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے......''

وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے...... انہیں زیادہ تر انسان مایوس کر رہے تھے۔ بڑی سرکار ابھی بھی خاموش تھی۔ سفید روشنی سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی تھی۔ انسان کی انتہائی قابل رحم حالت دیکھ کر وہ دکھی بھی ہو رہے تھے اور پریشان بھی...... مضطرب بھی اور حیران بھی...... مگر وہ بھی خاموش رہے۔ کسی نے کوئی سوال نہ کیا...... اور نہ ہی بڑی سرکار کے دربار سے انہیں کچھ کہنے کا اذن ملا...... وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

☆

ماسٹر باسط علی نے شاہ زیب کے مزار پر سرخ گلاب کی پتیوں اور پھولوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈالا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کی۔ ان کے چہرے پر انتہائی اطمینان اور سکون تھا۔ داڑھی قدرے سفید ہو چکی تھی اور سر کے بال بھی بہت زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ انہوں نے سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ دس سالوں سے شاہ زیب کے مزار پر اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وہ مزار سے ملحقہ ایک حجرے میں رات بھر عبادت کرتے...... صبح شاہ زیب کے مزار پھول ڈال کر دعا کرتے اور پھر مزار کے صحن میں آ کر لوگوں کی مذہبی، اخلاقی و روحانی تربیت کرتے۔ صاحب مزار کی فیض نظر سائیں کی دعا یا پھر اللہ کی نظر کرم سے...... انہیں ایسا مقام اور رتبہ ملا تھا جو لاکھوں، کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کو قدرت نے حق شناسی اور معرفت کے اسرار تک رسائی کے ایسے وصف سے نوازا تھا...... جس نے انہیں بے شمار انسانوں میں ممتاز کر دیا تھا...... وہ لوگوں کے لئے دعائیں کرتے تھے اور ان کی دعائیں قبول ہوتی تھیں...... وہ مذہب اور شریعت کے مسائل سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے...... انہیں ایسے روحانی پیشوا کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جو ڈھیرے ڈھیرے لوگوں کی روحوں پر اثر انداز ہو کر انہیں حق اور سچائی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ وہ عام اور سادہ حلیے میں عوام الناس کے درمیان رہ کر ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے تھے...... ان کے ماں باپ مر چکے تھے اور بہنیں اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں زندگی کی ساری مادی خواہشات انہوں نے اپنے دل سے نکال دی تھیں...... کسی شے کی نہ طلب رہی تھی نہ حاجت...... نہ کوئی خواہش نہ کوئی آرزو...... نہ کوئی غرض نہ کوئی تمنا...... صرف انسان اور انسانیت...... بندہ اور خدا...... اللہ اور انسان...... ''ان کے لئے سب سے مقدم تھے۔

زندگی گزر رہی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ قدرت انہیں نواز رہی تھی ان کی عزت...... مقام اور مرتبے میں اضافہ ہو رہا تھا...... ان کی

روح کو قدرت ایسے کشف اور معجزوں سے نواز رہی تھی...... جن کا شعور نہ تو عام انسان کو ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس تک اس کے ذہن کی رسائی ہو سکتی ہے...... وہ بہت خاموشی سے روحانیت کے ان درجات تک رسائی پا رہے تھے...... جن تک رسائی قدرت کی خاص نظر کرم سے ہی ممکن ہوتی ہے۔

شاہ زیب کے مزار پر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا...... لوگ مزار پر پھول ڈالتے اور دعائیں کرتے...... فضا میں ایسی خوشبو رچی بسی رہتی جو ہر وقت ذہن کو معطر رکھتی۔ مزار پر ہر وقت رونق اور چہل پہل رہتی۔

رات کی تنہائی میں ماسٹر باسط علی مزار سے ملحقہ اپنے حجرے میں بیٹھ کر عبادت میں مصروف رہتے...... ماضی کے بارے میں سوچتے شاہ زیب سے اس روحانی تعلق کے بارے میں غور و فکر کرتے جس کو نبھانے کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر ان کے مزار پر آ بسے تھے...... ماضی کے دھندلکوں میں کھویا نازی کا چہرہ اور محبت کی یادیں، سب بے معنی اور فضول باتیں محسوس ہوتیں...... نازی ایک ایسی یاد بن کر ان کے اندر زندہ تھی جس کے وجود نے ان کے اندر ایسا اضطراب اور بے چینی پیدا کر دی تھی مگر جس کو قرار شاہ زیب کی قبر پر آ کر ملا تھا......

اگر نازی ان کی زندگی میں نہ آتی اور نازی کی شادی شاہ زیب سے نہ ہوتی...... وہ شاہ زیب سے نہ ملتے اور شاہ زیب کی حق تلفی کرنے سے ان کے اندر احساس گناہ نہ پیدا ہوتا اور وہ احساس گناہ انہیں پہاڑوں کی وادیوں میں نہ لے جاتا اور سائیں کی فیض نظر سے ان کی روح میں وہ تڑپ اور بے قراری نہ پیدا ہوئی ہوتی...... اور سائیں کے کہنے پر وہ شاہ زیب سے ملنے نہ آتے...... تو سب کچھ کیسے ممکن ہوتا......؟ وہ آج یہاں نہ ہوتے...... قدرت انہیں ان درجات سے نہ نوازتی...... وہ اتنے انسانوں کی رہنمائی نہ کر رہے ہوتے...... وہ ایک ایک بات کو سوچتے اور قدرت کی مصلحتوں کے قائل ہوتے جاتے اپنی کمزوریوں، خامیوں، خطاؤں، بے قراریوں اور بے تابیوں پر شرمندہ ہوتے۔ اپنا ہر عمل اور ہر سوچ انتہائی حقیر اور بے وقعت سی محسوس ہوتی...... قدرت کی مصلحتوں کے اسراروں تک رسائی پانا کتنا کٹھن اور مشکل دکھائی دیتا مگر ان تک رسائی پا کر طمانیت کا احساس ان کے قلب و روح کو ایسا سرشار کر دیتا کہ ان کی جبیں سجدہ ریزی کے لئے مچلنے لگتی...... اور آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ نکلتے...... یہ آنسو کتنے قیمتی ہوتے جو اپنے خالق سے محبت کے اظہار کے لئے آنکھوں سے یوں پھسلتے جیسے ٹوٹی مالا کے قیمتی موتی یکے بعد دیگرے گرنے لگتے ہیں اور جنہیں اکٹھا کر کے شمار کرنا مشکل ہو جاتا...... ایسی آنکھوں کے قیمتی آنسو گرتے ہی ان کے دل سے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ صدائیں بلند ہوتیں۔

''ہم خطاوار انسان ہیں...... بہت گنہگار...... بہت نافرمان...... تیرے مجرم...... تیری رحمت کے طلب گار ہیں تو ہم انسانوں پر اتنا رحم اور کرم فرماتا ہے...... بے شک تو کرم فرمانے والا عرش عظیم کا حقیقی مالک ہے...... ساری عبادتیں...... ساری اطاعتیں...... اور ساری نیازمندیاں تیرے واسطے ہیں...... ہم پر رحم فرما...... اپنا کرم فرما'' ماسٹر باسط علی کے دل کی صدائیں سن کر تمام نوری مخلوق نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا...... وہ حیران اور پریشان ہونے لگے۔ خدا سے شکوے و شکایات کرنے والے بے باک اور گستاخ انسانوں کے درمیان یہ کون صاحب نظر اور ہدایت یافتہ انسان گڑگڑا کر اتنی عجز و انکساری کے ساتھ بڑی سرکار کے دربار میں اپنی قدر و قیمت بڑھا رہا ہے...... وہ جو انسانوں کے بارے میں شاکی ہو رہے تھے اور اس حتمی فیصلے تک پہنچنے والے تھے کہ انسان شاہکار کبھی نہیں ہو سکتا...... ایک دم ہڑبڑا گئے تھے...... ان کو کسی بات نے اندر ہی اندر مضطرب کر دیا تھا...... یوں جیسے ان کو خطرے کی گھنٹی بجتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

انسان کتنا عجیب وغریب ہے......

کیسی حیران کن مخلوق ہے......

جس کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا...... جو ہاری بازی کو جیت بھی سکتا ہے اور ہار بھی...... انسان...... انہیں الجھا رہا تھا...... انہیں پریشان کر رہا تھا۔

سفید لو میں طمانیت اور سکون کا احساس انہیں مزید حیران کرنے لگا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے انسان قربت کے اس درجے پر پہنچنے والا تھا جس کا دعویٰ بڑی سرکاری نے کیا تھا اور وہ جس کو ماننے کو تیار نہیں تھے مگر بڑی سرکاری کے حکم اور حکمتوں کے سامنے وہ کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے......اور اب وہ اندر ہی اندر بہت کچھ مان رہے تھے...... قائل ہو رہے تھے......

مگر انسان قربت کا وہ درجہ اور مقام کیسے حاصل کرے گا......؟

وہ متجسس ہو کر سوچنے لگے......

شاہی دربار میں ماسٹر باسط علی کی نیاز مندانہ...... عجز و انکسار سے بلند ہوتی صدائیں...... محبت بھری سسکیاں اور آہیں انسان کے خالی وجود کو عظمتوں سے سرفراز کر رہی تھیں...... ان کی سجدہ ریزی انسان کے مقام و رتبے کو رفعتوں سے نواز رہی تھی...... انسان سربلند ہو رہا تھا اور وہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہے تھے اور اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا...... جیسے ابھی انسان کو 'شاہکار' کیا جائے گا...... مگر بڑی سرکار خاموش رہی......اور ہر طرف گہری خاموشی چھانے لگی۔

......❁......

گڑبڑ گھوٹالہ

گڑبڑ گھوٹالہ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ اُنکی مزاحیہ شاعری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے اُن کی شاعری کی دو کتابیں "ہوئے ڈاکٹری میں رسوا" اور "دوا بیچتے ہیں" شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی یہ شاعری اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ڈاکٹری، ہسپتال اور بیماریوں جیسے خشک موضوعات کو مزاح کے لطیف قالب میں ڈھالا ہے۔ اُن کی نظموں اور غزلوں کے چند عنوانات ہیں "یرقان آرزو، سو ہے وہ بھی ڈاکٹر، دردعرق النساء، پیوندکاری، نرس، ای سی جی، لفظی پوسٹمارٹم، ٹکڑے جگر کے" وغیرہ وغیرہ۔

گڑبڑ گھوٹالہ کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **شاعری** کے **طنز و مزاح** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حصہ چہارم

(ا)

انسانوں کے شکوے اور ان کی آہ و بکا...... سن کر تمام مخلوق دم سادھے کھڑی تھی...... وہ حیرت سے سفید روشنی کی جانب دیکھنے لگے، وہ منتظر تھے کہ بڑی سرکار انسانوں کے شکوے شکایات اور ان کی گستاخیاں سن کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے...... انہیں اپنا 'شاہکار' کہنے سے انکار کر دے گی...... مگر وہ دم بخود رہ گئے...... جب سفید روشنی سے بارعب آواز بلند ہوئی۔

''کیا تم...... اب بھی انسان کو میرا 'شاہکار' نہیں مانتے؟ وہ بری طرح بوکھلائے اور حیرت سے ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

''شا...... ہکار...... آپ کی...... اتنی ناشکری کے باوجود بھی۔'' نوری مخلوق میں سے کسی نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں...... اب...... بھی......'' سفید روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر...... اتنا کم حوصلہ...... ناشکرا...... اور آپ سے جھگڑنے والا...... انسان......'' کسی نے پوچھا۔

سفید روشنی خاموش رہی۔

''کیا ایسا انسان آپ سے محبت کر سکتا ہے؟'' کسی دوسرے نے پوچھا۔

''میں...... انسان سے محبت کرتا ہوں۔'' سفید روشنی نے جواب دیا۔

''آ...... پ......؟ وہ سب حیرت سے چلائے۔

''انسان کی اتنی سرکشی اور بغاوت کے باوجود بھی......؟''

''ہاں......'' پرسکون اور انداز میں جواب دیا گیا۔

''اس محبت کی وجہ......؟'' انہوں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میرے لئے...... انسان کی جستجو۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیسی جستجو......؟'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''اس کائنات کی تمام مخلوقات...... مجھے مان کر میرے سامنے مطیع اور فرمانبردار رہے گی...... میری تسبیح کرے گی...... مگر مجھے جاننے کی جستجو کوئی نہیں کرے گا...... سوائے انسان کے۔''

''آپ کی جستجو......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''جب میری نشانیاں اور قدرتیں انسانوں کو اندر سے مضطرب کریں گی تو وہ میرے اسرار جاننے کی کوشش کرے گا...... جیسے جیسے اسرار کی

حقیقتوں سے وہ آشنا ہوتا جائے گا......وہ میرے قریب آتا جائے گا......اور اس کو میرا وہ قرب نصیب ہوگا جو کائنات میں کسی اور مخلوق کو کبھی نہیں ہو پائے گا......''مسکرا کر جواب دیا گیا۔

''کیسا قرب......؟''حیرت سے سوال کیا۔

''راز و نیاز کا......!''

''سرگوشی اور ہم کلامی کا......''

''محبت اور عشق کا......''

سب چونک کر سفید روشنی کی جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔

''یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟''قدرے توقف کے بعد سوال کیا گیا۔

سفید روشنی پُرسکون انداز میں چمکتی رہی مگر کوئی جواب نہ دیا۔

وہ حیران ہو کر روشنی کی جانب دیکھنے لگے۔ اچانک کسی کی سرگوشیوں کی صدا ہر جانب سنائی دینے لگی۔ وہ سب چونک کر دیکھنے لگے۔

☆

پروفیسر امجد علی نے اپنے سامنے ٹیبل پر کتابوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ ان کی سٹڈی میں ہر طرف کتابیں اور میگزینز بکھرے نظر آ رہے تھے......وہ تین روز سے......ان کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے......مگر انہیں ان کے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا......وہ بار بار انٹرنیٹ کھول کر بیٹھ جاتے......ان کی تیس سالہ پروفیشنل لائف میں یہ پہلا واقعہ تھا......اور......اس واقعے نے انہیں......نہ صرف اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا......بلکہ ان کے علم اور تجربے پر بھی پانی پھیر دیا تھا......

یہ......کیسے ممکن ہے......؟ وہ بار بار بڑبڑا رہے تھے، تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتے......اس کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر اسٹڈی روم کی خوبصورت مزین چھت کو گھورتے......وہ ملک کے مشہور آرکیالوجسٹ تھے......ان کی پچپن سالہ زندگی میں پہلی دفعہ رونما ہونے والے اس واقعے نے......انہیں بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''اِٹس......امپا......سبل......؟''ہاؤ......از......اٹ پاسبل؟

وہ انٹرنیٹ آن کر کے Search کرنے لگے......مختلف Sites کی Web Search نے ان کے اندر کی تشنگی کو مزید بڑھا دیا......

سائنسی علم کے مطابق ہر انسان Cells سے بنا ہے اور مرنے کے بعد Cells کی Decomposition (گلنا سڑنا) شروع ہوتی ہے......

تو......پھر......وہ 'انسان'......کس مخصوص چیز سے بنا تھا......؟ انٹرنیٹ آن تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی نگاہیں دیوار پر مرکوز تھیں مگر ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

''یہ......یہ......کیسے ممکن ہے......؟''

ایسا..... اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا..... اور نہ ہی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کیا وہ کوئی معجزہ تھا.....؟ ان کے ذہن نے سوال کیا..... نہیں..... نہیں..... یہ ممکن نہیں..... معجزے کچھ نہیں ہوتے..... یہ صرف انسانی سوچ..... ذہن کی اختراع اور سوچ ہوتی ہے..... جو چیز ہمیں سمجھ نہ آئے اور ہماری عقل اسے قبول نہ کرے تو ہم اسے معجزہ کہنا شروع کر دیتے ہیں.....

ہر شے..... ہر وجود اور ہر حقیقت کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے..... زمین کی کھدائی کے دوران انہیں کئی بار بے شمار عجوبے ملے تھے۔ عجیب و غریب قسم کی انسانی ہڈیاں ٹیڑھی، میڑھی، ترچھی، بوسیدہ اور بدشکل..... جن کے قدیم ہونے کا بھی با آسانی پتہ چل سکتا تھا۔ انہوں نے انٹرنیشنل لیول پر بھی کئی ماہرین کے ساتھ مل کر بہت ریسرچ ورک کیا تھا..... مگر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا..... ایسی بات سُنی تو تھی مگر انہوں نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا تھا..... اور اب جو کچھ خود دیکھا تھا..... دل اس پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ کئی روز سے ان کا ذہن الجھا ہوا تھا اور کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

انسان کیا ہے.....؟ کس سے جنم لیتا ہے اور اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے؟ یہ سوال پھر ان کے ذہن کو مضطرب کرنے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور شیلف میں رکھی مختلف کتابوں کو دیکھنے لگے..... ایک کتاب نکال کر The Origin of human body کے Chapter کو کھول کر پڑھنے لگے..... وہی انفارمیشن جو وہ بار بار پڑھتے آئے تھے پھر بغور پڑھنے لگے..... انسان کس شے سے بنا ہے؟

اس کا جواب تھا Cell (خلیہ) جو مختلف شکل وصورت اور سائز کا Sack like Structure (تھیلی نما) اسٹرکچر ہوتا ہے جو خوردبین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک جیسے ہی شکل وصورت کے Cells مل کر ٹشو بناتے ہیں، پھر مخصوص ٹشو مل کر Organs یعنی انسانی اعضاء بناتے ہیں اور اعضاء کی قدرتی ترکیب سے جسم انسانی بنتا ہے۔

اگر انسانی جسم Cell کے بغیر ممکن نہیں تو پھر اس انسان کا جسم کن Cells سے بنا تھا..... وہ سوچ میں پڑ گئے..... اور Cells کے بارے میں مختلف کتابیں کھول کر پڑھنے لگے..... ہر ایک میں Cell کی ساخت ایک جیسی لکھی تھی..... مثلاً تین اہم حصوں پر Cell مشتمل ہوتا ہے۔ Cell membrane (خلیے کی جھلی) نیوکلیس (مرکزہ) اور سائیٹو پلازم (نیوکلیس اور جھلی کے درمیان Fluid نیم سیال مادہ ہوتا ہے) جو کہ پروٹین Cell membrane خلیے کی بیرونی جھلی اور چکنائیوں سے مل کر بنی ہے۔ یہ نیم مسام Semi permeable ہوتی ہے جو مخصوص اجزاء کو Cell میں داخل ہونے دیتی ہے اور بے کار اجزاء کو باہر نکال دیتی ہے یہ جھلی Cell کے تمام اجزاء کو سہارا بھی دیتی ہے۔

نیوکلیس جو کہ Cell کا مرکزی حصہ ہوتا ہے اسے Cell کا Brain بھی کہا جاتا ہے..... جو کہ Cell کے سارے System کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ گول یا بیضوی شکل کا ہوتا ہے، جس کے گرد بار یک جھلی ہوتی ہے، جسے نیوکلیئر ممبرین کہتے ہیں..... اس کے اندر شفاف لیس دار مادہ ہوتا ہے جسے نیوکلیئر کا پلازمہ کہتے ہیں، اس میں بہت سے مرکبات ہوتے ہیں، اسی کے اندر کروموسومز اور نیوکلیولائی ہوتے ہیں۔ کروموسومز دھاگوں کا ایک جال ہوتا ہے جو نیوکلیس کے اندر پھیلا ہوتا ہے۔ ہر جاندار میں کروموسومز کی تعداد مختلف ہوتی ہے مگر انسانوں میں اس کی تعداد 46 یا 23 جوڑوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ کروموسومز کے اوپر جینز (Genes) کوڈ کی صورت میں ہوتے ہیں..... یہ والدین کی خصوصیات بچوں میں منتقل کرتے ہیں اور وراثت کے ذمہ دار ہوتے ہیں..... کروموسومز پروٹین اور DNA سے مل کر بنتے ہیں جبکہ سائیٹو پلازم، نیم شفاف لیس دار مادہ،

جس میں بہت سے مرکبات یعنی پانی، کاربو ہائیڈرٹس، پروٹینز، نمکیات پائے جاتے ہیں۔ 70 فیصد ہوتا ہے۔ کاربو ہائیڈریشن جو کہ Cell کو طاقت دیتا ہے اور اس کی خوراک میں مدد دیتا ہے...... پروٹینز جو کہ Cell کا 20-30 فیصد حصہ ہوتے ہیں...... یہ دو قسم کی پروٹینز ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو جسم کی ساختیں یعنی کھال، بال وغیرہ بناتی ہے۔ دوسری گلو بیولز پروٹین یا Cell کے مادوں میں حل ہو کر Enzym کا کام کرتی ہے۔

سائیٹو پلازم میں موجود چکنائیاں جسم کو غذائیت اور حرارت مہیا کرتی ہیں اور ٹشوز کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔

Cell میں موجود نمکیات، پوٹاشیم، سوڈیم کلورائیڈ، کیلشیم، میگنیشیم، خلیات یعنی Cell کو کنٹرول کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

سینٹروسوم میں موجود غیر شفاف ذرات، جنہیں سینٹرولیس کہتے ہیں سیل کی Division (تقسیم) کے ذمہ دار سینٹروسوم ہوتے ہیں...... مائٹو کونڈریا جن کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے۔ یہ سیل کی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں...... رائیوسومز سیل میں پروٹین بناتے ہیں۔ گالجی باڈیز سیل میں کیمیائی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں...... انسانی جسم اور اس میں گردش کرنے والا خون بھی سیلز پر مشتمل ہوتا ہے...... انسانی جسم کی ابتدا Cell سے ہوتی ہے اور ساری زندگی Cell بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی یہی Cell ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر کتاب سے انہیں یہی انفارمیشن مل رہی تھی......

Cells سے جنم لینے والے ہر انسان کے سیلز کا ختم ہونا بھی ضروری ہے...... اگر ایسا نہیں ہوتا...... تو...... پھر اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے......؟

وہ راز کیا ہے......؟

کیا وہ 'انسان' کسی اور شے سے بنا تھا؟ کیا اس میں Cells موجود نہیں تھے......؟ اگر اس میں Cells موجود نہیں تھے...... تو پھر اور کیا تھا...... جس نے اس کی لاش کو گلنے سڑنے نہیں دیا...... کھدائی کے دوران انتہائی ویران اور کھنڈر علاقے سے انہیں ایک بوڑھے آدمی کی اسی سالہ پرانی لاش ملی تھی۔ جس کا نہ تو کفن خراب ہوا تھا اور نہ ہی اس کا جسم...... اس کی داڑھی کے بال، ناخن بھنویں اور پلکیں تک بالکل سلامت تھیں۔ اس کی جلد یوں تر و تازہ تھی جیسے ابھی ابھی دفنایا گیا ہو...... اس کے جسم پر ایک بھی خراش نہیں آئی تھی۔ اسے دفنائے ہوئے بھی ایک لمبا عرصہ گزر گیا تھا...... اس کی ساتھ والی قبروں میں موجود ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چکی تھیں...... اور صرف اس شخص کی لاش بالکل ٹھیک تھی۔ پروفیسر امجد کے لئے...... یہ نا قابل یقین واقعہ تھا...... دراز قد، دبلا پتلا، سرخ و سفید رنگت اور سفید داڑھی والا وہ شخص...... ان کے لئے ایک چیلنج بن گیا تھا...... ایک سوال...... ایک معمہ...... راز......؟ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ مختلف کتابیں کھول کھول کر پڑھ رہے تھے...... مگر کوئی ایسی بات پتہ نہیں چل رہی تھی، جس سے وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچتے۔ اس شخص کی رنگت بھی خراب نہ ہوئی تھی۔ پروفیسر امجد...... تھک ہار کر کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر بیٹھ گئے، مگر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر اسی بوڑھے شخص کی لاش اور چہرہ گھومنے لگا...... جب سے انہیں وہ لاش ملی تھی وہ ایک دن بھی نہیں سو پائے تھے۔ مختلف سوالات ان کے ذہن کو ڈسٹرب کر رہے تھے...... اور وہ جتنی جدوجہد کر رہے تھے انہیں کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا وہ وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔

صبح بیدار ہوئے تو ان کا ذہن بہت تھکا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے بیزاری سے اٹھ کر دروازہ کھولا...... سامنے ان کا ملازم کھڑا تھا۔ اس نے انہیں ان کا موبائل پکڑایا۔

"جناب...... ڈاکٹر کیانی بہت دیر سے آپ کو کال کر رہے ہیں...... بیگم صاحبہ نے یہ موبائل دیا ہے کہ آپ ان سے بات کر لیں......"

نوجوان ملازم ان کا موبائل پکڑا کر چلا گیا۔

"ڈاکٹر کیانی......؟" وہ کیوں فون کر رہے ہیں، انہیں بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟" وہ سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر کیانی کا فون دوبارہ آ گیا۔

"ہیلو...... پروفیسر اسجد...... آپ کہاں ہیں۔" ڈاکٹر کیانی نے مسکرا کر پوچھا۔

"یونہی...... ایک ریسرچ میں مصروف تھا۔" پروفیسر اسجد علی نے جواب دیا۔

"مجھے بھی ایک ریسرچ کے سلسلے میں آپ کی مدد چاہئے...... آئی مین...... ایک ہزار سال پہلے انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر آپ کے ریسرچ پیپرز چاہئیں۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا تو پروفیسر اسجد ایک دم چونکے اور ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے۔

"ڈاکٹر کیانی...... انسانی جسم کی decomposition کب شروع ہوتی ہے اور maximum یہ Cycle کب تک مکمل ہوتا ہے؟" پروفیسر اسجد نے پوچھا۔

"کیا مطلب......؟ کیا آپ نہیں جانتے؟"

ڈاکٹر کیانی نے حیرت سے پوچھا۔

"جانتا ہوں...... مگر آپ سے کنفرم کرنا چاہتا ہوں......" پروفیسر اسجد نے جواب دیا۔

"انسان کے مرتے ہی یہ پروسیس شروع ہو جاتا ہے اور 365 دنوں میں انسان بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کیانی...... کیا یہ ممکن ہے...... کوئی مردہ جسم اسی سال کے بعد بھی فریش ہو؟"

"امپاسبل......" ڈاکٹر کیانی نے قطعیت سے جواب دیا۔

"کیا معجزانہ طور پر بھی نہیں؟"

"پروفیسر اسجد...... آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود بھی آپ معجزوں کی باتیں کر رہے ہیں...... پلیز آپ مجھے اپنے نوٹس Provide کر دیں جو انٹرنیشنل Journals میں شائع ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"یس آف کورس...... لیکن میں آپ سے ملنا بھی چاہتا ہوں......" پروفیسر اسجد نے جواب دیا۔

"اوکے...... ایز یو وش۔" ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا اور موبائل آف کر دیا۔

ڈاکٹر کیانی ملک کی مایہ ناز یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بائیوٹیکنالوجی کے علاوہ Human Body & Organ پر ان کی ریسرچ کا بہت چرچا تھا۔ انٹرنیشنل کانفرنسز میں پڑھی جانے والی ان کی ریسرچ رپورٹس کو بہت Appreciate کیا جاتا تھا۔

پروفیسر اسجد علی اور ڈاکٹر کیانی میں بہت گہری دوستی تھی...... ریسرچ کے مختلف شعبوں میں دونوں گھنٹوں بیٹھ کر سیر حاصل بحث کیا کرتے تھے۔ پروفیسر اسجد علی تمام ریسرچ شدہ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کیانی کے اسٹڈی روم میں بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر کیانی خوبصورت شخصیت کے سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ سفید بالوں اور نظر کی عینک لگائے وہ بہت سوبر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ذہین آنکھیں اک خاص چمک لئے ہوئے تھیں جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی متاثر کرتی تھیں۔

ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر اسجد علی کی بات بغور سنی اور عینک اتار کر ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے......

''آئی ڈونٹ بلیواٹ...... ہیومن باڈی کی Decomposition ایک نیچرل پراسیس ہے۔ باڈی کے تمام elements مٹی میں جانے سے پہلے ہی ایک cycle Natural کے ذریعے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں...... یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باڈی ویسی ہی ہو...... اسجد تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے......'' ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''پروفیسر مائیکل...... پروفیسر گریزی اور میں...... ہم تینوں نے، اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' پروفیسر اسجد علی نے جواب دیا۔

''اب وہ باڈی کہاں ہے......؟ ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

''اس کے قریبی علاقے کے لوگوں کو جیسے ہی خبر ملی وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور بہت عقیدت و احترام سے اسے دوبارہ دفنا دیا۔'' پروفیسر اسجد علی نے جواب دیا۔

''کیا اس لاش کا دوبارہ ملنا ممکن نہیں...... آئی مین...... ریسرچ کے لئے...... ممکن ہے ریسرچ رپورٹس کچھ اور ہی نکلیں......'' ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''ناممکن ہے۔ اس علاقے کے لوگ تو اس ڈیڈ باڈی کے بارے میں بہت پوزیسو ہو رہے تھے...... لیکن میں نے تحقیق کر لی تھی وہ اسی سال پرانی لاش تھی۔'' پروفیسر اسجد علی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کیانی ان کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئے۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ پروفیسر اسجد علی نے پوچھا۔

ڈاکٹر کیانی نے اپنی...... لائبریری میں سے انتہائی قدیم اور جدید موٹی کتابیں نکال کر ٹیبل پر رکھیں اور ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ''یہ دیکھو...... یہاں لکھا ہے کہ انسان کے مرتے ہی اس کی Decomposition (گلنا سڑنا) شروع ہو جاتی ہے...... اور یہ پروسیس جسم کے اندر اور باہر دونوں اطراف سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے ہی سانس رکتی ہے اور دل دھڑکنا بند کرتا ہے تو جسم کے تمام Cell بھی مر جاتے ہیں اور جسم بیکٹیریا سے لڑنے کی قوت نہیں رکھتا۔ Cells کے اپنے Enzymes اور بیکٹیریا کے Enzymes لاش کو Decompose کرتے ہیں۔ جس سے Skin کی اکڑن ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مرتے ہی مکھیاں لاش کے نتھنوں اور منہ کے پاس ایسے انڈے دیتی ہیں جن میں موجود لاروا لاش کو Decomposition کے عمل کو تیز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ Decomposition کے Five Steps پانچ مراحل بھی یہاں لکھے

ہیں......" ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر اسجد علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے ان کی جانب دیکھنے لگے......

"پہلا مرحلہ Initial decay جس میں مرنے کے تین دن تک جسم ظاہری طور پر ٹھیک تو نظر آتا ہے مگر اس کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ انتڑیوں میں موجود بیکٹر یا انتڑیوں میں موجود مواد کو کھانا شروع کرتے ہیں۔ آخر کار یہ بیکٹر یا جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل کر انہیں ہضم کرنے لگتے ہیں اور انتڑیوں اور معدے میں خوراک کو ہضم کرنے والے Enzymes پھٹ کر معدے اور انتڑیوں سے خارج ہو کر جسم کے مختلف حصوں میں پھیل کر انہیں بھی ہضم کرنے لگتے ہیں اور بیکٹر یا اس عمل کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ Cells کے اندر موجود Enzymes خارج ہو جاتے ہیں اور Cells کو ہضم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ Putrefaction ہے۔ مرنے کے بعد دس دن تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ بیکٹر یا کی وجہ سے Cells کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی گیسیں ہائیڈ روجن سلفائیڈ، میتھین اور دوسری بدبودار گیسیں حشرات الارض کی پسندیدہ ہوتی ہیں اور وہ اس کی جانب تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ان گیسوں کی بو سے جسم پھول جاتا ہے اور Cells سے مواد اور خون مائع کی صورت میں باہر آ جاتا ہے۔ بیکٹر یا اور کیڑے مکوڑے ان کو مزید خوراک مہیا کرتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ Black Putrefaction ہے۔ یہ مرحلہ مرنے کے 10-20 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ Blotle باڈی بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ گوشت مائع یعنی کریم کی طرح مائع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے ظاہری حصے سیاہ ہو جاتے ہیں اور جسم سے بدبو آنے لگتی ہے۔ بہت سے مواد مائع کی صورت میں جسم سے بہہ کر مٹی میں جذب ہونے لگتے ہیں...... جو زیادہ تر حشرات اور کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بنتے ہیں...... یہ کیڑے مکوڑے جسم کی Cavaties میں داخل ہو کر اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں...... اگر کیڑے مکوڑے نہ بھی ہوں تو وہاں موجود بیکٹر یا بھی جسم کو ہضم کر لیتے ہیں۔ ان حشرات کی وجہ سے جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھ جاتا ہے۔

چوتھا مرحلہ Butyric Putrefaction مرنے کے 22-50 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ جسم پر موجود گوشت اس عرصے کے دوران ختم ہو جاتا ہے اور جسم خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی Cheesy Smell زمین میں موجود حشرات کو یعنی Moths کو Attract کرتی ہے۔ Moths خشک اکڑے ہوئے گوشت کو نہیں کھا سکتے جبکہ کھٹمل ان کو چبا چبا کر کھاتے ہیں جیسے Skin یا Legament کو۔

پانچواں مرحلہ Dry Decay 50-365 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ جس میں جسم خشک ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ بیکٹر یا بالآخر لاش کے بال بھی کھا لیتے ہیں اور صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں...... یہاں ہڈیاں عموماً غیر یقینی طور پر باقی رہ جاتی ہیں۔ لاش کے گلنے سڑنے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر انسانی جسم کو مرنے کے بعد ان تمام مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"ڈاکٹر کیانی...... ممکن ہے Climate کی وجہ سے اس لاش کا Decay نہ ہوا ہو۔" پروفیسر اسجد علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اسجد...... پھر بھی یہ ممکن نہیں...... مرطوب زمین میں موجود حشرات اور زمین کا درجہ حرارت ان مراحل پر ہر صورت میں اثر انداز ہوتا ہے۔ Decomposition کا پروسیس سردیوں کی نسبت گرمیوں میں تیز ہوتا ہے۔ اس طرح گرم علاقوں میں دوگنا اور پانی میں یہ عمل قدرے

ست ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی اتنے سالوں تک کوئی لاش بھی باقی نہیں رہتی۔......" ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی Cells باقی رہ گئے ہوں اور انکی وجہ سے جسم Decomposition نہ ہوئی ہو۔" پروفیسر امجد علی نے پھر پوچھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں...... جسم کے مرنے کے ساتھ ہی Cells کو اور ٹشوز کو آکسیجن مہیا ہونا رک جاتی ہے اور وہ تیزی سے مرنے لگتے ہیں...... سب سے پہلے برین سیلز 7-3 منٹ کے اندر مر جاتے ہیں اور جلد کے Cells 24 گھنٹوں کے بعد مر جاتے ہیں اور لاش کو دفنانے کے فوراً بعد Decomposition کا عمل قدرتی طور پر شروع ہو جاتا ہے اور یہ نیچرل پروسیس ہے۔کیا وہ لاش بہت زیادہ گہرائی سے نکلی تھی، کیونکہ اکثر لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے بہت زیادہ گہرائی میں دفنایا جاتا ہے؟" ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

"ہاں...... لیکن اس کے ساتھ کوئی کیمیکلز نہیں تھے اور نہ ہی قدیم مصری لاشوں کی طرح اسے حنوط Mumify کیا گیا تھا، بلکہ اس کے جسم سے ایک مخصوص خوشبو آرہی تھی......" پروفیسر امجد علی نے کہا۔

"کیسی خوشبو......؟" ڈاکٹر کیانی نے چونک کر پوچھا۔

"جیسے کسی عطر کی......" پروفیسر امجد علی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"امجد...... تم کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"کیسی باتیں......؟ پروفیسر امجد علی نے پوچھا

"ناممکن......" ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

"کیا آپ اسے معجزہ نہیں سمجھتے......؟ پروفیسر امجد علی نے پوچھا۔

"تم...... کیا منوانا چاہتے ہو......؟ کیا یہ کوئی معجزہ ہے......؟ اگر ایسی بات ہے تو میں اسے ہرگز معجزہ نہیں مانوں گا......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"کیوں......؟" پروفیسر امجد نے پوچھا۔

"ممکن ہے تم سے کہیں غلطی ہوگئی ہو...... کیا تم لوگوں نے اسے Rigor mortis کے ذریعے Assess کیا تھا......؟" ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

"ہاں...... اسی سے تو پتہ چلا تھا کہ یہ اسی سال پرانی لاش ہے......" پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

"امجد...... تم مجھے کنفیوز کر رہے ہو......" ڈاکٹر کیانی نے جھنجھلا کر کہا۔

"کنفیوز...... تو میں خود ہو رہا ہوں...... سمجھ میں نہیں آرہا...... حقیقت کیا ہے......؟" پروفیسر امجد نے جواب دیا۔

"تم کیوں الجھ رہے ہو...... چھوڑو...... اسے اور اپنا کام کرو...... جتنا سوچو گے اتنے ہی کنفیوز ہو گے......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"ریسرچ میرے پروفیشن کی Base ہے...... کیسے نہ سوچوں......؟" پروفیسر امجد علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم اسی کو ریسرچ کرو اور کسی ٹاپک پر اپنا وقت صرف کرو۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

''ڈاکٹر کیانی.....جسم کا جو حصہ تکلیف دیتا ہے.....کیا آپ اسے یونہی چھوڑ دیتے ہیں.....یا اس کا علاج کرتے ہیں.....؟'' پروفیسر اسجد علی نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے.....یار.....تم ریسرچ کرو.....مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ.....اتنا سوچوں اور وہ بھی ایک.....اسی سالہ پرانی لاش کے بارے میں.....مجھے تو اپنا ریسرچ ورک مکمل کرنا ہے۔'' ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر اسجد کے دیئے ہوئے ریسرچ پیپرز اٹھائے اور باہر چلے گئے۔

پروفیسر اسجد کی سوچیں پھر انہیں مضطرب کرنے لگیں.....وہ آنکھیں بند کرتے تو.....وہی لاش ان کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتی.....ان کا ملازم چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر لایا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا.....

''اوہ.....صاحب.....مہمان کہاں چلے گئے؟'' ملازم نے کہا تو پروفیسر اسجد علی نے چونک کر.....نوجوان ملازم فیروز خان کی طرف دیکھا۔

''فیروز خان.....کبھی تم نے کئی سال پرانی لاش.....بالکل ٹھیک حالت میں دیکھی ہے؟'' پروفیسر اسجد نے پوچھا۔

''کبھی نہیں صاب.....'' فیروز خان نے جواب دیا۔

''کبھی سنا بھی نہیں.....؟'' پروفیسر اسجد نے پوچھا۔

''ہاں.....کبھی کبھار.....گھر کے بزرگوں سے سنتے تھے.....'' فیروز خان نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے.....ایسا ہونا ممکن ہے.....'' پروفیسر اسجد علی بڑبڑائے۔

''ہاں.....بالکل.....'' فیروز خان قطعیت سے بولا۔

''فیروز خان.....مجھے اس کے بارے میں مزید کون بتا سکتا ہے؟'' پروفیسر اسجد علی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے.....گورکھن سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بتا سکتا.....؟'' فیروز خان نے کہا۔

''گورکھن.....؟'' پروفیسر اسجد علی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....قبروں اور مردوں کے بارے میں معلومات اس سے زیادہ اور کون دے سکتا ہے۔ جس نے ساری زندگی قبرستان میں قبروں کی کھدائی کرنے اور مردوں کو دفنانے میں گزاری ہو۔'' فیروز خان نے پُر مطمئن انداز میں جواب دیا تو پروفیسر اسجد علی گہری سوچ میں ڈوب گئے.....فیروز خان انہیں کہیں اور گم دیکھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ پروفیسر اسجد علی شہر کے مختلف قبرستانوں میں گھوم پھر کر اب شہر کے سب سے بڑے اور پرانے قبرستان میں گئے تھے۔ ہر طرف خاموشی.....مٹی کے تازہ اور پرانے ڈھیر ایسا ہولناک منظر پیش کر رہے تھے کہ پروفیسر اسجد علی کا دل ایک لمحے کو دہل گیا.....انہوں نے بڑے وسیع اور پرانے کھنڈروں میں کھدائی اور ریسرچ کی تھی مگر کبھی ایسے احساسات سے دوچار نہیں ہوئے تھے.....جن سے اب ہو رہے تھے.....وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے رہے، کچھ قبروں پر اکا دکا لوگ نظر آئے، مگر وہ کہیں نظر نہ آیا.....جس کی انہیں تلاش تھی اور قبرستان اتنا وسیع تھا کہ اسے ڈھونڈنا قدرے مشکل لگ رہا تھا۔ اچانک ایک دس سالہ لڑکا کہیں سے نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے خالی لفافے میں قبروں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سے تازہ پھولوں کو چن چن کر لفافے میں ڈالنا شروع کر دیا۔ پروفیسر اسجد علی درخت کی اوٹ میں چھپ کر اسے دیکھنے لگے۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو......؟'' اچانک پروفیسر اسجد علی نے سامنے آ کر پوچھا......

''ک......ک......کچھ نہیں۔'' وہ لڑکا گھبرا گیا اور لفافہ وہیں پھینکا اور اٹھ کر بھاگنے لگا۔

پروفیسر اسجد علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو زور سے اپنے ہاتھ میں پکڑا۔

''کیا تم یہاں رہتے ہو......؟''

''ہاں......نہیں......نہیں......'' اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

''میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا......مجھے صاف صاف بتاؤ تم کون ہو......؟'' کیا یہیں رہتے ہو؟

''ہاں......اپنے ابا کے ساتھ......'' وہ لڑکا گھبرا کر بولا۔

''مجھے تمہارے باپ سے ملنا ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' پروفیسر اسجد علی نے قدرے رعب سے کہا۔

''صاحب......آپ مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کریں گے اور ابا کو بھی نہیں بتائیں گے نا......میں یہ سب آئندہ نہیں کروں گا۔'' لڑکے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''کیا......؟'' پروفیسر اسجد علی نے چونک کر پوچھا۔

''یہی......کہ میں قبروں سے پھول اٹھا کر انہیں بیچتا ہوں۔'' لڑکے نے سر جھکا کر کہا۔

''کیا تم یہ کام کرتے ہو؟'' پروفیسر اسجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......مگر اب ایسا نہیں کروں گا......'' لڑکے نے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......آئندہ تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں پولیس کے پاس لے جاؤں گا۔ مگر ابھی مجھے تمہارے باپ سے ملنا ہے۔'' پروفیسر اسجد علی نے کہا۔

''کیوں......؟ لڑکے نے گھبرا کر پوچھا۔

''مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا......؟'' لڑکے نے چونک کر پوچھا۔

''قبروں اور مردوں کے بارے میں۔''

''کیوں......؟'' کیا آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں؟'' لڑکے نے سوال کیا۔

''کتاب......؟ کیا مطلب......؟'' پروفیسر اسجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......بہت سے لوگ ابا کے پاس اس کام کے لئے آتے ہیں......'' لڑکے نے کہا۔

''ہاں...... ایسا ہی سمجھو...... مجھے جلدی ان کے پاس لے چلو......، اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔'' پروفیسر اسجد نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا تو لڑکا خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا اور مختلف راستوں سے ہوتا ہوا ایک خستہ حال کچے مکان میں داخل ہوا...... ایک ادھیڑ عمر شخص چار پائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ کچے صحن کے ایک کونے میں ایک ادھیڑ عمر عورت لکڑیاں جلا کر...... روٹیاں پکانے میں مصروف تھی...... کچھ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔

پروفیسر اسجد علی...... اس لڑکے کے ہمراہ صحن میں داخل ہوئے...... چار پائی پر بیٹھا شخص انہیں دیکھ کر چونکا اور چار پائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا...... اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''ابا...... صاب نے کتاب لکھنی ہے...... تجھ سے ملنے آئے ہیں۔'' لڑکے نے جلدی سے تعارف کرایا۔

''آؤ...... بیٹھو...... ادھر...... صاب جی۔'' اس کا باپ خوش ہو کر بولا۔

''مجھے...... آپ سے کچھ معلومات لینی ہیں...... میرا نام اسجد علی ہے...... اور......'' اسجد علی نے اپنا تعارف کرانا چاہا...... مگر...... طفیلے نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

''جا...... ماں سے کہہ...... روٹی لائے۔'' طفیلے نے کہا تو اسجد علی نے اسے زبردستی روکا۔ ''مجھے کسی بھی شے کی طلب نہیں...... بس کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں...... رات ہو رہی ہے اور مجھے واپس گھر بھی پہنچنا ہے......'' اسجد علی نے کہا۔

''پوچھو...... کیا پوچھنا چاہتے ہو...... ویسے میرا نام محمد طفیل ہے مگر سب طفیلا کہتے ہیں۔ پانچ بچوں اور بیوی کے ساتھ اس جگہ رہتا ہوں...... گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔'' طفیلے نے جلدی جلدی بتایا جیسے وہ اپنا انٹرویو دے رہا ہو۔

''مجھے آپ کے بارے میں نہیں...... کسی لاش کے بارے میں معلومات چاہئے......'' اسجد علی نے کہا تو طفیلے نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' طفیلے نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ نے کبھی کوئی ایسی لاش دیکھی ہے جو ستر، اسی سال پرانی ہو اور وہ بالکل ٹھیک حالت میں ہو...... اس کا کفن بھی خراب نہ ہوا ہو......'' اسجد علی نے پوچھا۔

''صاب میری تو اپنی عمر پچاس سال ہے...... اسی برس کی لاش کہاں سے دیکھوں گا......'' طفیلے نے کہا۔

''کیا آپ کو کبھی اتفاق نہیں ہوا...... میرا مطلب ہے کوئی عجیب اور انوکھا واقعہ دیکھنے، سننے میں آیا ہو......'' اسجد علی نے پوچھا۔

''ہاں کبھی کبھار کسی قبر کے پاس سے گزرو تو اچانک گندی سڑاندی بدبو آتی ہے...... اور کبھی کسی کے پاس سے خوشبو آتی ہے...... اور......'' طفیلا سوچنے لگا۔

''اور...... کیا......؟'' اسجد علی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''اور کبھی کچھ نہیں...... اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بندے کے ساتھ اندر قبر میں کیا ہوتا ہے...... یہ تو اس کے ہی راز ہیں اور وہ اپنے راز کسی کو نہیں بتاتا۔'' طفیلے نے کہا۔

''مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسی سالہ بزرگ کی لاش بالکل صحیح سلامت دیکھی ہے......اس لاش کی داڑھی کے بال اور ناخن تک بھی خراب نہیں ہوئے تھے۔'' اسجد علی نے گہری سانس لیتے ہوئے بتایا۔

''ہاں میرا ابا......بھی بتایا کرتا تھا......مگر میں نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے ایسی لاش نہیں دیکھی......'' طفیلے نے حقہ پیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے والد کہاں ہیں......؟'' اسجد علی نے پوچھا۔

''وہ بیمار ہے......اندر کمرے میں ہے......اٹھ نہیں سکتا......'' طفیلے نے کہا۔

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟'' اسجد نے پوچھا۔

''ہاں......چلو......'' طفیلا اس کے ساتھ اٹھ کر قدرے فاصلے پر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا جس میں ہر طرف تاریکی تھی۔ طفیلے نے آگے بڑھ کر زیرو کا بلب آن کیا تو ایک نحیف ونزار بوڑھا آدمی پرانی چارپائی پر لیٹا تھا۔ کمرے میں روشنی دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے......کون ہے......؟'' بوڑھا بوکھلا کر بولا۔

''ابا......میں ہوں......طفیلا......ایک صاب جی آئے ہیں......تجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'' طفیلے نے ایک پرانی خستہ حال کرسی، چارپائی کے قریب رکھی اور اسجد علی کو بیٹھنے کو کہا۔ اسجد علی بیٹھ گیا اور بوڑھے کی جانب دیکھنے لگا، بوڑھا انتہائی لاغر اور عمر رسیدہ شخص تھا۔

''مجھ سے بھلا کیا پوچھنا ہے......مجھے تو اپنی خبر نہیں۔'' بوڑھے نے مایوسی سے کہا۔

''ابا......کیا تو نے کبھی کوئی پرانی لاش ٹھیک اسی حالت میں دیکھی ہے، جس حالت میں اسے دفنایا گیا ہو......؟'' طفیلے نے پوچھا تو بوڑھے کی آنکھیں ایک دم چمکیں اور وہ اسجد علی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

''ہاں......دو......بار......ایک بار ایک مرد کی لاش اور دوسری بار ایک عورت کی۔ مرد کی لاش......سو سال پرانی تھی اور عورت کی ساٹھ سال......دونوں کے کفن بھی سلامت تھے اور جسم بھی۔'' بوڑھا بولا۔

''یہ......یہ کیسے ممکن ہے......؟'' اسجد علی پریشانی سے بولا۔

''اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے، اللہ والوں کے جسموں کو نہ زمین کھاتی ہے اور نہ ہی زمین کے کیڑے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''اللہ والے......؟ کیا مطلب......؟'' اسجد علی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''ہاں..........اللہ کے سچے اور خالص بندے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا......سب انسان اللہ کے بندے نہیں......کیا اس نے سب کو پیدا نہیں کیا......یا پھر اللہ کے بندے کوئی اور ہوتے ہیں؟'' اسجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہم سب اللہ کے بندے ہیں مگر اللہ والے نہیں......'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''اللہ والے......؟ کیا وہ کوئی خاص لوگ ہوتے ہیں......؟'' اسجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......وہ......جن میں اللہ خود بولتا ہے۔اللہ خود دیکھتا ہے......خود سنتا ہے......خود بات کرتا ہے......''بوڑھے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟ آپ تو مجھے الجھا رہے ہیں......میں نے تو آج تک زندہ انسانوں میں ایسا انسان کبھی نہیں دیکھا......''اسجد علی نے جھنجھلا کر کہا۔

''بند آنکھوں سے......انسان......سوائے اندھیرے کے......اور کیا دیکھ سکتا ہے۔اللہ والوں کو اندر کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔وہ کوئی عام انسان تھوڑا ہوتے ہیں جو ہر ایک کو دکھائی دیں......باؤ......ان کی خوشبو بھی مختلف ہوتی ہے......ہمیں......تمہیں......بھلا وہ کہاں دکھائی دیں گے......اور وہ بھی خوش نصیب ہوتے ہیں جن سے اللہ اپنے ایسے بندوں کو ملاتا ہے۔''بوڑھے نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ کے خیال میں بہت نیک اور عبادت گزار اللہ والے ہوتے ہیں؟''اسجد علی نے پوچھا۔

''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے......کون اس کے قریب ہے......صرف عبادت گزار یا صرف اس سے محبت کرنے والا......''بوڑھے نے کہا۔

''آپ اللہ والا کس کو کہتے ہیں؟''اسجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''جس کو دیکھ کر اللہ خود بخود یاد آ جائے۔''بوڑھے نے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

''کیا آپ نے کبھی کسی اللہ والے سے ملاقات کی ہے......؟''اسجد علی نے پوچھا۔

''بہت کوشش کی......مگر میں اتنا خوش قسمت کہاں......مگر ان کے مرنے کے بعد دیدار ضرور ہوا......کیا خوبصورت......چمکتے چہرے تھے، نور برس رہا تھا......ان کی پیشانیوں سے اور جسم یوں نرم گرم تھے جیسے ابھی سانسیں رکی ہوں......یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھیں بند کئے سو رہے ہوں، اور ان کے جسموں سے خوشبو آ رہی ہو......''بوڑھے نے مسکرا کر بتایا۔

''بابا......یہی تو سمجھ نہیں آ رہا......کیا ان خاص لوگوں کے جسم کسی اور شے سے بنے ہوتے ہیں کہ وہ مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہوتے......جبکہ دوسرے انسان مٹی میں دفن ہو کر ایک سال کے اندر گل سڑ جاتے ہیں......''اسجد علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''بیٹا......اللہ کے راز وہی جانتا ہے......مجھ ان پڑھ کو کیا خبر......؟ کسی علم والے سے پوچھو، ہوسکتا ہے وہ تمہیں کچھ بتا سکے۔''بوڑھے نے جواب دیا۔اسجد علی نے آہ بھر کر بوڑھے کی جانب دیکھا اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپس لوٹ آیا۔ان کا ذہن مزید الجھ گیا تھا اور تجسس بھی ہو رہا تھا۔زندگی میں پہلی بار''انسان''ایک چیلنج بن کر ان کے سامنے آیا تھا......آغاز بھی مبہم تھا اور انجام اس سے بھی مبہم......اسجد علی کا ذہن انتہائی منتشر ہو گیا تھا۔

''ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے......درخت کتنا مضبوط ہے......زمین میں پھیلی اس کی جڑیں اس کا پتا دیتی ہیں......اور انسان کیا ہے......؟ کتنا قدیم......زمین میں چھپے تاریخی آثار اس کی خبر دیتے ہیں......مگر یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ہر قدیم زمانے کا انسان موجودہ دور اور موجودہ دور کا انسان آنے والے ادوار میں ہمیشہ ایک چیلنج ہی رہے گا۔مٹی کے پتلے، نطفے اور Cells سے تخلیق اور پروان چڑھنے والے انسان کی اصل حقیقت کیا ہے......؟ وہ نہ تو کسی سائنسی کلیئے، مفروضے یا تحقیق پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی عقلی اور منطقی دلیل پر، پروفیسر اسجد علی نے اپنی ساری زندگی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

انسان کے بارے میں تاریخی شواہد اور آثار اکٹھے کرنے میں گزار دی تھی مگر آج نتیجہ صفر نکلا تھا۔ ان کی تمام ریسرچ پر پانی پھر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر انسانوں کی جو تاریخی درجہ بندی کی تھی......وہ بے سود ثابت ہوئی تھی......انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جو علم اور تجربہ انہوں نے حاصل کیا تھا۔ وہ بے کار ثابت ہوا تھا۔

''مٹی سے تخلیق ہونے والا انسان مٹی میں دفن ہو کر فنا ہو جاتا ہے......'' غلط ثابت ہوا تھا......بوڑھے، ان پڑھ گورکن کی سادہ باتوں نے اسجد علی......کی سوچ اور تجربے کو جھٹلا دیا تھا......وہ بہت مضطرب ہو رہا تھا۔ رات گئے فیروز خان اس کے کمرے میں آیا......وہ بیڈ پر لیٹا بے یقینی سے چھت کر گھور رہا تھا۔ آج نہ تو اس کے بیڈ پر کتابیں بکھری تھیں اور نہ ہی اس کے سوئے ہوئے سر پر کھلی پڑی تھی۔ فیروز خان نے دودھ کا گلاس اس کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''صاب......دودھ رکھ دیا ہے......پی لیں۔'' فیروز خان نے کہا......اسجد علی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''فیروز خان......میں آج قبرستان گیا تھا، بوڑھے گورکن سے بھی ملا تھا......'' اسجد علی بولا۔

''اچھا......'' فیروز خان متجسس ہو کر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔

''اس نے بتایا کہ اس نے دو بار ایسے مردے دیکھے ہیں......جن کے کفن تک بھی محفوظ تھے۔''

''ہاں......وہ بتا رہا تھا کہ اللہ والوں کے جسم کبھی فنا نہیں ہوتے۔'' اسجد علی نے کہا۔

''ہاں......اس نے ٹھیک کہا ہے......ہمارے گاؤں میں مولوی صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے......اور مولوی صاحب کو قدرت نے بڑے نظارے کرائے تھے......وہ ایسی عجیب عجیب باتیں سناتے تھے کہ ہم حیران رہ جاتے تھے......اس وقت تو ہم نا سمجھ تھے......ان کی باتوں پر یقین ہی نہیں کرتے تھے......بلکہ ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے مگر اب سوچیں تو......یقین بھی آتا ہے اور حیرانگی بھی ہوتی ہے کہ ہم اتنے نا سمجھ کیوں تھے......'' فیروز خان نے افسردگی سے کہا۔

''کیا......وہ اللہ والے تھے؟'' اسجد علی نے پوچھا۔

''یقیناً ہوں گے......ان سے بڑھ کر نیک پورے گاؤں میں کوئی اور نہیں تھا......'' فیروز خان نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا وہ زندہ ہیں یا مر گئے؟'' اسجد علی نے پوچھا۔

''کئی سال پہلے وہ حج کرنے گئے اور وہیں مر گئے......اور انہیں وہیں دفنا دیا گیا......خوش قسمت تھے......جنہیں وہاں کی مٹی نصیب ہوئی۔'' فیروز خان اپنی ہی لے میں بولا۔

''فیروز خان......کیا تم کسی اور اللہ والے کو جانتے ہو......'' میں جب تک کسی ایسے انسان سے مل نہیں لیتا......مجھے قرار نہیں آئے گا......میں اپنے اندر بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں......'' اسجد علی نے مضطرب ہو کر کہا۔

''نہیں صاب......میں نے تو مولوی صاحب کے بعد ان جیسا کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا......'' فیروز خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا

تو اسجد علی نے آہ بھر کر مایوسی سے اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گیا...... فیروز خان چند ثانیے اسے دیکھتا رہا اور پھر واپس کمرے سے باہر نکل گیا۔

''مولوی صاحب......'' اسجد علی کے ذہن میں ایک شبیہہ ابھری...... قدرے ادھیڑ عمر...... مولوی چراغ دین...... اس کے گاؤں میں بہت علم والے نیک...... مذہبی اور روحانی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ اس کے والد کے قریبی دوست ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ان کے گھر بھی آتے جاتے تھے مگر اسجد ان دنوں انتہائی اکھڑ اور بدمزاج نوجوان تھا مولوی صاحب اور ان کی دینداری کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے نزدیک دین محض چند نظریات کا نام تھا۔ ان نظریات کو اعتقاد بنا کر اندھا دھند ان کی پیروی کرنا انتہائی حماقت کی بات تھی۔ اس کے والدین سیدھے...... سادھے...... اور سچے ایمان کے حامل مسلمان تھے...... اسجد کے بدلتے ہوئے نظریات سے اس کا باپ یار محمد بہت خائف ہونے لگا تھا۔ ہر وقت دونوں میں تکرار اور بحث ہوتی رہتی۔ یار محمد تو غصے میں اسے کافر تک کہہ دیتا اور اس کی ماں دونوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے ماں باپ دن بھر زمیندار کے کھیتوں میں کام کرتے، ان کی حیثیت کمیوں کی سی تھی اور اسجد علی انہیں دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ بہت کو مپلیکسز اپنے اندر لے کر جوان ہوا تھا...... ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے اندر...... نفرت اور حسد کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے...... جب سے وہ شہر میں...... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگا تھا۔ اس کے نظریات مزید تیزی سے بدلنے لگے...... جب اس نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کی تو اس کے ماں باپ کو شدید دھچکا لگا اور انہوں نے زندگی بھر اس سے نہ ملنے کا عہد کیا...... مگر اینا سے اس کی شادی ایک سال بھی نہ نبھ سکی اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اسجد انتہائی ڈپریشن میں تھا اور اس ڈپریشن میں اسے پھر والدین کی یاد ستانے لگی۔ وہ روتا ہوا والدین کے پاس آیا اور ان سے گڑگڑا کر معافی مانگی۔

''علم انسان کو سنوارتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے...... اور تیرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اس نے تجھے سنوارا کم اور بگاڑا زیادہ ہے......'' اس کے باپ نے غصے سے کہا۔

''معلوم نہیں...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اینا اور میں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے پھر نجانے محبت کیسے نفرت میں۔''

''محبت کبھی نہیں بدلتی...... ہمیشہ بڑھتی ہے اور جو بدل جائے وہ محبت نہیں ہوتی تم دونوں میں محبت تھی ہی نہیں......'' یار محمد نے کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں......؟'' اسجد نے چونک کر پوچھا۔

''کیا...... تمہارے دل نے میری اس بات کو نہیں مانا...... سچ بتاؤ......'' یار محمد نے پوچھا تو اسجد نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''بیٹا...... میں ان پڑھ ضرور ہوں مگر جاہل نہیں۔ میرے پاس علم نہیں مگر زندگی کا تجربہ ضرور ہے اور پروردگار نے عقل سمجھ بھی دی ہے...... تمہارے علم نے تمہیں سرپھرا بنا دیا ہے۔ تمہاری عقل پر پردے ڈال دیئے ہیں اور میری عقل کو رب پاک نے اپنے کرم سے پختہ بھی بنایا ہے اور...... تمام شک وشبے بھی دور کیے ہیں۔ میری عقل، یقین، ایمان واضح اور پختہ ہے...... تم جیسے لوگ بہت آسانی سے بھٹک سکتے ہو ہم جیسے نہیں۔ تو نے زندگی کا پہلا فیصلہ اپنی مرضی سے کیا اور اس کا انجام خود ہی دیکھ لیا...... اب ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟ یار محمد نے خفگی سے کہا۔

''ابا جی...... میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا...... اینا اور میں...... شروع سے ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتے رہے تھے۔'' ''اسی لئے تیرے دماغ میں فتور آتا گیا...... الٹی سیدھی باتیں کرتا تھا...... کبھی تجھے مذہب برا لگتا تھا، کبھی والدین...... اور تو نے تو اللہ کو بھی نہ چھوڑا...... اس کے بارے میں بھی اول فول بکتا رہا۔ بیٹا...... تیرے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا...... مجھے یقین تھا...... ایک دن تو...... یونہی شکست کھا کر آئے گا۔'' یار محمد نے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سنجیدگی سے کہا تو اسجد علی نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ نے مجھے کوئی بددعا دی تھی......؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا......تو......دعا......اور بددعا پر یقین رکھتا ہے؟'' یار محمد نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو اسجد شرمندہ ہو گیا۔

''بیٹا...... تجھے ایک نیک ماں نے دودھ پلایا ہے...... وہ صرف دودھ نہیں تھا اس میں اس کے ایمان کی شیرینی تھی اور میں نے تجھے حق حلال کی کمائی کھلائی تھی اور حق حلال کی کمائی میں جب محنت کا پسینہ شامل ہوتا ہے تو وہ عام رزق نہیں رہتا پاکیزہ رزق بن جاتا ہے......ہم نے تجھے پاکیزگی کا تحفہ دیا اور تم نے اس پاکیزگی کو اردگرد پھیلی بناوٹ اور بے ایمانی سے خراب کرنا چاہا...... مگر بھول گئے کہ جیت ہمیشہ حق سچ اور ایمان کی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور بے ایمانی کبھی فتح یاب نہیں ہوتے...... یہ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے...... ہم نے تجھے اختیار دیا...... جو تو چاہتا ہے...... کر...... ہمارے روکنے سے تو کبھی باز نہ آتا......اور تو نے جو کیا...... وہ دیکھ بھی لیا...... تجھے شکست ہی ہونی تھی۔'' محمد یار نے قطعیت سے کہا تو اسجد نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ابا......میرے لئے دعا کریں......کہ......'' اور وہ بری طرح سسکنے لگا۔

''ماں باپ...... ہمیشہ اولاد کے لئے دعائیں ہی کرتے ہیں...... یہ تو اولاد ہوتی ہے جو ان سے بدگمان ہوتی ہے۔'' یار محمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ابا...... میں آپ کو اور اماں کو اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا ہوں۔'' اسجد نے شہر واپس جانے سے پہلے کہا۔

''یہ ناممکن ہے......'' یار محمد نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' اسجد نے چونک کر پوچھا۔

''والدین کی عزت ان کے خود مختار رہنے میں ہے...... اولاد کو سہارا دینے کے بجائے جب وہ ان کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں تو بے عزت ہو کر رہ جاتے ہیں اور ہمیں اپنی عزت بہت پیاری ہے۔'' یار محمد نے قطعیت سے کہا تو اسجد حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور سن...... ہمیں کبھی روپیہ پیسہ بھیجنے کی کوشش بھی نہ کرنا...... میرے ہاتھوں کو صرف محنت کی کمائی لینے کی عادت ہے۔'' یار محمد نے کہا۔

''ابا جی...... مجھے کوئی تو حق ادا کرنے دیجیے۔'' اسجد نے آہ بھر کر کہا۔

''ہمارے ایمان اور عزت کا بھرم رکھ لو...... یہی سب سے بڑا حق ہوگا۔'' یار محمد نے کہا...... اسجد چونک کر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اب کی بار باپ کی باتوں نے اسے اندر سے جھنجھوڑا تھا ورنہ اس نے کبھی انہیں اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ اس کی سمجھدار باتوں سے ہمیشہ جھنجھلا جاتا تھا اور...... اب وہ باتیں بہت ذومعنی لگنے لگی تھیں۔

زندگی گزرتی گئی...... وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک چلا گیا...... آرکیالوجی کی فیلڈ میں اس نے بہت عزت اور شہرت کمائی۔ انٹر نیشنل یونیورسٹیز میں لیکچرز بھی دیتا، اپنے ملک کی مایہ ناز یونیورسٹی میں وہ ایک قابل استاد تھا۔ اس نے اپنی ایک کولیگ شیریں سے شادی کر لی...... وہ اچھی بیوی تو ثابت ہوئی مگر دونوں اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ زندگی میں یہ ایک ایسی کمی تھی، جس نے شیریں کو اندر سے بہت کھوکھلا کر دیا تھا۔ ہر

وقت اس کا بی پی ہائی رہتا، نہ وہ فیلڈ میں جاتی اور نہ ہی گھر سے باہر نکلتی...... نہ کسی پراجیکٹ میں دل لگتا اور نہ ہی کسی ایکٹویٹی میں۔" اسجد کے بہت سمجھانے کے باوجود بھی اس کا ذہن نہیں بدلا تھا اور اسجد نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنا وقت سٹڈی روم میں یا فیلڈ میں مختلف پراجیکٹس کی ریسرچ میں گزارتا تھا...... مہینوں گھر سے باہر رہتا...... اور گھر آتا تو شیریں کی اس میں عدم دلچسپی اسے اور بھی متنفر کر دیتی...... زندگی بہت روکھی اور بدمزہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں مجبور تھے کیونکہ پرابلمز دونوں میں ہی موجود تھے اور وہ اپنی اس محرومی اور کمی کا الزام ایک دوسرے کو بھی...... نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے دونوں مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ زندگیاں گزار رہے تھے۔ دونوں Speechless ہو گئے تھے، جیسے کہنے کو ان کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور بس خاموش رہتے۔ اسجد جو ہر شے کو قبول کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا تھا اور عقلی و منطقی دلائل کے بعد کسی شے کو مانتا تھا، اب قدرت کے سامنے بے بس ہونے لگا تھا۔ اپنی محرومی اور بدمزہ زندگی کے شکوے وہ اندر ہی اندر کرتا نہ تھکتا تھا...... اللہ اور اس کا تعلق کبھی اچھا نہیں رہا تھا۔

"اسے...... اللہ نے پیدا کیا ہے...... ایک نیچرل پروسیس کے ذریعے اور بس...... جو...... خدا نہ تو انسان کی دعائیں پوری کرے اور نہ اس کی محرومیاں دور کرے...... اس خدا کی انسان کو کیا ضرورت ہے...... وہ ہے اور ایک دن مر جائے گا...... مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گا اور پھر اس کا نام و نشان نہیں رہے گا...... اور اس کی کہانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی...... اس کے نزدیک ہر انسان کی کہانی کا یہی انجام ہونا ہے۔ زندگی کے بعد موت اور پھر فنا...... انسان کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے، کوئی نہیں جانتا...... کبھی کبھار زمین کی تہوں میں آثار اس کے ہونے کا پتا دیتے، مگر کوئی انسان فنا ہونے سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے......؟ جس کا جسم اسی سال گزرنے کے باوجود بھی فنا نہیں ہوا...... وہ شاید یہ دنیا ختم ہونے کے بعد بھی فنا نہیں ہو پائے گا...... زمین...... کی انتہائی گہرائی سے ملنے والی لاش نے اسجد علی کے نہ صرف نظریات کو چیلنج کیا تھا بلکہ...... اسے اندر سے بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا...... انسان...... انسان کی تاریخ...... اور...... انسان...... کے انجام کے بارے میں...... پروان چڑھنے والے تمام نظریات ایک ہی وار میں لڑکھڑا گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے انسان کو 'فنا' بھی ہے اور 'بقا' بھی...... فانی انسان کو کیا شے لافانی بناتی ہے......؟ وہ کیا شے ہے جو اسے ابدیت عطا کرتی ہے......؟ ایسے تمام خیالات نے اسے ایسے بلا کر رکھ دیا تھا کہ بے مقصدیت میں معنویت پیدا ہونے لگی تھی...... شکوک وشبہات اور بے یقینی کی فضا میں ایسی امید پیدا ہونے لگی تھی...... جس نے اسے ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا...... جہاں صرف سوالات ہی سوالات تھے، تجسس اور شوق تھا، بے یقینی اور اضطراب بھی تھا......

اچانک مولوی چراغ دین کی یاد کے ساتھ والدین گاؤں اور اس سے وابستہ بہت سی یادیں اسے ستانے لگیں اور اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا...... عرصہ دراز گزر چکا تھا...... اسے گاؤں گئے ہوئے...... کبھی کبھار ماں باپ کا خط آ جاتا اور وہ اپنی خیریت کا جواب دے دیتا یا پھر کبھی اچانک ہی انہیں ملنے چلا جاتا۔

☆

ٹرین کے سفر میں آج ہر شے اور ہر جگہ اسے ایک دوسری سے مختلف دکھائی دے رہی تھی...... یہاں تک کہ ایک پتھر اور درخت بھی دوسرے کے مشابہ نہیں تھا...... پھر مختلف شکلوں اور جسامت کے انسان کیسے ایک جیسے ہو سکتے ہیں...... لیکن انسانی اعضاء تو ایک جیسے ہوتے ہیں اور وہ

ایک جیسے افعال سرانجام دیتے ہیں، اگر کوئی مشین ایک جیسا کام کرتی ہے تو اس کی پروڈکشن بھی ہمیشہ ایک جیسی ہو گی..... ایک جیسے کام کرنے والے انسانی اعضاء کی صلاحیتیں مختلف کیوں ہیں.....؟

اور اس کے حق میں منطقی اور عقلی دلائل کیا دیئے جا سکتے ہیں.....؟

وہ بہت سوچتا رہا مگر اسے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا..... وہ بہت زیادہ الجھنے لگا تھا..... اور بہت سوچنے سے اس کا دماغ بھی تھکنے لگا تھا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے گاؤں کے ریلوے اسٹیشنز پر بھی رک رہی تھی اور سفر طویل ہوتا جا رہا تھا۔ مسافروں کو کوفت ہونے لگی۔ اسجد کو کوئی خبر نہیں تھی کہ اس کے سامنے والی سیٹ پر کون بیٹھا تھا..... اور کون اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

شام ہو رہی تھی اور سورج بھی سارے دن کا طویل سفر طے کر کے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا اور اس کے زرد چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی روشنی میں وہ جوش اور دم خم نہیں رہا تھا جو صبح اور دوپہر کو تھا..... رفتہ رفتہ شام کے ملگجے سائے ہر جانب پھیلنے لگے ٹرین انتہائی تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی تھی..... اسجد کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا وہ ریل کے ساتھ ساتھ اور پھر اچانک راستہ بدلنے والی پٹریوں کی جانب بغور دیکھتا رہا۔

''ذرا سا راستہ بدلنے سے منزل بدل جاتی ہے.....'' اس نے ٹرین کو اپنی پٹری بدلتے دیکھ کر سوچا۔

''انسان کی اصل منزل اور مقام کیا ہے.....؟ اتنے مختلف نظریات عقائد اور خیالات رکھنے والے انسانوں کی منزل ایک ہی کیسے ہو سکتی ہے.....؟ وہ اپنی سوچوں میں بری طرح ڈوب گیا تھا۔ رات گہری ہونے لگی..... ہر طرف گہری تاریکی چھانے لگی..... ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر چند منٹوں کے لئے رکی، اکا دکا مسافر اس میں سوار ہوئے اور پھر ٹرین چلنے لگی..... ٹرین میں مکمل خاموشی تھی، کسی کسی وقت اچانک کسی بچے کے رونے کی آواز یا کسی کی سرگوشیوں کی آوازیں ٹرین کے سکوت میں دراڑیں ڈال دیتیں اور اس سے خاموش لوگوں کے آرام میں خلل آتا۔

اچانک برق رفتار ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی، سب حیران رہ گئے۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا..... دونوں جانب وسیع و عریض کھیت تھے۔ شاید سامنے سے آنے والی ٹرین کا کراس تھا یا کوئی اور بات تھی..... کئی مسافر جلدی سے نیچے اترے تاکہ ٹرین کے اچانک رکنے کی وجہ معلوم کر سکیں۔

''ٹرین کے انجن میں خرابی ہو گئی ہے..... یہ خرابی کب دور ہو گی..... معلوم نہیں۔'' مسافر بڑبڑاتے ہوئے ٹرین ڈرائیور کو سے تو کوئی ریلوے انتظامیہ کو..... اب ٹرین کب چلے گی..... کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا..... ''انتظار''..... ایک ایسا عذاب تھا جو سب کو مضطرب کر رہا تھا۔ انتظار کی تکلیف دہ کیفیت سے گزرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ بچے چیخنے چلانے لگے۔ ہر طرف گرمی اور حبس تھا، کسی وقت ہوا کا جھونکا چلتا..... تو لوگ سکھ کا سانس لیتے..... جوں جوں وقت گزر رہا تھا لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا..... کچھ تو گالیاں بکنا شروع ہو گئے..... کچھ آپس میں ہی ایک دوسرے سے الجھنے لگے..... عجیب بدمزگی پیدا ہو رہی تھی..... سب بے بس تھے۔ پوری ٹرین کے لوگ مجبور بیٹھے تھے، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''یا اللہ! کوئی معجزہ ہی دکھا دے۔'' ایک عورت بلند آواز سے بولی تو اسجد نے چونک کر اس آواز کی جانب دیکھنا چاہا مگر اسے اندھیرے

میں کچھ نظر نہ آیا۔

''معجزہ......'' اس کے ذہن میں اس لفظ کی بازگشت ہونے لگی۔

لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگنے لگے مگر وہ خاموش مضطرب سا بیٹھا رہا۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ڈرائیور کو مار ہی ڈالیں...... کوئی خبر لاتا کہ انجن ٹھیک ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا، کوئی آ کر بتاتا اب ٹرین صبح ہی چلے گی...... ''صبح'' کے بارے میں سن کر سب لوگ بڑبڑانے لگتے...... کوسنے اور گالیاں بکنے لگتے......

ٹرین ساری رات بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ کبھی انہیں رات کی تاریکی خوفزدہ کرتی تو کبھی جانوروں کی آوازیں ڈرانے لگتیں...... کبھی ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ انہیں پریشان کرنے لگتا...... عجیب سی بے بسی اور ویرانی کا منظر تھا۔ ڈرائیور پر امید تھا کہ سامنے سے آنے والی کسی ٹرین کا ڈرائیور ان کی مدد کرے گا، مگر رات بھر کوئی ٹرین نہ آئی۔ یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی کہ رات بھر کوئی ٹرین ان کے پاس سے نہیں گزری تھی۔ ساری رات بہت پریشانی میں گزری...... لوگ پریشان ہو کر نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ ادھر ادھر پڑے رہے تھے...... کچھ گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے...... کچھ نیند کے باوجود بھی نہیں سو پا رہے تھے اور کچھ بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

صبح کا اجالا نمودار ہوتے ہی ٹرین میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی...... جو بھی خبر سنتا خدا کا شکر ادا کرتا کئی ایک تو خبر سن کر فوراً سجدہ ریز ہو گئے۔ دریا پر پل ٹوٹا ہوا تھا، رات کو آنے والی ٹرین دریا میں گر گئی تھی اور بہت سے لوگ دریا میں ڈوب کر مر گئے تھے، جو بھی سنتا اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ ہاتھ باندھ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔

''یہ تو بہت بڑا معجزہ ہوا ہے...... واقعی...... معجزہ اسے ہی کہتے ہیں۔'' اسجد کی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر ویل ڈریسڈ آدمی نے انتہائی شستہ لہجے میں کہا تو اسجد نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' اسجد نے پوچھا۔

''میں پروفیسر ہوں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کیا پڑھاتے ہیں۔'' اسجد نے پوچھا۔

''فلسفہ...... مگر سائیکالوجی، اسلامیات اور اردو میں بھی...... میں نے ماسٹرز کر رکھا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''آپ کا نام......؟'' اسجد نے پوچھا۔

''شمس مظہری......'' وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

آپ ''معجزہ'' کسے کہتے ہیں؟'' اسجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''جسے دیکھ کر عقل حیران رہ جائے۔'' شمس مظہری نے جواب دیا۔

''معجزے کا تعلق کس سے ہوتا ہے؟'' اسجد نے پھر پوچھا۔

''اللہ سے......''اس شخص نے جواب دیا۔

''اتفاقات اور حادثات بھی تو معجزے سے جنم لے سکتے ہیں۔''اسجد نے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟''شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''ممکن ہے جس کو آپ معجزہ سمجھ رہے ہوں وہ دوسروں کے لئے عام سی بات ہو......اس کی کوئی فطری یا سائنسی وجوہات بھی تو ہوسکتی ہیں......''اسجد نے جواب دیا۔

''یعنی کہ آپ معجزے کے باطنی اور روحانی پہلو سے انکار کر رہے ہیں۔''شمس مظہری نے پوچھا۔

''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بات آپ کے لئے معجزہ ہے......ممکن ہے میرے لئے نہ ہو۔''اسجد نے کہا۔

''کیا آپ اس ٹرین کے رکنے کی سائنسی وجہ یعنی اس کے انجن کی کوئی خرابی بتا کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں......ٹرین کے انجن کا اچانک خراب ہونا......اور یوں ادھر ٹھہر جانا......اور ان سب مسافروں کا بچ جانا معجزہ نہیں......بلکہ ایک قدرتی وجہ ہے۔''شمس مظہری نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید......''اسجد نے جواب دیا۔

اگر ٹرین کا انجن اسٹیشن پر ہی خراب ہو جاتا تو کوئی اس میں سوار نہ ہوتا......اور یوں اندھیرے میں ٹرین کو کھڑا کر کے لوگوں کو اب اس بات کا احساس دلانا کہ آگے سفر کرنا ان کے لئے کتنا نقصان دہ تھا......اور اب ان کا شکر ادا کرنا......معجزے کے روحانی پہلو کو خود بخود ہی ثابت کر رہا ہے......معجزہ اپنا آپ خود منواتا ہے......''پروفیسر شمس نے جواب دیا۔

''کیا آپ معجزوں کے قائل ہیں؟''اسجد نے پوچھا۔

''ہاں......اس لئے کہ 'معجزہ' اللہ کی ذات سے وابستہ ہے......اور انسان بھی تو اس کائنات کا معجزہ ہے۔''پروفیسر شمس نے کہا۔

''انسان......معجزہ کیسے ہوا؟''اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک جیسی جسامت، اعضاء اور ظاہری خدوخال رکھنے والے انسان اندر سے کتنے پیچیدہ اور مختلف ہیں......ایک شے کی مختلف شکلیں ہونا......اس کے اندر خوبیاں......اور خامیاں ہونا......معجزہ نہیں تو اور کیا ہے......یوں کہہ لیں قدرت نے پوری کائنات کو انسان کے سانچے میں ڈال دیا ہے۔ یوں جیسے دریا کو اک کوزے میں بند کر دیا ہے......انسان......پوری کائنات اپنے اندر لئے ہوئے ہے......''پروفیسر شمس نے کہا تو اسجد حیرت سے ان کی باتیں سننے لگا۔

''اور......اللہ......خود کیا ہے؟''اسجد نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''کیا آپ کو معلوم نہیں؟''پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''میرا علم آپ کے علم سے بہت مختلف ہے۔''اسجد نے جواب دیا۔

''آپ کا علم اس بارے میں کیا کہتا ہے؟''پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''ایک طاقت جس نے اس کائنات اور انسان کو بنایا ہے......اور......''اسجد الجھتے ہوئے بولا......

''بس اور کچھ نہیں؟''پروفیسر شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''اور......کیا......؟''اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ نے اس کو کہیں اور محسوس نہیں کیا؟''

''مثلاً......کہاں؟''اسجد نے پوچھا۔

''اپنے اندر......بہت اندر......''

''نہیں......''اسجد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کبھی بھی نہیں......؟''

''نہیں......''

''دل کے دھڑکنے......دماغ کے سوچنے......پیٹ کی طلب اور آنکھوں کے نور میں......کہیں بھی نہیں۔''پروفیسر شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سب کچھ تو جسمانی اعضاء کے فطری اور قدرتی عمل ہیں......اگر یہ اپنے افعال سرانجام نہیں دیں گے تو جسم کو ان کی کیا ضرورت ہو گی۔''اسجد نے جواب دیا۔

''کیا آپ اندر سے ویسے ہیں......جیسا آپ باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔''پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''شاید......ہاں......شاید......نہیں۔''اسجد نے بے چینی سے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

''مسٹر......''پروفیسر شمس نے کچھ کہنا چاہا۔

''اسجد......''اسجد جلدی سے بولا۔

''مسٹر اسجد......آپ کو اپنے......آپ کو سمجھنے کی ضرورت ہے......آپ کیا ہیں......؟ آپ کو خود ہی معلوم نہیں......آپ کیا کر سکتے ہیں......اور آپ کی فیلنگز کیا ہیں......آپ کا کس کے ساتھ کیا تعلق ہے اور کیسا تعلق ہے؟ آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ جاننے کی ضرورت ہے......اور جب آپ اپنے آپ کو جان لیں گے......تو آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔''پروفیسر شمس مظہری نے کہا۔

''کیا آپ اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں؟''اسجد نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''سب کچھ نہیں......مگر بہت کچھ۔''پروفیسر شمس نے جواب دیا۔

''آپ سب کچھ کیسے جان پائے ہیں؟''اسجد نے سوال کیا۔

''علم، مطالعے اور اپنے ذاتی تجربے سے......باہر کے واقعات جب آپ کے باطن پر یعنی اندر کے انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں تو اس اندر کے انسان میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں جو انسان صرف خود محسوس کر سکتا ہے نہ کسی کو بتا سکتا ہے نہ کوئی اسے جان پاتا ہے......یہ قدرت کا بہت

عجیب وغریب نظام ہے......اس لئے میں انسان کو اس کائنات کا معجزہ کہتا ہوں......انسان دنیا میں اللہ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔'' پروفیسر شمس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''شاہکار......اور......انسان۔'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

''میں نہیں مانتا......'' اسجد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کس کو......؟'' پروفیسر نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان......کبھی بھی شاہکار نہیں ہوسکتا......'' اسجد نے جواب دیا۔

پروفیسر مظہری خاموش ہو گئے۔

تمام نوری مخلوق چونک گئی......ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی......بڑی سرکار کس قدر وثوق سے انسان کو اپنا 'شاہکار' بتا رہی تھی اور انہیں ہر طرح سے قائل کرنا چاہتی تھی......اور جس انسان کو شاہکار بتایا جا رہا تھا......وہی انسان اپنے آپ کو 'شاہکار' ماننے سے انکار کر رہا تھا، کیسا عجیب مرحلہ آ گیا تھا۔ انہوں نے چونک کر سفید روشنی کی جانب دیکھا اور حیرت سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ سفید روشنی بدستور روشن تھی......بہت مطمئن اور پرسکون......وہ اور زیادہ مضطرب ہونے لگے۔

پل ٹوٹا ہوا تھا......ٹرین آگے نہیں جا سکتی تھی اور انجن بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ ایک اسپیشل ٹرین ریلوے سٹیشن سے ان مسافروں کو لینے کے لئے بھیجی گئی......اور تمام مسافر تتر بتر ہو گئے۔ پروفیسر مظہری کہاں چلے گئے......وہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ اسجد انہیں ادھر ادھر دیکھتا اور تلاش کرتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیئے......ان کی باتوں نے اس کے اندر سوالات کا ایک اور سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر شمس مظہری کی باتوں میں الجھا ہوا اپنے گاؤں کی جانب چل دیا۔

پورا گاؤں اسجد سے ملنے آ رہا تھا۔ سب اسے زندہ اور صحت یاب دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اس کے والدین عزیز واقارب، دوست و احباب سب اسے ملتے اور دعائیں دیتے، وہ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے والدین بہت عمر رسیدہ تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف اسجد کے لئے ہر لمحہ دعائیں کرنا تھا......وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ ماں اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھی......باپ اسے زمین پر پاؤں نہیں رکھنے دے رہا تھا اور وہ اتنی شدید محبت سے جھنجلانے لگتا، مگر محبت کا لمس اندر ہی اندر مطمئن کرتا، اس کے ماں باپ شکرادا کرتے نہ تھک رہے تھے کہ وہ موت کے منہ سے بچ کر آیا تھا......اس واقعے نے اور پروفیسر شمس مظہری کی گفتگو نے بھی اس کے خیالات اور نظریات کو اپنے انداز سے جھنجھوڑا تھا......وہ خاموش رہتا اور اس کے والدین اس کی خاموشی کا اور ہی مطلب سمجھ رہے تھے۔

''اسجد......موت سے خوفزدہ ہو گیا ہے، اس لئے خاموش رہتا ہے۔ یار محمد......میں نے منت مان لی ہے، جس روز اسجد کی خاموشی ختم ہو گی اور وہ ہنس بول کر باتیں کرے گا تو میں اسی روز شاہ بابا کے مزار پر جا کر حاضری دوں گی اور نیاز چڑھاؤں گی۔'' اس کی ماں نے ایک روز شوہر سے

سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''تو......تو......شاہ بابا کے مزار پر جانے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے......ذرا سی خوشی کی خبر ملتی ہے اور تو وہاں پہنچ جاتی ہے۔'' یار محمد نے مسکرا کر کہا۔

''سچ......وہاں جا کر مجھے بڑا سکون اور خوشی ملتی ہے۔'' اسجد کی ماں بولی۔

''اور تیرا بیٹا......نہ مزاروں کو مانتا ہے اور نہ اللہ والوں کو۔'' یار محمد نے جواب دیا۔

''وہ تو باؤلا ہے......اور اب کی بار میں یہی دعا کروں گی کہ اللہ اس کو ہدایت دے اور اس کی عقل پر پڑے پردوں کو ہٹا دے۔'' اسجد کی ماں نے کہا تو یار محمد مسکرانے لگا۔

اسجد ہر وقت......ایک معمولی کمرے میں چارپائی پر اٹھتا......بیٹھتا......کروٹیں بدلتا ہوا اپنی سوچوں میں گم رہتا۔

''تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو......؟'' گھر سے باہر جاؤ......یار دوستوں سے ملو......ان سے باتیں کرو......یوں لیٹ لیٹ کر بیمار ہو جاؤ گے......'' یار محمد نے ایک روز اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

''ابا جی......کیا مولوی چراغ دین زندہ ہیں؟'' اسجد نے اچانک پوچھا۔

''ہاں......ہاں......کیوں نہیں......مگر بہت بزرگ ہو چکے ہیں......تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' یار محمد......نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اسجد نے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' یار محمد نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ دیکھنا چاہتا ہوں......'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیا......؟'' یار محمد نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں کیا مولوی صاحب اللہ والے ہیں؟'' اسجد نے پوچھا۔

''اللہ والے......؟'' یار محمد نے یوں چونک کر پوچھا، جیسے اسے جھٹکا لگا ہو۔

''ہاں......اللہ والے۔'' اسجد نے پھر پوچھا۔

''تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا کوئی خواب دیکھا ہے؟'' یار محمد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں......کسی سے سنا تھا......مگر یقین نہیں آیا......اب مل کر دیکھنا چاہتا ہوں، کہ سچ کیا ہے۔'' اسجد نے کہا۔

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ تم کیسے ایسی باتوں پر یقین کرنے لگے۔''

''کیا مطلب......؟'' کیا میں......؟ اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

کسی بات کو ماننے کے لئے یقین اور یقین کرنے کے لئے......ایمان......چاہئے اور تمہارا تو ایمان ہی ڈولتا رہتا ہے۔ کبھی کسی بات کو

مانتے ہو...... تو کبھی خود ہی جھٹلا دیتے ہو......" یار محمد نے ہنستے ہوئے کہا تو اسجد شرمندہ ہو گیا۔

"میرے ساتھ کبھی کچھ ایسا بھی تو نہیں ہوا...... جو میرے ایمان کو مضبوط کر سکے۔ اسجد نے آہ بھر کر کہا...... ایمان...... یونہی...... نہیں ملتا...... ایمان تب ہی ملتا ہے جب دل روشن اور آنکھیں پرنور ہوں...... جب ہم ہر بات کو جان کر اور مان کر انکار کرتے جائیں تو ایمان کہاں سے جنم لے گا۔

پہلے رک کر کسی بات کے بارے میں سوچو تو سہی...... پھر آگے بڑھو...... اسجد علی...... میں نے تمہاری سوچوں پر کبھی پابندی نہیں لگائی...... تم نے جو کچھ بھی سوچا...... میں نے تجھے روکا نہیں...... تم نے جو کچھ کرنا چاہا...... اس سے بھی نہیں روکا...... اب کی بار تم کیا سوچ کر آئے ہو۔" یار محمد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... بس پریشان ہوں......" اسجد نے آہ بھر کر کہا...... یار محمد نے پوچھا۔

"کیسی پریشانی ہے......؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا...... بہت اضطراب ہے...... میرے اندر...... مولوی صاحب سے کچھ پوچھ کر اس اضطراب کو دور کرنا چاہتا ہوں۔" اسجد علی نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے...... میں مولوی صاحب کو کہوں گا وقت نکال کر گھر تشریف لائیں، مسجد میں تم ایسی باتیں نہیں پوچھ سکو گے...... ہر وقت ہجوم ان کے گرد بیٹھا ہوتا ہے' یار محمد نے کہا تو اسجد علی خاموش ہو گیا اور یار محمد کمرے سے باہر نکل گیا......

اسجد کی ماں صبح سویرے ہی شاہ بابا کے مزار پر جانے کی تیاری میں مصروف تھی...... اسجد کے ایک دو دیرینہ دوست اتفاق سے گاؤں آئے تھے اور اسجد ان کے ساتھ...... قدرے مصروف تھا۔ ایک دو بار کھیتوں میں بھی چلا گیا، اس کا بدلا ہوا مزاج دیکھ کر اس کی ماں قدرے خوشی محسوس کر رہی تھی اور اسی خوشی مین وہ مزار پر نیاز چڑھانے جا رہی تھی۔

"اسجد بیٹا...... ہم دونوں شاہ بابا کے مزار پر جا رہے ہیں...... تم گھر پر ہی رہو گے یا باہر جانے کا پروگرام ہے۔" اسجد کی ماں نے پوچھا۔

"گھر پر ہی رہوں گا......" اسجد نے جواب دیا۔

"اگر گھر پر ہی رہنا ہے تو ہمارے ساتھ چلو...... شاہ بابا کے مزار پر جانے سے دل کو بہت سکون ملتا ہے...... میں تو کہتی ہوں...... چل ہمارے ساتھ۔" اسجد کی ماں نے کہا۔

"جن باتوں کو میرا دل نہیں مانتا...... میں وہ نہیں کرنا چاہتا......" اسجد نے کہا تو اس کی ماں اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ دونوں کے جانے کے بعد...... اسجد اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ جھنجھلا کر اٹھا اور دروازہ کھولنے چلا گیا...... دروازہ کھولا تو سامنے مولوی چراغ دین کھڑے تھے۔ انتہائی بوڑھے ہو چکے تھے...... سفید داڑھی کافی لمبی ہو چکی تھی اور جسم پہلے سے بھی زیادہ لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ اسجد نے بہت مشکل سے انہیں پہچانا۔

"السلام علیکم مولوی صاحب۔" اسجد بمشکل بولا۔

"وعلیکم السلام...... کیسے ہو بیٹا...... یار محمد کہاں ہے...... بہت اصرار کر رہا تھا کہ گھر آؤں...... آج تھوڑا سا وقت ملا تو چلا آیا ہوں۔" مولوی

صاحب نے کہا۔

''اماں اور ابا تو شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینے گئے ہیں...... آپ اندر تشریف لائیے۔'' اسجد نے انہیں اندر آنے کو کہا تو مولوی صاحب اس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔

اسجد نے ایک کرسی آگے کی اور انہیں عزت سے بٹھایا۔

''یار محمد بتا رہا تھا تم کچھ پریشان ہو اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے...... خیریت تو ہے۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں...... الجھ سا گیا ہوں...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... حقیقت کیا ہے؟ اسجد علی بولا۔

''کیا مطلب......؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''مولوی صاحب...... انسان کس شے سے بنا ہے؟''

''مٹی سے......'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''مٹی سے...... یا...... نطفے سے......؟ اسجد نے پوچھا۔

''نطفے سے وہ جنم لیتا ہے...... اور مٹی سے تخلیق ہوا ہے...... جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے ''اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر اس کی نسل خلاصے یعنی حقیر پانی (نطفے) سے کی پھر اسے درست کیا پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ (السجدہ...... 9-7)

''مولوی صاحب...... کیا یہ بات الجھن پیدا نہیں کرتی کہ...... پہلے آدم کے پتلے کو مٹی سے بنا کر فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور پھر باقی نسل انسانی کو نطفے سے تخلیق کیا، پھر آدم کو مٹی کا پتلا بنا کر پیش کرنے کا کیا مقصد تھا......؟'' اسجد نے پوچھا۔

''بیٹا...... کیسی باتیں کر رہے ہو...... خدا قادر مطلق ہے...... وہ جو چاہتا ہے...... پیدا کرتا ہے اور...... آدم کا پتلا مٹی سے بنا کر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی اُن پر برتری ظاہر کرنی تھی جبکہ نطفے سے پیدا ہونے والا انسان مختلف مراحل میں سے گزر کر پہلے ایک بچہ بنتا ہے اور پھر اس کی ماں اسے جنم دیتی ہے...... نطفے سے جنم لینے والے بچے کو کس طرح فرشتوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا...... اللہ کی حکمتیں ہر شے میں پوشیدہ ہوتی ہیں...... انسان صرف سوچ سکتا ہے...... اس کے رازوں تک رسائی اس کے بس میں نہیں......'' مولوی صاحب نے قطعیت سے کہا۔

''مولوی صاحب...... کیا اللہ والے بھی اللہ کے رازوں تک رسائی نہیں کر پاتے؟'' اسجد نے اچانک پوچھا تو مولوی صاحب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اللہ کے سب بندے...... اللہ والے ہی ہوتے ہیں۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''کیا...... اللہ والے کوئی خاص اور اس کے بہت قریب ہوتے ہیں اور آپ جیسے...... اور میری طرح کے...... اس کو ماننے والے......

دونوں اللہ والے ہی ہیں۔''اسجد نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

مولوی صاحب اس کا سوال سن کر ایکدم چونکے......اور ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔

''مولوی صاحب......آپ تو بہت نیک ہیں......عبادت گزار ہیں......اور......میں تو بہت گنہگار ہوں......نہ کبھی ڈھنگ سے اس کی عبادت کی ہے......اور نہ ہی اس پر ویسا ایمان رکھتا ہوں......جیسا آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''اسجد نے پوچھا۔

''میاں......تم کیوں الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو، خود بھی الجھ رہے ہو......مجھے بھی الجھا رہے ہو......''مولوی صاحب نے کہا تو اسجد ان کی بات سن کر حیران ہو گیا اور گہری سانس لی۔

''مولوی صاحب آپ تو علم والے ہیں......آپ بتایئے اللہ کی حقیقت کیا ہے؟''اسجد نے کہا تو وہ پھر چونکے۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے......؟ وہ ہم سب کا خالق ہے......اس نے انسان کو پیدا کیا ہے......اور ساری کائنات کا خالق و مالک ہے......ہر شے اس کے دائرہ اختیار میں ہے......اس نے ہر چیز انسان کے لئے بنائی ہے......وہ فرماتا ہے۔

''میں نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام پر لگا دیا اور دونوں (دن، رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں اور رات اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام میں لگا دیا، جو کچھ تم نے مانگا، سب میں نے تمہیں عطا کیا اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو تم شمار نہ کر سکو گے۔''(ابراہیم(33-34) مولوی صاحب نے کہا تو اسجد نے گہری سانس لے کر ان کی جانب دیکھا۔

''اور......انسان کیا ہے......؟''اسجد نے پوچھا۔

''اللہ کا بندہ زمین پر اس کا نائب......''مولوی صاحب نے پُر مطمئن انداز میں جواب دیا۔

''اللہ اور انسان کا تعلق کیا ہے......؟''اسجد نے کہا

''خالق اور مخلوق کا......معبود اور عبد کا......اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے......

''کیا انسان صرف خدا کا نائب ہے......اور کچھ نہیں......؟''اسجد نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میاں......کیا تم اس بات کو جھٹلا رہے ہو......جس کا ذکر وہ خود کرتا ہے۔''

''اور وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے، اس میں تمہاری آزمائش کرے۔''(الانعام-166)

کیسی آزمائش......آپ تو کہہ رہے تھے کہ''اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور اب کہہ رہے ہیں کہ آزمائش کے لئے......مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟''اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''لگتا ہے تم نے صرف علم پڑھا ہے......کسی رٹو طوطے کی طرح......علم کو سمجھا نہیں......یہ دنیا اور اس کی زندگی انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ خیر و شر کی آزمائش اگر انسان اللہ کا حکم مانتے ہوئے نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی آزمائش ہے۔ خیر کے راستے پر چلنا بہت

مشکل ہے، قدم قدم پر رکاوٹیں......اور تکالیف ہیں۔'' اللہ فرماتا ہے:

''اور ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے......کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہیں پائے گا......بھلا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں......زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے......اور اس کو دونوں راستے خیر اور شر کے دکھا دیئے۔ (البلد 10-4)

''مولوی صاحب......کیا واقعی ہی انسان کو......کسی قسم کا کوئی اختیار دیا گیا ہے؟'' اسجد نے پوچھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو......؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''میں تو سمجھتا ہوں کہ انسان بہت بے بس ہے، کچھ نہیں کرسکتا......انسان اپنی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے۔'' اسجد نے جواب دیا۔

''بالکل بھی نہیں......تقدیر دعا سے بدل سکتی ہے......اور انسان کو اللہ نے عقلِ سلیم عطا کی ہے......اسے یہ شعور دیا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا اگر وہ اچھائی کو بہتر سمجھ کر اسے اپناتا ہے تو وہ ہدایت پر ہے......کامیابی اور فلاح اس کا مقدر ہے......اگر برائی اختیار کرتا ہے اور شر کے راستے پر چلتا ہے تو اس کا نتیجہ خسارہ ہے اور انسان نقصان میں رہتا ہے۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''انسان کی فطرت کیا ہے......وہ کس بنا پر خیر یا شر کو منتخب کرتا ہے......؟'' اسجد نے پوچھا۔

''انسان فطرتاً کمزور، جھگڑالو، جلد باز اور ناشکرا ہے......مگر قدرت نے اسے فطرت سلیمہ پر پیدا کیا ہے......یعنی نیک فطرت پر......اس کی سرشت میں خیر اور شر دونوں ہیں......جب خیر غالب آتا ہے تو وہ نیکی کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور شر غالب آنے پر وہ شیطانی راستوں پر چلتا ہے۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔ مولوی صاحب کی باتیں سن کر اسجد کے دل میں عجیب سی بے اطمینانی پیدا ہونے لگی اور وہ خاموش ہوگیا۔

''شاید تمہیں میری باتیں پر اثر نہیں لگیں، جو تمہارے دل کو متاثر کرتیں؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

مولوی صاحب نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''میاں مجھے تمہاری آنکھوں میں بے یقینی دکھائی دے رہی ہے میں نے تو تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے کتاب اللہ سے سُنایا ہے کیا تمہیں ان باتوں پر یقین نہیں آیا؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''بات یقین کی نہیں۔ دل کی کیفیت بدلنے کی ہے نہ میں کتاب اللہ کی باتوں سے انکار کررہا ہوں اور نہ ہی آپ کی باتوں کو جھٹلا رہا ہوں مگر میرے دل میں نہ سرشاری کے احساسات پیدا ہورہے ہیں جو میرا ایمان بن سکے نہ کسی قسم کے منفی۔ بس اک خاموشی سی ہے۔'' اسجد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''شاید تمہیں میری باتیں پُر اثر نہیں لگی جو تمہارے دل کو متاثر کرتیں؟''

مولوی صاحب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اسجد نے آہ بھر کر جواب دیا۔ دونوں ایک دم خاموش ہوگئے۔

''ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں......'' مولوی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مولوی صاحب...... کیا آپ انسان کو اس کائنات کا معجزہ سمجھتے ہیں؟'' اسجد نے پوچھا۔

''اس کائنات کی ہر شے اور ہر مخلوق ایک معجزہ ہی ہے کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح عقل کو حیران کرتی ہے۔ انسان اللہ کی مخلوق ہے اور بس......'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''کیا آپ انسان کو اللہ کا شاہکار مانتے ہیں؟'' اسجد نے سوال کیا۔

''میاں...... تم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے تمہیں اللہ کی کتاب سے بے شمار آیتیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ اس نے صرف انسان کو بندہ اور نائب کہا ہے، بے شک اس نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے، مگر وہ شاہکار کیسے ہوسکتا ہے...... کیونکہ اس کی بے شمار خامیوں، برائیوں اور گمراہیوں کا ذکر اللہ نے خود کیا ہے...... 'شاہکار' تو اپنی ذات میں اتنا مکمل ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خامی، کوئی کمزوری ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی، انسان...... اور...... شاہکار؟ کبھی بھی نہیں۔'' مولوی صاحب نے مدلل انداز میں کہا تو اسجد خاموش ہو گیا۔

تمام نوری مخلوق بھی چونک گئی۔ اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور پڑھانے میں جس شخص نے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ انسان شاہکار نہیں...... جبکہ بڑی سرکار بہت دعوے سے انسان کو اپنا 'شاہکار' بتا رہی تھی، اس کا مطلب ہے انسان کو خود ہی اپنے مرتبے اور حیثیت کا علم نہیں، یہ کتنی حیران کن بات تھی۔ انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھا جو بدستور پر مطمئن اور مثبت انداز میں روشن تھی۔ اس کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے خاموش رہے۔

''اچھا...... میاں اب میں چلتا ہوں...... بہت دیر ہوگئی...... وقت کا احساس ہی نہیں ہوا...... چونکہ تم الجھنوں کا شکار تھے...... تمہیں مطمئن کرنا ضروری تھا، اس لئے بیٹھ گیا بیٹا...... میں نے تو تمہیں وہ کچھ بتا دیا جو میں نے اللہ کی کتاب میں پڑھا ہے...... کیا اب تمہاری تسلی ہو گئی ہے......؟'' مولوی صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی......'' اسجد نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اللہ کا شکر ہے...... اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے...... میں چلتا ہوں، یار محمد آئے تو میرا بہت سلام کہنا۔'' مولوی صاحب نے اسجد سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ اسجد انہیں دروازے تک رخصت کرنے آیا۔ کمرے میں واپس آ کر وہ بہت مضطرب ہو گیا۔

مولوی صاحب نے انسان کے بارے میں اپنی جو رائے دی تھی، اس نے اسے پھر الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر کیانی، پروفیسر شمس مظہری اور مولوی صاحب کی باتوں میں کتنا اختلاف تھا...... تینوں انسان کی حیثیت اور مرتبے کے بارے میں کوئی ٹھوس اور حتمی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اسجد کی اپنی رائے بھی مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے تینوں سے اللہ اور انسان کے بارے میں سوالات کئے تھے مگر کسی کی بات پر اس کا دل مطمئن ہو کر پرسکون نہیں ہوا تھا، وہ ابھی تک پہلے کی طرح مضطرب تھا۔ اسے اطمینان کیسے ملے گا......؟'' وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

شام گہری ہو رہی تھی جب یار محمد اور اس کی بیوی شاہ بابا کے مزار سے گھر واپس لوٹے۔ دونوں بہت تھکے ہوئے مگر بہت خوش تھے۔ یوں

مطمئن تھے جیسے ان کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ انہوں نے جو نیاز شاہ بابا کے مزار پر منت کے طور پر مانی تھی وہ اسے پورا کر آئے تھے۔

"بیٹا...... تم نے نہ جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے...... سچ مانو اتنا سکون ملا ہے، وہاں جا کر بتا نہیں سکتا۔" یار محمد نے کہا۔

"مولوی صاحب آئے تھے......؟" اسجد نے باپ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب...... آج...... آئے تھے......" یار محمد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں انہیں آج فرصت ملی تھی۔" اسجد نے جواب دیا۔

"اور کتنے افسوس کی بات ہے ہم انہیں گھر نہیں مل سکے......" یار محمد نے قدرے تاسف سے کہا۔

"میرا خیال ہے...... بڑے ہی لمبے عرصے کے بعد وہ ہمارے گھر آئے...... میرا خیال ہے پانچ سال تو ہو ہی گئے ہیں...... ابا جی کے ختم پر آئے تھے۔" اسجد کی ماں نے کہا۔

"ہاں...... شاید" یار محمد نے جواب دیا۔

"واپس کب گئے؟" اسجد کی ماں نے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے...... آج بہت دیر بیٹھے...... بس باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا" اسجد نے بتایا۔

"ماشاء اللہ...... مولوی صاحب پر اللہ کا بڑا ہی کرم ہے، ہر بات اللہ کی کتاب کے حوالے سے کرتے ہیں۔ بڑے علم والے ہیں...... دنیا میں بڑے بڑے علم والے ہیں...... ایک سے بڑھ کر ایک...... یہ سب اللہ کی نظر کرم ہے جس کو نواز دے...... اب سنا ہے کہ شاہ بابا کے مزار پر بڑے علم والے اور اللہ والے صوفی صاحب ہیں...... مگر وہ کسی کو کم ہی ملتے ہیں۔" یار محمد اپنی ہی لے میں بولا۔

"اللہ والے......؟" اسجد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں اللہ کے پیارے اور قریبی بندے...... جس سے بھی پوچھو تو یہی کہتا ہے ابھی یہیں تھے، مگر آج تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بڑا شوق ہے ان سے ملنے کا۔" یار محمد نے قدرے اداس لہجے میں کہا تو اسجد حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

"ابا جی...... آپ اللہ والا کس کو کہتے ہیں؟" اسجد نے اچانک سوال کیا۔

"بیٹا...... اللہ کے خاص الخاص بندے...... جن پر وہ اپنا بڑا کرم کرتا ہے۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"کیسا کرم......؟" اسجد نے چونک کر پوچھا۔

"اپنے قرب کا کرم......" یار محمد نے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" اسجد نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

"بیٹا...... کچھ لوگ صرف اللہ کے 'بندے' ہوتے ہیں جنہیں وہ پیدا کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں...... اور...... کچھ اللہ سے ایسا "عشق" کرتے ہیں کہ اپنی جان بھی اس کی محبت میں فنا کر دیتے ہیں...... وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں...... مگر یہ بہت کم ہوتے ہیں...... اللہ

والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں...... کم دکھائی دیتے ہیں مگر ہزاروں، کروڑوں پر بھاری ہوتے ہیں۔" یار محمد نے جواب دیا، جس نے اپنی ساری زندگی ایسے لوگوں کی محبت میں گزارنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے تو آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا۔" اسجد نے حیرت سے کہا۔

"بیٹا...... ایسے انسان نظر نہیں آتے ان کو دیکھنے کے لئے بھی ویسی ہی نظر چاہئے...... اور تمہاری نظر ابھی بہت کچی ہے...... تجھے تو الف ب کی بھی خبر نہیں۔" یار محمد نے کہا تو اسجد حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا جو شاید پہلی بار اس سے ایسی باتیں کر رہا تھا۔

"کیا مولوی صاحب اللہ والے نہیں؟" اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اللہ کے نیک بندے ہیں...... اللہ والے نہیں۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" اسجد نے پھر حیرانگی سے پوچھا۔

"اللہ کے نیک بندے، اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں، نیک کام کرتے ہیں اور برائی سے باز رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ والے تو اپنا آپ ہی اللہ کو سونپ چکے ہوتے ہیں، وہ ارد گرد کے لوگوں میں بہت "عام" مگر اللہ کی نظر میں بہت "خاص" ہوتے ہیں......" یار محمد نے جواب دیا۔

"کیا اللہ والے...... اللہ کے نیک بندے نہیں ہوتے۔" اسجد نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"تو بھی بے وقوف ہے...... اللہ کے بندے سچے اور نیک بن کر ہی اللہ والے بنتے ہیں...... فرق ایسے ہے جیسے پہلی سیڑھی اور آخری سیڑھی کا ہے۔ اللہ کے 'نیک بندوں' کو اللہ آسمانوں پر دکھائی دیتا ہے اور "اللہ والوں" کو اپنے سینوں میں۔" یار محمد نے کہا تو اسجد نے انتہائی حیرت سے باپ کی طرف دیکھا، اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انسان کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

"کیا واقعی......؟ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں؟" اسجد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... کیوں نہیں...... صوفی صاحب کے بارے میں یہی مشہور ہے، مگر مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہمیشہ حسرت ہی رہی۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"ابا جی...... کیا صوفی صاحب کے علاوہ آپ کسی اور اللہ والے سے ملے ہیں؟" اسجد نے پوچھا۔

"بیٹا...... مجھے تو ساری زندگی شوق ہی یہی رہا کہ اللہ والوں سے ملوں مگر سوائے ایک، دو کے...... کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی...... جن سے ملاقات ہوئی...... انہوں نے اپنے اپنے انداز سے چونکایا۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"کھانا لاؤں...... بیٹا تمہیں تو بھوک لگی ہوگی۔" اسجد کی ماں نے پوچھا۔

"نہیں...... مجھے بھوک نہیں...... اور وہ اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا...... اس کا دل بری طرح بے چین ہو رہا تھا...... "یار محمد کی باتوں نے اسے مزید الجھا دیا تھا۔

"ایسا انسان......کیسا ہوتا ہے......؟"

"ایسے انسان کو دیکھنے کے لئے خاص نظر چاہئے؟ ایسے لوگوں کے سینوں میں اللہ کیسے موجود ہو سکتا ہے......؟ اور دوسروں کو اس کی خبر کیسے ہوتی ہے؟" اسجد کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھر رہے تھے اور اس کا دل انتہائی مضطرب ہو رہا تھا، یوں لگ رہا تھا۔ کسی نے اس کا سینہ جکڑ دیا ہو اور جیسے اس سے سانس لینا مشکل ہو رہی ہو، وہ یونہی ادھر ادھر پھرتا رہا، پاس سے گزرتے لوگوں سے یوں بے نیاز ہو کر چل رہا تھا جیسے کسی کو جانتا ہی نہ ہو......کئی شناسا لوگوں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور اسے اپنی سوچوں میں محو پا کر وہ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے مگر وہ پاس سے گزر گیا، اس کا ذہن تو کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ وہ رات گئے گھر لوٹا تو اس کے ماں باپ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

"بیٹا......تو کہاں چلا گیا تھا......روٹی بھی نہیں کھائی اور اب آ رہا ہے......کتنی رات گزر گئی ہے......کیا کوئی یار دوست مل گیا تھا؟......"

اس کی ماں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں......" وہ آہستہ آواز میں بولا۔

"کیا تجھے شہر یاد آ رہا ہے؟" اس کی ماں نے کریدا۔

"نہیں......" اس نے جواب دیا اور چارپائی پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی پریشانی اس کے اندر کے اضطراب کی خبر دے رہی تھی۔ اس کی ماں تھکی ہوئی تھی اٹھ کر لیٹ گئی۔

اور چارپائی پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگی۔ اسجد بار بار کروٹیں بدل رہا تھا......یار محمد اس کو ہر بار دیکھتا......

"اسجد......تجھے نیند کیوں نہیں آ رہی؟" یار محمد نے سرگوشی کے انداز میں اسجد سے پوچھا جو اس کی ساتھ والی چارپائی پر لیٹا تھا کمرے میں نیم تاریکی تھی، زیرو کا بلب روشن تھا۔

"ابا جی......یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ فلاں انسان اللہ والا ہے۔" اسجد نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا......تو......تو ابھی تک اس بات سے پریشان ہے۔" یار محمد ہنسا۔ "بیٹا......ایسے لوگ دنیا میں سب کے درمیان رہ کر سب سے بے نیاز ہوتے ہیں......ویسے تو وہ ارد گرد کے انسانوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں مگر وہ ان کو نہیں......ان کے اندر کے انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ ظاہر نہیں باطن میں زندہ رہتے ہیں......وہ بغیر کسی واسطے اور ذریعے کے دلوں اور روحوں تک پہنچ جاتے ہیں......ان کی سیدھی سادھی باتوں میں بڑے گہرے مطلب ہوتے ہیں، وہ باتیں تو پاس بیٹھے لوگوں سے کر رہے ہوتے ہیں مگر ان کی باتوں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔" یار محمد اسے بتانے لگا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" اسجد نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"بیٹا......تو نے ابھی دنیا دیکھی کہاں ہے؟ تجھے کیا خبر مولا نے کیسے کیسے شاہکار لوگ بنائے ہیں۔" یار محمد نے آہستہ آواز میں کہا۔

"شاہکار......؟" اسجد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں......ایسے نایاب لوگ اللہ کے شاہکار ہی ہوتے ہیں۔" یار محمد نے اپنی ہی لے میں کہا تو اسجد حیرت سے ابا کی جانب دیکھنے لگا۔

''ابا جی...... کیا انسان اس دنیا میں اللہ کا ''شاہکار'' ہے؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل......'' یار محمد نے جواب دیا۔

''لیکن مولوی صاحب تو نہیں مانتے...... وہ تو کہتے ہیں کہ انسان صرف اللہ کا نائب اور بندہ ہے اور اس کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے۔'' اسجد نے جواب دیا۔

''وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔'' یار محمد نے جواب دیا۔

''مگر وہ انسان کو 'شاہکار' نہیں مانتے۔'' اسجد نے جھنجھلا کر کہا۔

''نہ مانیں......'' یار محمد نے لاپروائی سے کہا۔

''ابا جی...... مجھے آپ کی باتوں سے الجھن ہونے لگی ہے۔'' اسجد زچ ہو کر بولا۔

''بیٹا...... ہر انسان 'شاہکار' نہیں ہوتا...... کچھ انسانوں کو اللہ نے خود جانوروں سے بھی بدتر کہا ہے مگر وہ ہوتے تو انسان ہی ہیں نا...... اور کچھ میں شر اور بدی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ انہیں شیطان کہا جاتا ہے، مگر وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔ ''شاہکار'' تو اسے کہتے ہیں جس پر اس کا بنانے والا فخر محسوس کرے...... اور ایسے شاہکار لوگ ہر دور ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں، مولا ان کو ایسا بناتا ہے کہ لوگ ان کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں اور مولا کو بھی ان پر فخر محسوس ہوتا ہے۔'' یار محمد نے کہا تو اسجد کے دل میں اس کی بات ایک دم کھب گئی۔

''ابا جی...... آپ کو یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں، آپ تو زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں۔'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''اوئے...... بیوقوفا...... تجھے کس نے کہا ہے کہ یہ باتیں کتابیں پڑھ کر معلوم ہوتی ہیں...... بیٹا...... میرے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ میں نے تو ساری حیاتی اللہ والوں کے ساتھ گزارنے کی کوشش کی ہے...... وہ لوگ تو بہت کم ملے مگر علم ان کے بارے میں بڑا ملا۔'' یار محمد نے مسکرا کر کہا۔

''ابا جی...... مولوی صاحب ایسی باتیں نہیں کرتے؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا...... مولوی صاحب بہت اچھے اور نیک انسان ہیں مگر ان کے اپنے نظریات ہیں، وہ تو شاید اللہ والوں کو ہی نہیں مانتے...... ایک دو دفعہ میری ان کے ساتھ بحث ہوئی تھی...... وہ کسی ایسے انسان کے وجود کو مانتے ہی نہیں تو پھر میں نے ان سے بحث کرنا ہی چھوڑ دی۔'' یار محمد نے کہا۔

''ابا جی...... کہیں آپ بھی تو اللہ والے نہیں؟'' اسجد نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارے نہیں بیٹا...... میری اتنی اوقات کہاں......؟ ہم تو مٹی کے بے وقعت ذرے ہیں...... وہ لوگ تو سیپ میں بند موتیوں جیسے قیمتی اور خوبصورت لوگ ہوتے ہیں...... ہم تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں...... لیکن یہ ان کی نظروں کا فیض ہے کہ مجھ گنہگار میں بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی ہے...... یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے کبھی کبھار ملا دیتا ہے...... اب صوفی صاحب سے ملنے کو بڑا جی چاہتا ہے...... کئی بار گیا ہوں وہ ملے ہی نہیں...... پتا نہیں مولا نے کب ان کا دیدار کرانا ہے۔'' یار محمد نے حسرت سے کہا تو اسجد حیرت سے باپ کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے

دل میں بھی صوفی صاحب کو ملنے کا تجسس پیدا ہونے لگا...... اس نے تو ساری زندگی باپ سے کبھی کھل کر بات ہی نہیں کی تھی کہ وہ کھیتوں میں ہل چلانے والا ان پڑھ مزارع اس کی کتابی اور علمی باتوں کو کیسے سمجھ سکے گا...... اور آج اس کے باپ نے اس کی ساری علمیت کو مات دی تھی...... اسے ایسے استاد ملے تھے جنھوں نے اس کو سب کچھ کتابوں کے ذریعے ہی پڑھایا تھا۔ اب اسے اپنا باپ ان سے بہت برتر اور افضل محسوس ہونے لگا، جس کی باتیں مدلل تھیں اور جس کی باتوں میں اتنی کشش تھی کہ اس کا دل فوراً مان گیا تھا۔ اس کے باپ نے ایک ہی لمحے میں کئی دنوں سے پیدا شدہ الجھن کو کیسے عام فہم انداز میں ختم کر دیا تھا...... وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''میں کل صوفی صاحب سے ملنے ضرور جاؤں گا۔'' اس نے متجسس ہو کر سوچا...... اور اپنے اس عزم کو بار بار دہراتا ہوا گہری نیند سو گیا۔

تمام نوری مخلوق یار محمد کی باتیں سن کر چونک گئی اور ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا...... اور...... پھر آہستہ آہستہ سفید روشنی کی جانب دیکھا جو بدستور روشن تھی۔ انہیں اس روشنی میں پہلے سے بھی زیادہ اطمینان محسوس ہونے لگا۔ ان کے اندر انسان کے شاہکار ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات قدرے ماند پڑنے لگے۔ وہ الجھن کا شکار ہونے لگے۔

☆

نقش جیلانی

حیات و تعلیمات شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک مستند کتاب، جسے آپ تک پہنچایا ہے محمد یوسف جاوید (قلمی نام محمد ابو خلدون) نے۔ پہلے باب میں حضرت شیخ کی پیدائش سے لے کر ان کے سفر بغداد کے حالات کا ذکر ہے۔ دوسرا باب ان حالات کا جائزہ ہے جن سے حضرت شیخ سے پہلے اور ان کی زندگی میں امت مسلمہ گزر رہی تھی۔ تیسرا باب حضرت شیخ کی دینی تعلیم اور اس کے بعد حضرت حماد بن مسلم کی مجلس میں حاضری اور ان کی صحبت میں راہ طریقت طے کرنے کے بارے میں ہے۔ چوتھا باب حضرت کی زندگی کے دیگر حالات اور بعض اکابر امت کے ان کے بارے میں تاثرات پر مبنی ہے۔ پانچواں باب تصوف یا تزکیہ باطن کا ایک عمومی تعارف ہے اور ساتھ ہی اس بارے میں حضرت شیخ کی بعض تعلیمات بھی آ گئی ہیں۔ چھٹا باب حضرت شیخ کی تصنیفات کا ایک مختصر جائزہ ہے۔ ساتواں باب حضرت شیخ کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہی باب اس کتاب کا مرکزی باب ہے۔ اس میں عقائد، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات پر حضرت شیخ کے اقوال ان کی تصنیفات سے پیش کیے گئے ہیں۔ **نقش جیلانی**، کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اسجد صبح سویرے اٹھ بیٹھا تھا اور کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ یار محمد منہ اندھیرے ہی کھیتوں میں جا چکا تھا۔ اس کی ماں صحن میں چولہا جلائے روٹیاں پکانے میں مصروف تھی۔ اسجد کو تیار دیکھ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''خیر تو ہے بیٹا...... کہیں جا رہے ہو؟'' اس کی ماں نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... کچھ دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہا ہوں۔'' اسجد نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... خیر سے جا...... اور...... خیر سے آ...... شام کو جلدی آ جانا......!'' اس کی ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے......'' اسجد نے جواب دیا۔

''لے...... روٹی کھالے......'' اس کی ماں نے روٹی اور انڈہ فرائی کر کے اس کے سامنے چھوٹی سی ٹیبل پر رکھا

''اماں...... شاہ بابا کا مزار کہاں ہے؟'' اسجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں...... تم لوگوں کا وہاں جانے کا بھی ارادہ ہے؟''

''شاید......'' اسجد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ضرور...... ضرور جانا...... کل...... تو...... تو ہمارے ساتھ گیا نہیں...... آج دوستوں کے ساتھ ہی چلے جانا۔ سچ بڑا سکون ہے، ان کے مزار پر...... اور سنا ہے بڑی کرامتوں والے تھے...... اچانک نابینا ہو گئے مگر اللہ نے ان کے دل کی آنکھیں روشن کر دیں۔ وہ وقت سے پہلے ہر بات بتانے لگے اور سنا ہے کل ہونے والی باتیں اللہ انہیں رات کو خواب میں دکھا دیتا تھا...... ایسے اللہ والے کم ہی ہوتے ہیں......'' اس کی ماں نے انتہائی حیرت سے بتایا تو اسجد خاموشی سے سنتا رہا۔

''اور...... یہ صوفی صاحب کون ہیں...... جن کے بارے میں ابا جی کل بتا رہے تھے۔'' اسجد نے باتوں باتوں میں ماں سے بھی معلومات لینا چاہئیں۔

''معلوم نہیں...... پر ان کے بارے میں بڑی باتیں سنی ہیں۔ بڑے سالوں سے شاہ بابا کے مزار کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اللہ والے ہیں۔'' اس کی ماں نے بتایا۔

''اور ان کی کوئی کرامت مشہور نہیں؟'' اسجد نے مسکرا کر پوچھا۔

''پتا نہیں...... اس کے بارے میں نہیں سنا...... بس تیرا باپ ہی بڑی تعریف کرتا ہے، کئی بار ملنے گیا مگر ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔'' اس کی ماں نے بتایا۔

''ملاقات کیوں نہیں ہو سکی؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' اس کی ماں نے کہا اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا اور اسجد کو شاہ بابا کے مزار کا ایڈریس سمجھانے لگی۔

دوپہر کے قریب اسجد شاہ بابا کے مزار پر پہنچا جو اس کے گاؤں سے کافی دُور تھا۔ شاہ زیب کی قبر پر بہرام خان نے سفید سنگِ مرمر کی انتہائی

دیدہ زیب عمارت بنوائی تھی جس کے اندر قدم رکھتے ہی گلاب کے تازہ پھولوں کی مسحور کن خوشبو اور اگربتیوں کی مہک زائرین کے قلب و روح کو معطر کر دیتی۔ اک عجیب سے سکون اور خوشی کا احساس روح میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا۔ شاہ زیب کی وفات کو پندرہ سولہ برس ہو گئے تھے اور ماسٹر باسط علی اس وقت سے ہی مزار کی ہر طرح کی خدمت میں مصروف رہتے۔ وہ رات رات بھر قبر کے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب لئے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے۔ صبح باسی پھولوں کو اٹھا کر تازہ پھول ڈال کر اور شاہ زیب کی روح کے لئے دعائیں مانگ کر مزار سے باہر چلے جاتے۔ پھر سارا دن وہ مزار پر نہ آتے اور جب رات کو اکا دکا لوگ رہ جاتے تو پھر مزار پر آ جاتے۔ شاہ زیب لوگوں کے لئے ''شاہ بابا بن اور شاہ جی'' چکا تھا، جس کے مزار سے وہ بے حد عقیدت اور محبت رکھتے تھے......اور ان کا عقیدہ بھی تھا کہ ان کے مزار پر دعائیں مانگنے والوں کی دعائیں بھی پوری ہوتی ہیں۔

اسجد نے مزار پر بھرپور نظر دوڑائی اور گہری سانس لی......اک خوشگوار سا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی مزاروں پر نہیں گیا تھا اور نہ ہی مزاروں پر جانے کو اچھا خیال کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مخالفت کرتا تھا، اس لئے بھی یار محمد اس کے سامنے بہت کم کسی مزار یا بزرگ کا ذکر کرتا تھا۔ اس نے دعا پڑھی اور مزار پر پھول ڈال کر باہر نکل آیا۔ کچھ لوگ مزار کے باہر دریوں پر قطار میں بیٹھے تھے اور ایک سفید باریش آدمی ان میں کھانا تقسیم کر رہا تھا۔ اسجد اس آدمی کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ پاس ہی کھڑے ایک لڑکے کے پاس چلا گیا۔

''کیا یہ صوفی صاحب ہیں؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''ارے......نہیں......وہ یہاں کہاں؟'' لڑکا مسکرا کر بولا۔

''تو......پھر......وہ کہاں ہوں گے؟'' اسجد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''وہ سارا دن کھیتوں میں ہوتے ہیں......یا......پھر مدرسے میں۔'' اس لڑکے نے جواب دیا۔

''اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟''

''میرا خیال ہے......کھیتوں میں ہوں گے......''

''کھیت کس طرف کو ہیں......؟'' اسجد نے اس سے پوچھا۔

''ادھر آؤ......میں بتاؤں......'' وہ لڑکا اسے لے کر مزار سے باہر چلا گیا۔ اس کچی سڑک پر سیدھے چلتے جاؤ، جہاں ختم ہوتی ہے وہاں کھیت شروع ہوتے ہیں۔'' لڑکے نے اسے بتایا۔

''شکریہ......'' وہ کہہ کر جانے لگا۔

''آپ صوفی صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہو......؟'' لڑکے نے اچانک پیچھے سے سوال کیا، جس کا اسجد کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے چلنے لگا۔

''وہ......واقعی ان سے کیوں ملنا چاہتا ہے......اور اگر وہ مل گئے تو ان سے کیا سوال کرے گا......؟ کیا وہ ان کو یہ کہے گا کہ وہ صرف ان کو

دیکھنے آیا ہے...... یا پھر اپنے اندر کا کوئی اضطراب دور کرنے آیا ہے...... یا پھر محض ان سے ملنے کا شوق اور تجسس اسے ان کے پاس لے آیا ہے......"
وہ اپنی ہی سوچوں میں گم کچی سڑک پر چلنے لگا، سڑک اس قدر لمبی تھی کہ ختم ہونے کو ہی نہ آ رہی تھی، سڑک کے دونوں جانب گندم کے کھیت تھے، فصل تیار کھڑی تھی...... درختوں اور وسیع کھیتوں کے علاوہ کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دے رہا تھا۔

"اصل کھیت...... تو اس سڑک کے ختم ہونے پر شروع ہوں گے...... اور یہ سڑک نجانے کب ختم ہو گی؟" اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ موسم قدرے گرم بھی تھا اور سورج بھی عین سر پر تھا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے قدرے فاصلے پر گدھا گاڑی کی آواز آئی وہ رک گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا...... گدھا گاڑی پر دو نوجوان لڑکے سوار تھے...... اسجد نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا...... اور ان کے ساتھ سوار ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسجد نے پوچھا۔

"کھیتوں تک......" ایک نے جواب دیا۔

"مجھے بھی وہیں جانا ہے۔" اسجد نے بتایا۔

"کیوں......؟" دوسرے نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی سے ملنا ہے۔" اسجد نے جواب دیا۔

"کیا...... صوفی صاحب سے؟" اس لڑکے نے حیرت سے پوچھا، تو اسجد خاموش ہو گیا، وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے۔ سڑک کافی آگے جا کر ختم ہوئی تو انہوں نے اسے اترنے کو کہا۔

"یہاں سے کھیت شروع ہوتے ہیں...... ویسے یہاں تم کس سے ملنے آئے ہو......؟ لوگ تو یہاں صوفی صاحب کو ہی ملنے آتے ہیں۔" اسی لڑکے نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"ہاں...... میں بھی ان سے ملنے آیا ہوں۔" اسجد نے کہا۔

"پھر تو بڑے ہی بے وقوف ہو...... میں نے پوچھا بھی تم نے بتایا نہیں...... اگر وہیں بتا دیتے تو ہم تمہیں ادھر ہی بتاتے کہ صوفی صاحب کو آج اچانک شہر جانا پڑ گیا تھا، وہ تو شہر چلے گئے ہیں۔ اس لڑکے نے بتایا تو اسجد کے چہرے پر پسینہ آنے لگا، اتنی لمبی سڑک اور اتنے سفر کا سوچ کر اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

"ک...... کب...... واپس آئیں گے؟" اسجد نے پوچھا۔

"اب تو رات کو ہی آئیں گے...... بہرام خان کا بیٹا اچانک بیمار ہو گیا ہے اور صوفی صاحب کو وہاں جانا پڑ گیا...... مگر یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ رات کو بھی آتے ہیں یا نہیں...... ویسے تو وہ کم ہی وقت گاؤں سے باہر گزارتے ہیں کیونکہ انہوں نے رات کو ہر حال میں شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینا ہوتی ہے...... اس لئے ممکن ہے وہ رات کو آ جائیں، لڑکے نے اسے تفصیلاً بتایا۔ اسجد انتہائی پریشان ہونے لگا۔

"یہاں سے واپس جانا کیسے ممکن ہے...... میرا مطلب ہے کوئی سواری......؟" اسجد نے ڈھلتے سورج کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''سواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... البتہ ہم کوئی دو گھنٹے بعد واپس جائیں گے۔'' سبزیاں لینے آئے ہیں، اگر انتظار کر سکتے ہو تو...... کرلو...... ''لڑکے نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں یہیں کہیں انتظار کر لیتا ہوں۔'' اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے......'' دونوں کھیتوں کے اندر چلے گئے اور اسجد افسردہ دل کے ساتھ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''انسان کتنا دکھی ہوتا ہے جب اتنا لمبا سفر اچانک رائیگاں چلا جاتا ہے......شدید قسم کا احساسِ زیاں اس کے دل کو پریشان کرنے لگا۔ یقیناً اباجی نے بھی کئی بار کوشش کی ہوگی مگر وہ بھی صوفی صاحب کو نہیں مل پائے...... آخر وہ کیوں نہیں مل پاتے...... اس میں کیا راز ہے......؟ وہ متجسس ہو کر سوچنے لگا۔

''کیا مزار پر موجود لڑکے کو معلوم نہیں تھا کہ صوفی صاحب شہر گئے ہیں؟ ہوسکتا ہے اسے اس بات کی خبر نہ ہو......'' کئی سوالات اس کے ذہن میں آنے لگے...... وہ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا، کبھی تھک کر بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے رات تک گھر بھی پہنچنا تھا۔ اس کی ماں نے اسے خصوصی تاکید کی تھی کہ وہ شام تک گھر لوٹ آئے۔ اس نے بڑی مشکل سے دو گھنٹے گزارے اور سبزیوں سے لدی گدھا گاڑی پر ان دو لڑکوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ وہ قدرے مایوس تھا، اس کے دل میں عجیب سا ملال تھا۔ صوفی صاحب سے نہ ملنے کا رنج اسے بہت شدت سے اندر ہی اندر دکھ دے رہا تھا۔ وہ رات کو بہت دیر سے گھر پہنچا تو اس کے ماں باپ بے حد فکر مند ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہیں قدرے سکون آ گیا۔

''بیٹا...... تو...... کہاں چلا گیا تھا...... تیری ماں بتا رہی تھی کہ دوستوں کے ساتھ شاہ بابا کے مزار پر گیا ہے۔ مجھے تو بڑی حیرت ہوئی کہ تجھے اچانک کیا ہو گیا۔ ایک دن پہلے تو...... تو...... ہمارے ساتھ جانے پر راضی نہ تھا اور ہمیں بھی منع کر رہا تھا...... اور اگلے دن خود ہی چلا گیا...... یہ تیرے دل کی دنیا کیسے بدل گئی......؟'' یار محمد نے مسکرا کر پوچھا۔

''اباجی...... آپ نے اللہ والوں کی اتنی تعریفیں کیں کہ دل نے چاہا...... ان سے جا کر ملوں...... مگر......'' اسجد خاموش ہو گیا۔

''مگر...... صوفی صاحب نہیں ملے۔'' یار محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... مگر وہ کیوں نہیں ملتے؟'' اسجد نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''سنا ہے...... وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں...... کوئی ملنے جائے تو اس قدر خاموش ملتے ہیں کہ لوگ خاموشی سے ہی لوٹ آتے ہیں...... وہ بہت کم کسی سے بات کرتے ہیں۔'' یار محمد نے بتایا۔

''اباجی...... کیا یہ تکبر کی بات نہیں......؟ کہ لوگ اتنی دور سے سفر طے کر کے جائیں اور ان کا رویہ اتنا سرد ہو کہ جانے والے لوگ مایوس ہو جائیں۔'' اسجد نے آہ بھر کر کہا۔

''بیٹا......وہ اس بات سے منع کرتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس اپنی ضرورتوں کے لئے دعائیں کرانے نہ آئیں۔ دعائیں قبول کرنے والا اللہ ہے جو اپنے ہر بندے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔'' یار محمد نے جواب دیا تو اسجد باپ کی بات کا قائل ہو گیا کیونکہ وہ خود بھی یہی نظریات رکھتا تھا اسی لئے مزاروں پر جانے کے خلاف تھا۔ صوفی صاحب کی بات اس کے دل میں اتر گئی اور وہ خاموش ہو گیا......لیکن اس کے دل میں صوفی صاحب کو ملنے کی خواہش مزید زور پکڑنے لگی۔ وہ ان کے بارے میں اٹھتے، بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا اور دو تین دنوں کے بعد اس نے پھر وہاں جانے کا پروگرام بنایا مگر اس بار وہ گھر بتا کر گیا کہ اگر اسے دو تین دن وہاں لگ جائیں تو وہ پریشان نہ ہوں۔ یار محمد نے اس کا شوق دیکھ کر خوشی سے اسے اجازت دے دی۔ اسجد مزار پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ صوفی صاحب کھیتوں میں ہیں، وہ اسی راستے پر چل پڑا، بڑی مشکل سے کھیتوں میں پہنچا تو وہاں کوئی نظر نہ آیا، کہیں دور دور اکا دکا مزارعے کام کرتے نظر آئے۔ وہ کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا ایک کھلی جگہ پر آیا جہاں درختوں کے سائے تلے دو تین چار پائیاں بچھی تھیں اور ان پر دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ اسجد نے ان سے سلام لے کر مصافحہ کیا اور صوفی صاحب کے بارے میں پوچھنے لگا۔'' وہ یہیں کہیں ہوں گے......'' ایک آدمی نے کھڑے ہو کر دور تک نظر دوڑائی۔

''میرا خیال ہے......وہ......وہاں پر ہیں......'' اس شخص نے دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں......کہاں......؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ......دیکھو......جو آدمی گٹھا سر پر اٹھائے چلا آ رہا ہے۔'' اس شخص نے کہا تو اسجد نے چونک کر اس شخص کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

''کیا......وہ صوفی صاحب نہیں؟'' اسجد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......بھئی......صوفی صاحب درویش آدمی ہیں......میں نے بتا دیا......تو اب تم انہیں پہچان لو گے......ورنہ کوئی صوفی صاحب کو نہیں پہچان سکتا......جاؤ مل لو۔'' اس آدمی نے کہا اور واپس جا کر چار پائی پر بیٹھ گیا اور اسجد حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ قدرے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس نے ملگجا سا تہبند باندھ رکھا تھا اور لٹھے کی بنیان نما کرتی پہنی ہوئی تھی، بازو ننگے تھے اور پاؤں میں ربڑ کی خستہ حال چپل تھی، سر پر گھاس کا گٹھا تھا، گندمی رنگت دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے جل کر قدرے سیاہ ہو چکی تھی۔ اسجد قدرے بھاگتا ہوا ان کے پیچھے گیا اور بلند آواز میں 'صوفی صاحب' پکارا......انہوں نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی مڑ کر دیکھا۔ یوں چلتے رہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اسجد بھاگتا اور قدرے ہانپتا ہوا ان کے قریب جا پہنچا۔

''صوفی صاحب......'' اسجد نے ہانپتے ہوئے کہا تو صوفی صاحب نے سر ذرا سا اس کی جانب گھما کر دیکھا۔ ان کا چہرہ اور جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا......پسینے کے قطرے ان کی کھچڑی داڑھی کو بری طرح تر کر رہے تھے۔ بازوؤں اور گلے سے بھی پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جسم پر پہنی لٹھے کی کرتی بھی بری طرح گیلی ہو رہی تھی۔

''صوفی......صاحب......میں آپ سے ملنے آیا ہوں......بہت دور سے۔'' اسجد نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ صوفی صاحب

نے چونک کر اور قدرے حیرت سے اس نوجوان کی جانب دیکھا اور خاموش رہے۔

"میں اس روز بھی آیا تھا...... بہت لمبا سفر کر کے...... میں کھیتوں تک بہت مشکل سے پہنچا مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا آپ شہر گئے ہیں...... میں بہت مایوس اور پریشان ہوا۔" اسجد تیز تیز بولا۔

صوفی صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ سر پر گٹھا اٹھائے چلتے رہے۔

"مجھے آپ سے ملنے کی بہت خواہش ہو رہی تھی۔" اسجد نے قدرے پرجوش انداز میں کہا تو صوفی صاحب نے اسے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"صوفی صاحب...... آپ...... میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔" اسجد نے پوچھا۔

"آپ نے سوال...... کب کیا ہے؟ صوفی صاحب نے انتہائی آہستہ آواز میں کہا۔ ان کے لہجے میں انتہائی اعتماد اور قطعیت تھی...... اور آواز میں قدرے رعب سا تھا۔ اسجد ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا...... واقعی...... اس نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کس بات کا جواب دیتے وہ تو اپنی ہی باتیں سنا رہا تھا...... اسجد خاموش ہو گیا...... نجانے اس پر کیسا سحر طاری ہو گیا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔ ان کے سنگ چلتا رہا اور وہ بھی خاموشی سے چلتے رہے...... اسجد انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتا مگر مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں گائے، بھینسوں کا باڑہ تھا...... ہر طرف بیل گائے، بھینسیں اور بکریاں تھی۔ صوفی صاحب نے سر پر اٹھایا گٹھا نیچے اتارنا چاہا تو اسجد نے آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنا چاہی۔

"انسان کو اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہئے۔" انہوں نے اسجد سے کہا۔ اسجد فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ انہوں نے اپنا گٹھا اتار کر زمین پر رکھا...... پاس رکھے مٹی کے گھڑے سے پانی کا گلاس لا کر اس کی جانب بڑھایا۔ اسجد نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور گلاس پکڑ لیا۔ واپس جا کر انہوں نے دوسرا گلاس پانی سے بھرا اور پینے لگے۔

اسجد نے بھی جلدی سے پانی پیا، اسے بھی سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

صوفی صاحب اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ کر اسے بغور دیکھنے لگے۔

"کیوں آئے ہو......؟"

"آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔"

"کیوں......؟"

"آپ کے بارے میں بہت سنا تھا۔"

"سنی...... سنائی باتوں پر یقین کرنا حماقت ہے۔"

"کچھ باتوں میں سچائی بھی ہوتی ہے۔"

"یوں کہو...... سچ جاننے آئے ہو۔"

اسجد نے چونک کر ان کی جانب دیکھا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو...... وہ خاموش ہو گیا۔

انوار احسن صدیقی کے قلم سے ایک مکمل شاہکار جاسوسی ناول
لہو پھر ٹپکا
......کراچی کو لہو کا غسل دینے والے ہاتھ کس کے ہیں؟
......کراچی کے وجود میں آنے اور موجودہ حالات میں پہنچنے کی مکمل تاریخ۔
......سہراب گوٹھ کی حقیقت کیا ہے؟
قیمت: -/150 روپے

''اپنے اندر کی بے چینی دور کرنا چاہتے ہونا۔'' صوفی صاحب نے کہا تو اسجد نے پھر چونک کر انہیں دیکھا اور قدرے گھبرا سا گیا۔

''پہلے اپنے آپ پر ایمان لاؤ...... پھر سچ کو جاننا۔'' اسجد نے چونک کر دیکھا...... اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس کا دل کسی شے سے خالی ہو رہا ہو...... اس کے اعصاب شل اور ہمت جواب دے رہی ہو۔

''ک...... کک...... کیا...... مطلب......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''سچ کو سامنے دیکھ کر پھر...... مکر جاتے ہو مگر...... سچ کبھی نہیں بدلتا...... ایک بار دیکھو یا سو بار۔'' صوفی صاحب نے کہا تو وہ چونک گیا۔

''کتنی بار حقیقت کو قریب سے دیکھا ہے؟'' صوفی صاحب نے پھر اس کی آنکھوں کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا تو اسجد یوں چونکا جیسے اسے کوئی جھٹکا لگا ہو۔

''اللہ والے...... دل کی باتیں جان لیتے ہیں۔'' اس کے باپ کی آواز اس کے ذہن میں گونجی اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

''کیا...... آ...... آپ...... اللہ...... والے ہیں؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''استغفر اللہ...... میں اس قابل کہاں؟'' صوفی صاحب نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر...... آپ کون ہیں؟''

''اس کا ادنیٰ سا غلام...... غریب مزارع...... بس اور کچھ نہیں۔ اپنا وقت مت ضائع کرو...... میرے پاس کچھ نہیں...... سب اس کے پاس ہے۔'' انہوں نے پھر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور چارپائی سے اٹھ کر جانے لگے۔ اسجد خاموشی سے ان کی جانب دیکھنے لگا، جیسے ان سے کچھ کہنا بھی چاہتا ہو...... مگر کہہ نہ پا رہا ہو۔

صوفی صاحب ایک چھوٹے سے کمرے میں چلے گئے اور جا کر اپنا لباس بدلا، سفید کاٹن کی شلوار قمیص پہنی اور اسے دیکھے بغیر وہاں سے چلے گئے...... اسجد خاموش بیٹھا رہا۔

''تم...... کون ہو...... اور یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' ایک درمیانی عمر کے آدمی نے باڑے میں سے آ کر پوچھا۔

''وہ...... میں...... صوفی صاحب۔'' وہ بمشکل بولا۔

''اب وہ نہیں آئیں گے...... مدرسے چلے گئے ہیں اور وہاں سے شاہ بابا کے مزار پر چلے جائیں گے۔ تم بھی جاؤ...... یہاں سے......''

اس آدمی نے کہا تو اسجد نے آہ بھری اور وہاں سے چلا گیا۔

''اس کے پاس واقعی کہنے کو کچھ ایسا نہیں تھا جو صوفی صاحب کو اس کی جانب متوجہ کر سکتا مگر...... شاید صوفی صاحب کے پاس بہت کچھ ایسا تھا جس نے اس کے اندر کے اضطراب کو تجسس میں بدل دیا تھا۔ اس کا دل ان کے پیچھے لپک رہا تھا...... اور ان سے مزید ملنے کی تمنا اور باتیں کرنے کی خواہش زور پکڑ رہی تھی۔ وہ شام ہونے تک بہت مشکل سے شاہ بابا کے مزار پر پہنچا تو وہاں رات کا کھانا تقسیم ہو رہا تھا، اس نے کھانا کھایا اور منتظر نگاہوں سے اس راستے کی جانب دیکھنے لگا جہاں سے صوفی صاحب کے آنے کی امید تھی۔ اس کا انتظار بڑھتا جا رہا تھا مگر صوفی صاحب نہیں آ رہے تھے۔

رات گہری ہونے لگی اور ہر طرف تاریکی چھانے لگی......لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا......اکا دکا لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ جب صوفی صاحب مزار پر پہنچے، اسجدان کو دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے پیچھے لپکا۔

''صوفی صاحب......'' اس نے آہستہ آواز میں پکارا......تو انہوں نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم......ابھی تک یہاں ہو۔'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......وہ......میں۔'' وہ بمشکل بولا۔

صوفی صاحب نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور مزار کے اندر چلے گئے......اس نے بھی ان کے پیچھے جانا چاہا مگر ایک آدمی نے اسے روک دیا۔

''اب کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا......'' اس آدمی نے کہا۔

''کیوں......؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''صوفی صاحب......مزار پر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں اور اس دوران وہ کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے......'' اس آدمی نے کہہ کر مزار کا دروازہ بند کر دیا۔

اسجد پریشان ہو گیا......اور مزار کے صحن میں ایک چٹائی پر بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کس قدر مشکل ہو رہا تھا ایک ایک لمحہ گزارنا......انتظار......اور اضطراب......دونوں ایسی کیفیتیں ہوتی ہیں جو اندر ہی اندر انسان کو بہت بے قرار رکھتی ہیں اور ایسی ذہنی اذیت سے دوچار کرتی ہیں، جس کا مداوا......وصل کے علاوہ کوئی اور شے نہیں کر سکتی۔ وہ وہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ یونہی چلے جانے سے اس کے اندر کا اضطراب اور بڑھ جاتا......اور جس کیفیت سے وہ گزر رہا تھا......اس میں نہ قرار تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی راہ، وہ کبھی چٹائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا اور کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ ساری رات اس طرح بے چینی میں گزری۔

جیسے ہی صبح کی روشنی نمودار ہوئی شاہ بابا کے مزار کا دروازہ کھلا، صوفی صاحب نے گلاب کے تازہ پھول منگوائے، انہیں قبر پر پھیلایا اور دُعا پڑھ کر وہاں سے باہر نکل آئے۔ اسجد نے ان کے پیچھے جانا چاہا مگر وہ اسے دیکھے بغیر مزار کے پیچھے اپنے حجرے میں چلے گئے۔ اسجدان کے پیچھے چلا گیا مگر انہوں نے دروازہ بند کر لیا وہ پھر مایوس سا ان کے حجرے کے باہر بیٹھ گیا۔ دن کافی چڑھ گیا تھا۔ اسجد کو بھوک ستانے لگی تو وہ صحن میں آ گیا......چند لوگ مزار کے صحن میں موجود تھے، انہیں ناشتہ دیا جا رہا تھا، وہ بھی بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا اور ناشتے سے فارغ ہو کر دوبارہ صوفی صاحب کے حجرے کے پاس گیا، مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ صوفی صاحب جا چکے تھے۔ وہ انتہائی پریشان ہونے لگا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں، اس نے مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''یہ......یہ......سب کیا ہو رہا ہے......میں نہ تو یہاں سے جا سکتا ہوں اور نہ ہی بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہوں، کیا کروں......؟'' اس نے بے بسی سے سوچا۔ اس کا دل مایوسی اور اضطراب سے بے قرار ہونے لگا۔

''مجھے پھر کھیتوں میں جانا چاہئے......وہ ضرور وہاں گئے ہوں گے......'' اس نے سوچا اور مزار کے احاطے سے باہر نکلنے لگا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

''اگر وہ وہاں نہ ہوئے.....تو.....؟'' اس سوچ نے اس کے قدم جکڑ لئے اور اس نے ایک دو لوگوں سے صوفی صاحب کے بارے میں پوچھا۔

''آج.....وہ کھیتوں میں نہیں گئے.....''

''پھر.....کہاں گئے؟''

''معلوم نہیں.....وہ بتا کر نہیں گئے۔''

اسجد بے حد مایوس ہوا اور واپس مزار کے صحن میں آ کر انتظار کرنے لگا۔ پہلے رات نہیں گزر رہی تھی اور اب دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس قدر بے قرار ہو رہا تھا کہ پھٹنے کو تیار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔

''کیا اللہ والے.....لوگ ایسے ہوتے ہیں.....جو دوسروں کے احساسات کی پروا نہیں کرتے.....انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ لوگ کتنی مشکل سے ان تک پہنچتے ہیں.....'' اسجد کے دل نے شکایت کی اور اس نے گہری سانس لی۔

اسجد نے انتہائی مفلسی میں بچپن گزارا تھا۔ اس کے ماں باپ غریب مزارعے تھے، جو دن شروع ہونے سے پہلے کھیتوں میں چلے جاتے اور رات گئے گھر واپس لوٹتے۔ اتنی محنت کا صلہ صرف انہیں اناج کی صورت میں ملتا اور اگر چند روپے ملتے بھی تو اس کے عوض ان سے اتنا کام کروایا جاتا کہ تھکے ہارے گھر لوٹتے تو اٹھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اسجد نے انتہائی محرومی اور کسمپرسی میں وقت گزارا تھا۔ بہت مشکل سے تعلیم حاصل کر کے وہ شہر چلا گیا تھا اور شہر میں مختلف جگہوں پر نوکری کر کے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ زندگی بھر اتنی محنت کا صلہ اس کے ماں باپ کو کیا ملا تھا.....؟

دونوں سچے اور نیک انسان تھے.....مگر نہ کبھی نیکی نے ان کی قسمت بدلی تھی اور نہ ہی سچائی نے.....ان کی زندگیوں میں کبھی ہرے دن نہیں آئے تھے اور اس نے خود کتنی محنت سے تعلیم حاصل کی تھی وہ ہونہار اور لائق طالب علم رہا تھا، اس سے کم ذہین لڑکے اس سے آگے نکل جاتے.....اور وہ ہر بار مایوسیوں کا شکار ہو جاتا.....اور جب اس نے نوکری شروع کی تھی تو ہر طرف اس کی قابلیت کے ڈنکے بجنے لگے۔

اسے خدا سے اتنے شکوے اور شکایتیں تھیں کہ کبھی کبھار وہ شرمندہ بھی ہو جاتا اور باغی بھی، وہ ہر وقت اندر ہی اندر خدا سے ناراض رہتا.....جب لوگ اللہ کی مصلحتوں اور اس کی حکمتوں کی تعریفیں کر رہے ہوتے تو وہ خاموشی سے وہاں سے چلا جاتا.....اللہ اس کے اندر موجود تھا.....ایک رقیب کی طرح.....ایک ایسی طاقت کی طرح.....جو بہت قوتوں کا مالک ہے۔ مگر وہ طاقت اس کے لئے نہ تو بہتر سوچتی تھی اور نہ کچھ بہتر کرتی تھی۔ وہ ایسی خاموش قوت کی مانند تھی جو اس کی اذیتیں اور تکلیفیں بڑھا کر خوش ہوتی تھی.....جس نے انسان کو تماشا بنا رکھا ہے.....جس نے انسان کو زندگی کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر اس کی تکلیفیں بڑھائی ہیں.....جو انسان کو خوش نہیں دیکھ سکتا اور اگلے ہی لمحے اسے کسی ایسی آزمائش اور اذیت میں ڈال دیتا ہے، جس سے اس کی ساری خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں.....جو کسی بھی لمحے انسان کو پرسکون نہیں ہونے دیتا.....جس نے زندگی کو انسان کے لئے اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ وہ اس سے فرار بھی نہیں حاصل کر سکتا.....مرنا چاہے تو اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا.....اس نے انسان کو آکٹوپس کی طرح ایسے شکنجے میں جکڑ دیا ہے، جس سے رہائی ممکن نہیں.....وہ تب ہی اسے اپنے شکنجے سے آزاد کرے گا جب انسان مر جائے گا۔ ہر طرف مجبوری، بے بسی اس کی اذیتیں بڑھاتی رہتی ہیں۔

''نجانے کن ناکردہ گناہوں کی سزا انسان اس دنیا میں بھگت رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے سوچتا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کرتا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ وہ اللہ سے شکوے، شکایتیں کرتا اور کبھی کبھار اس کے بارے میں پرامید ہوکر مثبت انداز میں سوچنے لگتا...... مگر امید کا وہ لمحہ بہت ناپائیدار ثابت ہوتا اور اگلے ہی لمحے وہ پھر مایوس ہو جاتا، منفی سوچیں اور مایوسیاں اس کو ہر وقت اتنا مضطرب، اداس اور پریشان رکھتیں کہ وہ ہنسنا بھول گیا تھا...... اور ان منفی سوچوں نے اسے قدرے بداعتماد بھی بنا دیا تھا، کیونکہ جو وہ سوچتا تھا اور جو نظریات اس نے خود سے گھڑ لئے تھے۔ دوسرے اکثر ان کو جھٹلا دیتے اور ان کو رد ہوتے دیکھ کر وہ اور مایوسی کا شکار ہو جاتا۔

''زندگی اس سے کیا کھیل...... کھیل رہی تھی...... وہ خود نہیں جانتا تھا مگر وہ زندگی سے بے حد مایوس ہو چکا تھا...... اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے...... انسان سے اور اس سے بڑھ کر اللہ سے......''

سارا دن انتہائی اضطراب میں گزرا...... شام ہوئی تو اس نے شکر ادا کیا، کیونکہ صوفی صاحب کے آنے کی امید بندھی تھی۔ رات گئے صوفی صاحب آئے اور شاہ بابا کے مزار کے اندر داخل ہونے لگے۔ اسجد دروازے کے ساتھ کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم...... ابھی تک گئے نہیں؟'' صوفی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیوں......؟''

اسجد نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ صوفی صاحب نے بغور اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر چلے گئے، اس نے بھی جانے کی کوشش کی لیکن اسی آدمی نے اسے روک لیا، جس نے اسے کل روکا تھا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اسجد مایوس ہو کر پھر مزار کے صحن میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ''ایسا کب تک ہوتا رہے گا...... اللہ بھی سنگدل ہے اور اللہ والے بھی۔'' اس نے نم آنکھوں سے تاریک آسمان کو دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا اور سسکنے لگا۔

''تمام نوری مخلوق نے چونک کر اس کی آواز سنی...... انسان کی اتنی جرأت اور بے باکی...... کہ وہ برملا اللہ کی شان میں گستاخی کر رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر سفید روشنی کی جانب دیکھا...... انہیں امید تھی کہ اب کی بار بڑی سرکار ضرور جلال میں آئے گی اور ممکن ہے ایسے گستاخ انسانوں کو نیست و نابود کر دے...... مگر سفید روشنی اسی طرح پرسکون انداز میں چمک رہی تھی...... اس کی روشنی میں جلال دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئے...... کہ...... بڑی سرکار انسان کو کس قدر مہلت اور چھوٹ دیتی جا رہی ہے...... نہ تو اتنے انسانوں کے شکوے، شکایتوں پر جلال میں آئی اور نہ ہی اس شخص کو پکڑ میں لیا، جو کتنا بڑا گستاخ اور بے ادب تھا...... بلکہ انہیں روشنی میں سے ٹھنڈک سی نکلتی محسوس ہوئی...... جیسے کوئی حلیم اور بردبار ہستی، چھوٹے اور بے ادب لوگوں کی نافرمانیوں کو انکی نادانیاں سمجھ کر مسکرا دے۔

''اللہ...... تو...... بہت ظالم ہے...... ہم انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم پر ظلم کرے...... تو اپنی تسکین کے لئے...... ہم انسانوں کو مجبور اور بے بس کر کے...... مجرم بنا کر اپنے سامنے ہر وقت کٹہرے میں کھڑا رکھتا ہے...... ہم انسان تیرے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ جن کی ڈوریں تیرے ہاتھ میں ہیں اور تو ہمارے ساتھ کھیل...... کھیلتا رہتا ہے...... ہمارے آنسوؤں پر مسکراتا ہے۔ تجھے ہم پر ذرا بھی رحم نہیں آتا...... تو بہت جابر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے..... بہت ظالم' اسجد انتہائی غصے میں بڑبڑانے لگا۔

''نوری مخلوق نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا ''انسان'' ...... جسے فخر سے شاہکار بتایا جاتا ہے.....وہ اس قدر بے ادب، گستاخ اور بدتمیز ہے کہ اس کی شان میں گستاخی پر گستاخی کرتے جا رہا ہے۔

اب بڑی سرکار اسے نہیں چھوڑے گی.....اور اس سرکش کو عبرت ناک سزا دے گی۔'' انہوں نے سوچا ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا تھا۔

''اللہ بہت بے رحم ہے...... وہ ہم انسانوں پر ذرا سا رحم نہیں کرتا...... ہمیں اذیتیں دے کر خوش ہوتا ہے..... اگر ہمارے ساتھ یہی کرنا تھا تو ہمیں پیدا ہی کیوں کیا..... خود ہی پیدا کر کے..... خود ہی ہمیں مصیبتوں میں ڈال دیا ہے..... اور..... اگر ہم روئیں..... چلائیں..... شکوے کریں..... تو ہم گنہگار......

یہ کیسا انصاف ہے......؟''

ہمیں تو نے دیا کیا ہے.....؟ ہر شے تو نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے..... جسے چاہتا ہے تو عطا کرتا ہے..... جس سے چاہتا ہے تو چھین لیتا ہے...... جو سچائی اور نیکی کے راستے پر چلتا ہے اسے زیادہ تکلیفیں ملتی ہیں..... اور تو ایک بار نہیں..... بار بار آزماتا ہے..... انسان کو تو اتنا بے بس، مجبور بنا کر کہتا ہے ''میں نے انسان کو اچھا..... اور برا کام کرنے کا اختیار دیا ہے؟ انسان کے پاس اختیار ہے ہی کب.....؟ وہ اپنی مرضی سے کر ہی کیا سکتا ہے.....؟''

''کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں اسجد کا دل چلا چلا کر واویلا کرنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

تمام نوری مخلوق اس کے واویلا کرنے کی آوازیں اور اس کے شکوے سن کر چونک رہی تھی..... اسجد کے ہر لفظ پر وہ حیران ہو رہے تھے۔

''انسان..... کس قدر گستاخ اور بے ادب ہے..... کہ بات کرتے ہوئے سوچتا بھی نہیں کہ وہ کس عظیم الشان ہستی سے مخاطب ہے...... ادب و لحاظ تو ایک جانب..... وہ اپنی ہر بری بات..... ہر محروی..... کا الزام اللہ کو دے رہا ہے..... مگر بڑی سرکار ہمیشہ کی طرح پرسکون تھی..... یوں جیسے مسکرا رہی ہو.....اور ان کے لئے یہ بات بہت حیران کن تھی کہ بڑی سرکار..... اس گستاخ انسان کی باتوں پر ذرا سی بھی ناراض نہیں ہو رہی...... آخر کیوں.....؟ کیا وجہ ہے.....؟''

کیا بڑی سرکار کو اپنے اس شاہکار انسان سے اتنی محبت ہے کہ اس کی ہر بری بات کو نظر انداز کر رہی ہے..... اس کو کچھ بھی کہنے سے نہیں روک رہی اور اس کی خاطر اس نے ان کے لیڈر کو دھتکار دیا بڑی سرکار کو انسان سے اتنی محبت کیوں ہے؟ کیوں......؟

ان کا لیڈر بھی بڑی سرکار سے بہت محبت کرتا تھا اور جب انسان اس محبت میں شریک ہوا تو وہ انسان کا دشمن بن گیا..... اور جب اس نے انسان سے دشمنی کا اعلان کیا تو وہ خود اس کے خلاف انسان کا محافظ بن گیا...... وہ ہر لمحے اور ہر موقع پر انسان کی ڈھال بن رہا تھا..... تمام نوری، ناری، آبی اور بے شمار مخلوقات کا خالق صرف خاکی مخلوق کے لئے اتنا نرم گوشہ اور اتنی محبت دکھا رہا تھا کہ ان کی اتنی بڑی بڑی غلطیوں اور گستاخیوں پر ان کو پکڑ نہیں رہا تھا۔

''اتنی محبت......اس 'انسان' کے لئے......؟'' ان کے اندر شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے......انہیں اس محبت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور وہ بہت مضطرب اور پریشان ہونے لگے۔ صوفی صاحب نے رات بھر مزار پر گزاری اور صبح شاہ بابا کے مزار پر پھول ڈال کر اور دعا مانگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے......اسجد اپنی نگاہوں کو حجرے کے دروازے پر مرکوز کئے بیٹھا رہا کہ جیسے ہی دروازہ کھلے گا وہ ان کے پاس چلا جائے گا......مگر اچانک ایک آدمی نے اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور صفائی کرنے لگا......وہ اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھا تو اس شخص نے اسے وہاں سے بھی اٹھا دیا۔ اسجد کو سخت غصہ آنے لگا......اسے اپنی انتہائی تذلیل محسوس ہونے لگی اور وہ اٹھ کر مزار سے باہر آ گیا۔ صوفی صاحب اس کے پاس سے گزر گئے اور اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر انتظار کرتا رہا اور ان کے حجرے کی جانب گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ''صوفی صاحب تو کھیتوں میں چلے گئے ہیں۔'' ایک شخص نے بتایا۔ اسجد بہت سٹپٹایا اور اسے پھر غصہ آنے لگا۔ آج اسے تیسرا دن ہونے کو تھا اور صوفی صاحب اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر رہے تھے......اسے ان پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا مگر اس کا دل اس قدر مضطرب تھا کہ وہ اس حالت میں گھر واپس جانا بھی نہیں چاہتا تھا......وہ عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔

''مجھے ایک بار پھر کوشش کرنی چاہئے......آخری بار اور پوری طرح......'' اسجد نے سوچا اور کھیتوں کی جانب چلنے لگا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن کبھی اپنے آپ کو برا بھلا کہتا......اور کبھی اللہ سے شکوے، شکایتیں کرتا ہوا......کچی سڑک پر چل رہا تھا۔ اچانک ایک بارہ، تیرہ سالہ لڑکا بہت تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اس کے پاس سے گزرا، وہ بہت مستی میں پرجوش انداز میں زگ زیگ سائیکل چلا رہا تھا......اچانک وہ اسجد سے ٹکرایا، اسجد سڑک پر گر گیا۔ لڑکا ہنسنے لگا اور اٹھ کر پھر سائیکل پر سوار ہو کر جانے لگا۔ اسجد کو اس کی حرکت پر انتہائی غصہ آیا اور اس نے لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا، اسجد کے اندر جتنا غصہ بھرا تھا وہ سب اس لڑکے پر نکال رہا تھا، کبھی اسے گھونسوں سے مارتا......کبھی لاتوں سے لڑکے کے ناک، منہ سے خون نکلنے لگا۔

''اللہ کے واسطے......معاف کر دو......غلطی ہوگئی......؟'' وہ لڑکا اس کے آگے گڑگڑانے لگا......مگر اسجد کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''معاف کر دو......رحم کرو......آئندہ نہیں کروں گا۔'' لڑکا پھر گڑگڑایا۔

''زندہ رہو گے......تو تب نا......میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اسجد نے اسے زمین پر لٹایا اور اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔

''اللہ کے واسطے......اتنے بے رحم......اتنے ظالم نہ بنو......اللہ میاں مجھے اس ظالم انسان سے بچا۔'' اس لڑکے نے روتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھ کر کہا۔

نوری مخلوق انتہائی حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے خدا سے شکوے، شکایتیں کرنے والا شخص......اللہ کو ظالم اور بے رحم کہنے والا خود کس قدر سنگدل، ظالم اور بے رحم تھا کہ ایک بچے کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کر رہا تھا۔ اسے نہ اس کے آنسوؤں پر رحم آ رہا تھا......نہ اس کے گڑگڑا کر معافی مانگنے پر......اور نہ اس کے خون رستے زخموں پر......

''انسان......کیسی عجیب مخلوق ہے......خود تو اچھائیوں اور کامیابیوں کا طلب گار رہتا ہے اور دوسروں کی ذرا سی خطائیں معاف نہیں کر سکتا......اس قدر کم ظرف انسان......اس قدر جھگڑالو......'' وہ حیرت سے سوچنے لگے۔

''اللہ کے واسطے......چھوڑ دو......دوبارہ کبھی اس راستے پر نہیں آؤں گا۔'' وہ لڑکا پھر گڑگڑایا مگر اسجد اسے چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

اچانک ایک آوارہ کتا کہیں سے بھاگتا ہوا آیا وہ انتہائی تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا اور مسلسل بھونک رہا تھا۔ اسجد اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھ کر ڈر گیا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا، وہ لڑکا جلدی سے اٹھ کر اسجد پر ہنسنے لگا۔

''آیا...... بڑا...... تیس مار...... کتے سے ڈر گیا۔'' اور کہہ کر جلدی سے اپنی سائیکل پر سوار ہوا اور یہ جا...... وہ جا...... کتا بھی بھاگتا ہوا دور نکل گیا...... مگر اسجد اپنی جگہ...... انتہائی شرمندہ اور پریشان ہو رہا تھا، وہ بچپن سے ہی کتوں سے بہت ڈرتا تھا...... وہ سر جھکا کر منہ بناتا ہوا اپنے راستے پر چلنے لگا۔

''بڑھانکنا شیخیاں بگھارنا، انسان کی اوقات...... بس اتنی ہی ہوتی ہے...... اتنا کمزور...... اور ناتواں''

''انسان اندر سے کتنا کمزور ہے۔'' نوری مخلوق نے سوچا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

صوفی صاحب کھیتوں میں گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔ انہوں نے وہی پرانا تہبند اور سوتی بنیان پہن رکھی تھی پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اسجد ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا...... وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔

''آپ...... مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' اسجد نے قدرے خفگی سے کہا۔

''تم...... خود سے اتنی باتیں کر لیتے ہو...... تمہیں کسی کی کیا ضرورت......؟'' صوفی صاحب نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

اسجد ایک دم چونک گیا۔

''میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' اسجد نے کہا۔

''انسان کے شکوے اور شکایتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔'' صوفی صاحب نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

اسجد نے انتہائی حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور یوں شرمندہ ہونے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''م...... م...... میں......؟'' وہ بمشکل بولا۔

''انسان بڑا ہی تنگ دل اور کم ظرف ہے...... وہ چیزیں مانگتا ہے جو خود دینا نہیں چاہتا۔'' صوفی صاحب نے گندم کا گٹھا باندھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تو اسجد گھبرا گیا۔

''انسان سے بڑھ کر ظالم...... بے رحم اور جاہل کوئی نہیں۔'' صوفی صاحب پھر معنی خیز انداز میں آہستہ آواز میں بولے۔

اسجد کے چہرے پر پسینہ آنے لگا...... کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا...... وہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

''اگر اللہ اور اس کی مصلحتیں انسان کے درمیان میں نہ آئیں تو زمین پر ہر طرف فتنہ و فساد ہی ہو۔'' اسجد کو ایک دم بھاگتا ہوا کتا یاد آنے لگا...... اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے۔

''انسان بڑا ہی گنہگار اور بے ادب ہے...... جو زبان دیتا ہے...... جو بولنا سکھاتا ہے...... اس کے خلاف ہی بولتا ہے...... ہے نا...... ناشکری کی بات......؟

واہ.......واہ.......کیا کہنا بھئی.......انسان کا.......ذرہ خاک بڑھ بڑھ کر آفتاب سے جھگڑتا ہے......''صوفی صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''بس کریں.......صوفی صاحب.......معاف کر دیں۔'' اسجد شرمندگی سے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے باندھ کر رونے لگا۔

''کیا ہوا.......؟''میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا.......اور میں کون ہوتا ہوں.......تمہیں معاف کرنے والا.......میری اوقات ہی کیا ہے؟ صوفی صاحب نے سر پر رکھے کپڑے سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ گندم کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ اسجد کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا.......سوائے ندامت کے آنسو بہانے کے.......

''جانتے ہو برائی کی جڑ کیا ہے.......؟'' کافی دیر بعد صوفی صاحب نے اسجد کی جانب دیکھا جو بہت پشیمان ان کے پاس بیٹھا تھا.......اس کا جسم بھی دھوپ میں جل رہا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ اس کے اندر جو بے قراری اور اضطراب تھا اس کی جلن.......دھوپ کی جلن سے کہیں زیادہ تھی۔

''انسان کا اپنے آپ کو بھول جانا'' صوفی صاحب کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔

''ہوس ہر شے کی کرنا.......مانگنا بہت کچھ.......نہ ملنے پر واویلا کرنا.......اور یہ بھی نہ سوچنا کہ میرا کشکول اس قابل ہے بھی کہ نہیں....... بھئی.......پہلے اپنے آپ کو اس قابل تو بنا لو.......نہ ملے.......تو پھر کہنا.......مانگنا سب کچھ.......اور سنبھال کچھ بھی نہ سکنا.......ہے نا عجیب بات؟'' صوفی صاحب اپنے آپ سے بولے تو اسجد نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے صوفی صاحب نے اس کی ایک بہت بڑی کمزوری پکڑی ہو.......اس کے اندر بچپن سے ہی ہوس اور حسد بہت زیادہ تھی وہ ہر وقت دوسروں کی چیزیں اور دولت دیکھ کر کڑھتا تھا.......جو دوسروں کو ملا ہے.......اسے کیوں نہیں ملا.......اس سے کم اہلیت والے لوگ آگے نکل گئے ہیں.......اس کی ساری زندگی ایسی منفی سوچوں کی نذر ہوئی تھی۔ اسجد کا چہرہ شرمندگی سے انتہائی سرخ ہونے لگا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے صوفی صاحب اس کے دل کے ایک ایک خانے میں جھانک رہے ہوں اور اس کے دل میں چھپی کدورتوں، نفرتوں اور کینے کو باری باری نکال کر اسے دکھا رہے ہوں، وہ جو ہمیشہ اپنے آپ کو بے قصور اور مظلوم سمجھتا تھا.......اپنے آپ کو بے ضرر خیال کرتا تھا۔ اب خود ہی اپنے آپ کو سب سے بڑا ظالم، جابر اور کمینہ تصور کر رہا تھا.......اسے اپنے آپ سے نفرت اور کراہت محسوس ہونے لگی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

''جاؤ.......میاں.......یہاں سے.......تم کیا سمجھو گے.......ان باتوں کو.......؟'' صوفی صاحب نے کہا اور کٹی ہوئی گندم کا دوسرا گٹھا باندھنے لگے۔

''صوفی.......صاحب.......جلدی.......آیئے.......''ایک درمیانی عمر کا مزارع انتہائی تیزی سے چلاتا ہوا صوفی صاحب کی جانب بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

''خیر.......تو ہے.......اکبر علی.......''صوفی صاحب نے اس کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔

''صوفی صاحب.......میرے چھوٹے بیٹے نے چوہے مار گولیاں.......کھالی ہیں.......وہ.......انہیں میٹھی گولیاں سمجھ کر کھا گیا ہے خدا کے لئے جلدی چلیں.......اور اس کا کچھ علاج کریں.......ورنہ وہ مر جائے گا۔'' اکبر علی بلند آواز سے رونے لگا۔ صوفی صاحب سب کچھ وہیں چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے گئے اور اسجد بھی ان کے پیچھے چل پڑا، وہ مزارع کھیتوں میں جانوروں کے باڑے کے پاس ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی

بچے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ پانچ سالہ بچہ چارپائی پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اس کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی بلند آواز سے رو رہی تھی...... اور اسے آوازیں دے رہی تھی۔'' صوفی صاحب کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''صوفی صاحب...... اللہ کے واسطے...... کچھ کریں...... میرے بیٹے کو بچالیں۔'' اس عورت نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بی بی...... بچانے والی اللہ کی ذات ہے...... سب دعا کرو...... میں بھی دعا کرتا ہوں اور صوفی صاحب نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے...... اسجد بھی پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے ہاتھ بلند تو نہ کئے مگر ہاتھوں کا رخ آسمان کی جانب کر دیا۔ صوفی صاحب آہستہ آہستہ آنکھیں بند کئے دعا پڑھتے رہے اور باقی سب لوگ بھی دعا کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب نے آنکھیں کھولیں اور بچے پر دم کیا۔

''بی بی...... تھوڑا سا پانی لاؤ......'' صوفی صاحب نے عورت سے کہا اور وہ بھاگ کر ایک گلاس میں پانی لے آئی۔ انہوں نے پانی پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری...... ''اسے بچے کو پلادو...... ٹھیک ہو جائے گا...... گھبرانے کی بات نہیں۔'' صوفی صاحب کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس عورت نے بچے کو تھوڑا تھوڑا پانی پلایا۔ کچھ اس کے اندر گیا اور کچھ منہ سے باہر نکل گیا۔ اب...... میں چلتا ہوں۔'' صوفی صاحب نے کہا۔

''نہیں...... صوفی صاحب...... ابھی نہیں...... پہلے اسے ٹھیک ہو لینے دیں...... میں آپ کو یوں جانے نہیں دوں گی۔'' اس عورت نے گھبرا کر کہا تو صوفی صاحب خاموش ہو گئے اور بچے کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بچے کے جسم میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی...... تو اس عورت نے خوش ہو کر صوفی صاحب کی جانب دیکھا۔

''ٹھیک ہو جائے گا...... فکر نہیں کرو۔'' صوفی صاحب نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''تھوڑی دیر بعد بچہ زور سے ہلا اور اٹھ کر قے کر دی، اس کے اندر سے گندا سا مادہ خارج ہوا۔ بچہ پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا، جیسے پر سکون ہو گیا ہو۔

''اب یہ بالکل ٹھیک ہے...... زہر اس کے جسم سے نکل چکا ہے...... بچہ ٹھیک ہو جائے تو اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کرنا...... وہ بہت کرم کرنے والا ہے...... سب اسی کا کرم ہے...... کہ بچہ ٹھیک ہو گیا۔'' صوفی صاحب نے کہا اور بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

اسجد نے ایسا منظر اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ بچے کا زندہ بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا، وہ صرف سائنس پر یقین رکھتا تھا اور چیزوں کے کیمیائی ردعمل کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ زہر بچے کے ناخنوں تک پھیل چکا تھا۔ موت اور زندگی میں صرف چند قدم کا فاصلہ تھا...... اور اس مرحلے پر بچے کا زندہ بچ جانا کیسے ممکن ہے......؟ یہ یقیناً صوفی صاحب کی دعا کے سبب ہوا......

کیا دعاؤں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان کو موت کے چنگل سے بچا کر لے آئے...... یا...... پھر...... صرف صوفی صاحب کی دعا میں اتنا اثر ہے...... وہ جوں جوں غور و فکر کر رہا تھا، چونک رہا تھا اس کے اندر عجیب سی کشمکش پیدا ہونے لگی تھی...... بہت مبہم اور پراسرار مگر پر کیف سی

کیفیت...... جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا...... بس محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے...... اس کے اندر اضطراب پیدا کردیا تھا...... صوفی صاحب جا چکے تھے اور وہ وہیں کھڑا بچے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ماں نے بچے کو ہلایا اور اس نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ ماں نے خوش ہوکر اسے سینے سے لگایا اور پیار کرنے لگی۔ محبت بھرا یہ منظر دیکھ کر اسجد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کی آنکھوں میں بھلا آنسو کیوں آنے لگے تھے...... اس نے خود ہی سوچا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کر کے وہاں سے چلا گیا۔ وہ کھیتوں میں واپس آ کر صوفی صاحب کو تلاش کرنے لگا مگر وہ اسے وہاں نہ ملے۔ اس نے ایک دو لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ صوفی صاحب شاہ بابا کے مزار پر گئے ہیں۔

اس وقت......؟ ابھی سہ پہر بھی نہیں ہوئی تھی اور صوفی صاحب تو رات کو شاہ بابا کے مزار پر جاتے تھے، دو راتیں مزار پر گزارنے سے انہیں ان کے معمول کا پتہ چل گیا تھا۔

''کبھی...... کبھی وہ جلدی چلے جاتے ہیں۔'' ایک شخص نے بتایا۔

''صوفی صاحب...... شاہ بابا کے مزار پر کب سے ہیں؟'' اسجد نے اس شخص سے پوچھا۔

''پندرہ...... سولہ سال...... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہے...... معلوم نہیں ہے...... جب یہاں آئے تو جوان تھے اب تو اپنی عمر سے بھی زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کیا ان کی زندگی کا یہی معمول ہے...... کھیتوں میں کام کرنا اور شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینا۔'' اسجد نے پوچھا۔

''ہاں...... بہرام خان نے تو ان کو کئی بار کہا ہے کہ وہ بس مزارعوں کی نگرانی کریں...... کھیتوں میں کام نہ کریں...... وہ ان کو روپیہ، پیسہ سب کچھ دیں گے...... مگر صوفی صاحب اپنی محنت سے زیادہ ایک روپیہ لینا بھی حرام سمجھتے ہیں...... ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے اندر ذرا سا بھی لالچ اور ہوس نہیں ہوا۔ انہوں نے تو کبھی مزار پر تقسیم ہونے والے لنگر سے کھانا نہیں کھایا۔ اپنے حجرے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے روٹی پکا کر کھاتے ہیں...... صوفی صاحب...... سونا آدمی ہیں...... سونا بالکل خالص۔'' اس شخص نے بتایا۔

''اور ان کے بیوی بچے...... گھر بار......؟'' اسجد نے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... یہاں تو اکیلے ہی آئے تھے...... اور اب تک اکیلے ہی ہیں...... بہت نیک اور شریف انسان ہیں۔ کسی کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا......'' وہ شخص بولا۔

''کیا...... صوفی صاحب اللہ والے ہیں؟'' اسجد نے تصدیق کرنا چاہی۔

''تم اللہ والے، کسے کہتے ہو؟'' اس شخص نے پوچھا تو اسجد بوکھلا گیا۔

''میں...... وہ......؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دے اسے تو خود معلوم نہیں تھا کہ ''اللہ'' کیا ہے؟ اور ''اللہ والے'' کیا ہوتے ہیں۔ اسے تو بس لفظوں سے آشنائی تھی...... ان کی حقیقت تو وہ بالکل بھی نہیں جانتا تھا...... اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری...... اور خاموش ہو

گیا۔ ''جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جائے..... وہی اللہ والے ہوتے ہیں..... صوفی صاحب واقعی اللہ والے ہیں..... دیکھو..... نا..... جس شخص کو نہ کوئی تمنا ہو، نہ لالچ ہو..... نہ دنیا سے کوئی طلب ہو..... اور نہ ہی کوئی تعلق..... تو وہ اللہ والے ہی ہوتے ہیں..... اور جانتے ہو..... ایسے لوگوں کی طرف دل خود بخود کھنچے چلے جاتے ہیں..... ضرور ان میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے..... جو ہم..... تم جیسے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اچھا..... اب میں چلتا ہوں..... مجھے صوفی صاحب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' اسجد نے کہا اور اس شخص کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑا۔

وہ سارا راستہ صوفی صاحب کے بارے میں سوچتا رہا..... اس کا دل ان سے ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس شخص نے ساری باتیں ٹھیک کہیں تھیں..... وہ نہ بھی بتاتا تو اس کا دل انہیں بہت کچھ مان چکا تھا۔ شام ہونے کو تھی جب وہ مزار پر پہنچا..... اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس کے جاتے ہی لنگر تقسیم ہونا شروع ہو گیا، مگر اس نے ایک نوالہ کھانا بھی گوارا نہ کیا..... اس نے ایک ٹک دیکھا اگلے ہی لمحے اس کے پیٹ کی بھوک بڑھنے لگی.....

''صوفی صاحب نے آج تک لنگر نہیں کھایا..... حجرے میں اپنے ہاتھ سے خود روٹی پکا کر کھاتے ہیں.....''

وہ خاموشی سے مزار کے اندر چلا گیا، وہاں بہت زیادہ لوگ جمع تھے۔ کچھ تلاوت میں مصروف تھے، کچھ ہاتھ بلند کر کے دعا کر رہے تھے اور کچھ قبر پر پھول ڈال رہے تھے، وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھ گیا، صوفی صاحب نے آج جو کچھ بھی اس سے کہا تھا، وہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے..... اور ان الفاظ کی صداقت کے پیمانے میں اپنی ذات کو جانچ رہا تھا..... ہر بار اس کے پلڑے میں ندامت اور شرمندگی آتی۔

''انسان اپنا محاسبہ کرنے کو خود ہی کافی ہے۔'' اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل بری طرح رو رہا ہو..... مولوی صاحب نے اسے جو کچھ کتاب اللہ سے سنایا تھا اور صوفی صاحب نے جو کچھ کہا تھا..... وہ ایک ایک لفظ کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھ رہا تھا اور اس کا اپنا عکس دھندلا اور بدنما ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کافی دیر اپنے آپ سے الجھتا رہا..... اپنی کسی بات اور عمل کی حمایت میں کوئی دلیل دینے کی کوشش بھی کرتا تو بری طرح ناکام ہوتا..... آج اس کا 'ضمیر' اسے بری طرح پچھاڑ رہا تھا..... آج نجانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس کی کوئی دلیل نہیں مان رہا تھا یا پھر اس نے پہلے کبھی اپنے ضمیر کو اتنا بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

رفتہ رفتہ مزار خالی ہونے لگا..... لوگ جانا شروع ہو گئے..... رات گہری ہونے لگی..... وہ ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا تا کہ وہاں سے آسانی سے دکھائی نہ دے سکے۔ ایک شخص اندر آیا..... ادھر اُدھر دیکھا..... مزار کے اندر کوئی نہیں..... اپنی تسلی کر کے چلا گیا..... تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب اندر تشریف لائے، سفید شلوار قمیض میں..... سفید ٹوپی سر پر پہنے انتہائی صاف ستھری اور نکھری شخصیت لئے ہوئے سلام پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے..... باہر سے کسی نے دروازے کو کنڈی لگا دی..... صوفی صاحب نے مزار کی تمام روشنیوں کو بند کر دیا..... صرف ایک کونے میں دیوار پر لگے زیرو کے بلب کو روشن رکھا۔ قبر کے سرہانے کی جانب کافی فاصلے پر ایک محراب نما جگہ بنی تھی، صوفی صاحب نے وہاں جانماز بچھائی اور جیسے ہی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اسجد نے آہستہ آواز میں ان کو پکارا ''صوفی صاحب.....''

انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اسجد ان کے پاس کھڑا تھا۔

''تم.....؟'' وہ انتہائی حیرت سے بولے۔

''ہاں......میں......''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''آپ کا انتظار......''

''جاؤ......یہاں سے......میرا اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

''آج میں نہیں جاؤں گا۔''

''فضول باتیں مت کرو......'' صوفی صاحب نے لائیں آن کیں اور دروازے کی جانب بڑھے تا کہ دروازہ کھٹکھٹا کر اسے باہر نکالیں۔

''صوفی صاحب......اگر اللہ اور اللہ والے......گنہگاروں کو دھتکار کر خوش ہوتے ہیں......تو......مجھے ضرور باہر دھکا دے دیں۔'' اسجد نے آنسوؤں سے لبریز آواز کے ساتھ کہا تو صافی صاحب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا......اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر بے بسی دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

''تم......آخر چاہتے......کیا ہو......؟''

''اپنے اندر کا اضطراب دور کرنا چاہتا ہوں......سکون چاہتا ہوں۔''

صوفی صاحب اس کی بات سن کر خاموش ہو گئے اور جانماز پر جا کر بیٹھ گئے......اسجد بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔صوفی صاحب نے ایک لمحے کو اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے سر کو جھکا دیا۔

''سرکار......یہ شخص ہدایت کا طلب گار ہے......اپنے اندر کا اضطراب دور کرنے مجھ گنہگار کے پاس آیا ہے......میں ذرۂ خاک کہاں اس قابل کہ......اس کا اضطراب دور کر سکوں......میری زبان اور میرے الفاظ سب آپ کی عطا ہیں......میری مدد فرمایئے کہ میں اس کی مدد کر سکوں۔'' صوفی صاحب کے دل نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں دعا کی۔

تمام نوری مخلوق چونک گئی اور دم بخود رہ گئی۔صوفی صاحب کے دل کی آواز بغیر کسی وسیلے اور ذریعے کے سیدھی بڑی سرکار سے مخاطب تھی۔پہلے بھی لوگ گڑگڑاتے تھے،شکوے،شکایتیں اور واویلا کرتے تھے مگر ان کی آوازیں اس طرح بڑی سرکار سے مخاطب نہیں ہوتی تھیں......جس طرح صوفی صاحب کی آواز تھی......یوں جیسے کوئی دوست دوسرے دوست سے سرگوشی کے انداز میں کسی بات کی اجازت طلب کر رہا ہو۔

وہ سب ٹھٹھکے......انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ بڑی سرکار نے انسان کے شاہکار ہونے کے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا......شاید اس دعوے کی سچائی کا وقت قریب آ گیا تھا۔

جو بڑی سرکار نے انسان کی رسائی کے بارے میں فرمایا تھا۔

''وہ فرش پر ہو گا......مگر عرش پر مجھ سے مخاطب ہو گا......باتیں اپنے ہم جنسوں سے کرے گا مگر مشورہ مجھ سے طلب کرے گا وہ اس سے سوال کریں گے......وہ جواب مجھ سے طلب کرے گا۔'' اتنے قرب اور ایسی رسائی کے بارے میں وہ مشکوک ہو گئے تھے۔

مٹی کے انسان کی اتنی رسائی......اور وہ بھی بڑی سرکار تک......انہیں بہت ناممکن لگی......اور اب تک انہوں نے انسانوں کا جتنا مشاہدہ کیا تھا تو ان میں سے اکثریت لاعلم اور جاہل تھی......جنہیں نہ تو بڑی سرکار کی عظیم الشان ہستی کا کوئی شعور تھا اور نہ ہی کوئی خبر......اور وہ مطمئن تھے کہ خاکی انسان کی اتنی پرواز ہو ہی نہیں سکتی اور اب وہ انسان کی بلند پروازی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے......اور اس قدر دم بخود تھے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے......؟

انہوں نے حیرت سے سفید روشنی کی جانب دیکھا اس سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

صوفی صاحب......آنکھیں بند کئے بہت عجز و انکساری اور انتہائی مؤدبانہ انداز میں رقت بھری آواز میں گڑگڑا رہے تھے۔

''سرکار......میری مدد فرمایئے......اپنی نظر کرم کیجئے......ہم خطاوار......گنہگار......سیاہ کار انسان آپ کی رحمت کے طلب گار ہیں......''

صوفی صاحب کی بند آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی اور آنکھوں کی نمی ان کے دل کی آواز کو گلوگیر اور رقت آمیز کرنے لگی۔

نوری مخلوق نے محسوس کیا جیسے بڑی سرکار صوفی صاحب کی اس رقت بھری......گڑگڑاتی آواز سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ سفید روشنی سے ایسی خوشگوار نرم و لطیف چمک سی خارج ہونے لگی......جو اس سے پہلے کبھی نوری مخلوق نے نہیں دیکھی تھی۔ اس سے خوشگوار اور پرکیف و مسحور کن احساس پیدا ہونے لگا وہ حیران ہو رہے تھے۔ ایسی روشنی کا مشاہدہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا......اور وہ ایک دم چونکنے لگے......ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، وہی لطیف اور پرکیف روشنی......صوفی صاحب کے سینے کو منور کرنے لگی۔ سفید روشنی سے خارج ہونے والی مسحور کن روشنی کی کرنیں صوفی صاحب کے دل کو اپنے حصار میں لینے لگیں اور اس سے ان کا سینہ یوں جگمگانے لگا جیسے کسی نے نور کے فوارے ان کے سینے میں نصب کر دیئے ہوں اور ان فواروں سے مختلف قسم کی روشنیاں پھوٹنے لگیں......

نوری مخلوق گھبرا گئی......دم بخود رہ گئی......ایسا قرب......ایسی رسائی......انہیں یقین نہیں آ رہا تھا......

انسان پر اللہ کے لطف و کرم اور رحمتوں کی اتنی نوازش دیکھ کر وہ چونکنے لگے......کپکپانے لگے......انسان ان سے آگے بڑھ رہا تھا......قدم بہ قدم......لمحہ بہ لمحہ......ان کے اندر اضطراب پیدا ہونے لگا۔

''نجانے......اس قرب کی انتہا کیا ہونے والی ہے......؟ یہ سوچ کر وہ مزید مضطرب ہو گئے۔

صوفی صاحب نے ایک دم اپنی آنکھیں کھولیں......ان کی آنکھیں بے انتہا سرخ ہو رہی تھیں، جیسے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو رہی ہوں اور ان سے ایسی چمک خارج ہو رہی تھی......جس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی......امجد میں ہمت نہ تھی......اس نے نظریں جھکا لیں۔

''پوچھو......کیا جاننا چاہتے ہو؟'' صوفی صاحب نے آدھ بھرکرم آواز میں کہا۔

''اللہ کیا ہے......؟''

''جو نظر نہ آئے مگر کائنات کی ہر شے اور ذرّے ذرّے میں دکھائی دے۔''

''انسان کیا ہے......؟''

''جو نظر وہ آئے...... جو اندر سے 'نہ' ہو...... مگر حقیقت میں کچھ ''اور''......

''اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟''

''آزمائش کے لئے...... کہ کون اس کے راستے پر چلتا ہے...... کون اس کی رضا پر راضی رہتا ہے...... کون اس کی شکر گزاری کرتا ہے اور کون اس کی نافرمانی کرتا ہے۔''

''وہ...... انسان جس کو اس نے خود جھگڑالو، کمزور، جلد باز...... احسان فراموش اور ناشکرا کہا ہے کیسے اس میں شکر گزاری اور فرمانبرداری پیدا ہو سکتی ہے؟'' امجد نے پوچھا۔

''اس نے کچھ انسانوں کو چوپایوں سے بدتر بھی کہا ہے اور بہت سے انسانوں پر خود سلام بھی بھیجا ہے۔''

''وہ نیکوکاروں اور گمراہوں کو خود ہی پیدا کرتا ہے...... اچھا یا برا ہونا انسان کے اپنے بس میں تو نہیں؟'' امجد نے پھر پوچھا۔

''فطرتِ سلیمہ ہر انسان کے اندر موجود ہے اور ہدایت کے مواقع بھی سب کو ملتے ہیں...... اس لیے بہت کچھ انسان کے بس میں ہے ویسے بھی نیکوکار، بدکاروں سے زیادہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔''

''کیسی آزمائش......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''جن کو نعمتیں ملتی ہیں...... وہ اس آزمائش میں ہوتے ہیں کہ وہ ان کو کیسے...... کس طرح اور کہاں استعمال کرتے ہیں...... دولت، عزت، شہرت، اقتدار اور صحت کو کہاں اور کس کے لئے خرچ کیا اور گنہگاروں کے لئے نعمتیں یوں آزمائش بنتی ہیں کہ انہوں نے ان کو کس طرح برباد کیا۔ جواب دیا گیا۔

''کچھ لوگ ساری زندگی مصائب، تکالیف، غربت، بیماریوں اور اذیتوں میں گزارتے ہیں...... جبکہ کچھ لوگ ساری زندگی خوشحال رہتے ہیں...... خوش اور پرسکون رہتے ہیں...... ناخوش اور غریب انسان کا کیا قصور ہے کہ وہ ایسی زندگی گزارتا ہے اور خوشحال نے کیا اچھے کام کیے ہیں کہ قدرت ہمیشہ ان پر مہربان رہتی ہے؟'' امجد نے پھر سوال کیا۔

''مصیبت زدہ...... غریب اور خوشحال دونوں ہی قدرت کی جانب سے آزمائش میں ہے۔ پریشان تو اللہ کی طرف سے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے اور دوسرے اس کے اردگرد خوشحال لوگوں کی یہ آزمائش یہ ہے کہ وہ اس پریشان اور دکھی انسان کی تکالیف کس طرح کم کرتے ہیں...... اگر وہ ان کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتے تو وہ زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔''

''انسان اتنا مضطرب کیوں رہتا ہے؟''

''اپنے آپ سے دوری کی وجہ سے...... اپنی خوشیوں اور سکون کا سامان دنیا سے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے...... مگر خوشی اور سکون تو اسے اپنے اندر ملتا ہے مگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا اور مضطرب رہتا ہے۔''

''انسان کیسے اللہ کا شکر گزار رہے؟''

"انسان کا جسم...... اس کا ایک عضو...... اس کے جسم کی حرکات...... اس کی سانسیں...... ہر شے اللہ کے حکم کی تابع ہے...... اگر اللہ آنکھ، کان، ناک، دل، دماغ سے اس کی صلاحیت چھین لے...... تو کون اس کو وہ سب عطا کرنے والا ہے...... انسان جب ان نعمتوں کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس کے اندر تشکر کے احساسات پیدا ہوتے ہیں...... جو اسے رفتہ رفتہ اللہ کے قریب لے آتے ہیں اور اسی سے وہ اس کا 'شکر گزار' بن جاتا ہے۔

"انسان کو ناشکرا کیوں کہا گیا ہے؟"

"دنیا کے سب انسانوں کو سب نعمتیں نہیں ملتیں...... ہر ایک کے اندر یا باہر اللہ کوئی نہ کوئی کمی ضرور رکھتا ہے...... تا کہ انسان...... اپنے آپ کو سب سے افضل اور برتر نہ سمجھے...... اسے اپنی کم مائیگی کا احساس رہے...... مگر انسان اس کمی کو ہی اپنی زندگی کا حاصل اور سب کچھ سمجھ کر واویلا کرتا رہتا ہے اور دوسری بے شمار نعمتوں کو بھول جاتا ہے...... اس شے کے نہ ہونے پر اللہ سے شکوے شکایتیں کرتا ہے، جھگڑے اور بحثیں کرتا ہے اور 'ناشکرا' کہلاتا ہے۔

"انسان کو تکلیف میں پیدا کیا گیا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بے قراری اسے پریشان رکھتی ہے یا پھر باہر کے مسائل...... انسان نے کیا گناہ کیا ہے...... کہ اسے کبھی سکون نہیں ملتا......؟"

"انسان کی سرشت میں بے قراری اور اضطراب رکھا گیا ہے یہ 'اضطراب' انسان کے لیے ایک نعمت ہے...... یہی اضطراب اسے اللہ تک لے جاتا ہے...... پرسکون اور پر مطمئن انسان کبھی نہ...... تو اللہ کی طرف دیکھے...... اور نہ ہی اس کی جستجو کرے۔ مگر وہ اس اضطراب کی وجہ نہیں سمجھتا اور بے سکون رہتا ہے۔

"اللہ نے یہ دنیا انسان کے لئے ہے بنائی اور پھر انسان کو کہتا ہے کہ اس میں دل نہ لگاؤ...... اگر انسان دنیا کی جانب نہیں دیکھتا تو کیا دنیا کو بنانے کا مقصد ختم نہیں ہو جائے گا؟"

"اللہ نے دنیا انسان کے لئے بنائی ہے اور انسان اپنے لئے بنایا ہے...... بگاڑ تب پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی راہیں بدلتا ہے......"

"بعض اوقات...... کچھ انسان ساری زندگی انتہائی محنت اور جدوجہد کرتے ہیں مگر انہیں صلہ کچھ نہیں ملتا...... یا پھر بہت کم ملتا ہے...... کیا یہ نہیں فرمایا گیا کہ انسان کو وہی ملتا ہے...... جتنی وہ جدوجہد کرتا ہے...... پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"یہ بھی آزمائش ہوتی ہے کہ کون اس کی رضا پر صابر و شاکر رہتا ہے مگر انسان واویلا کرنے لگتا ہے اور اللہ کے وعدے کو بھول جاتا ہے کہ وہ نہ تو کسی کے ایمان کو ضائع کرے گا اور نہ کسی کے رتی بھر عمل کو...... وہ انسان کو ہر شے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ انسان فوری نتیجہ چاہتا ہے مگر اللہ دانا اور حکیم ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ انسان کو کب اور کیا ملنا مناسب ہے۔"

"انسان کسی ایک بات پر مطمئن کیوں نہیں ہوتا...... اگر وہ اپنے آپ کو اللہ کی رضا پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو اگلے ہی لمحے اس میں دنیا کی طلب بڑھنے لگتی ہے...... اور انسان خود ہی پریشان ہو جاتا ہے۔"

"مٹی کی فطرت ہی یہی ہے۔ کبھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑنے لگتی ہے تو کبھی بارش کے پانی کے سنگ مائع بن کر بہنے لگتی ہے اور کبھی دھوپ کی حدت سے کڑکڑانے لگتی ہے، مگر جتنا اسے کھودتے جاؤ...... اندر سے وہ...... وہ کچھ ملتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اسی طرح جب

انسان بھی اپنے اندر کا راز پالیتا ہے تو اسے قرار آنے لگتا ہے۔''

''کیسا راز......؟''

''مٹی کا راز......اور......اس میں چھپے خزانوں اور اس دُرِ نایاب کا راز''

''وہ کیا ہے......؟''

''اللہ کا عرفان......''

''وہ کیسے ملتا ہے......؟''

''اپنے آپ کو کھوجنے سے......''

''کیسی کھوج......؟''

''یہ کہ انسان کے پاس اپنا کیا ہے......اور اللہ کا دیا ہوا کیا کچھ ہے......اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس تو اپنا کچھ بھی نہیں سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے......تو اسے اس کی ہستی کا 'عرفان' حاصل ہونے لگتا ہے......''

''اس کا انسان پر منفی اثر بھی تو ہو سکتا ہے......اور وہ اپنے آپ کو بے بس......مجبور اور بدقسمت سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قدرت کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی کی مانند ہے......جو سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لے سکتا......جس کی کوشش تب کامیاب ہوگی......جب وہ چاہے گا......اس کو وہی ملے گا......جو اللہ نے اس کی قسمت میں لکھا ہوگا......وہ ہزار جدوجہد کرے......منصوبے بنائے......کوششیں کرے......اسے کچھ نہیں ملے گا......سوائے خدا کی مرضی کے......؟''

''سوچ کا یہی فرق اسے عرفان کی بلندیوں تک بھی لے جا سکتا ہے اور ذلت کی پستیوں تک بھی......اگر انسان مثبت انداز میں سوچتا ہے کہ اس کی نیت، سوچ، ارادے اور عمل پر قدرت حاوی ہے......انسان کی مجال کچھ نہیں تو وہ اس کی رضا پر مطمئن ہونے لگتا ہے اور اس کے اندر شکر گزاری اور قناعت پسندی پیدا ہونے لگتی ہے......وہ 'شاکرین' اور 'صالحین' میں شامل ہونے لگتا ہے اور جب وہ منفی طور پر سوچنا شروع کرتا ہے اور اپنے آپ کو بے بس اور مجبور خیال کرتا ہے تو اس کے اندر منفی جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور سمجھ کر واویلا کرنے لگتا ہے......شکوے کرنے لگتا ہے اور ناشکروں اور گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے......بات صرف سوچ کے زاویے ٹھیک رکھنے کی ہے۔''

''انسان کو نیکی اور بدی کی توفیق بھی تو وہی دیتا ہے......اور خود کہتا ہے ''کہ انسان کچھ سوچ بھی نہیں سکتا مگر جو میں چاہوں۔'' انسان کیسے اور کس بات پر عمل کرے......جبکہ سوچ ہی اس کے اختیار میں نہیں......؟''

''انسان کی سوچ پر اس کی فطرت غالب آتی ہے اور ہر وہ انسان جو فطرت سلیمہ یعنی خدا کی فطرت پر قائم رہے گا......اس کی سوچ اس کی فطرت کے مطابق رہے گی......سوچ کی ڈوریں انسان کی فطرت کے ہاتھ میں ہوتی ہیں......اگر فطرت اچھی ہے تو انسان میں ہزار منفی سوچیں جنم لے لیں مگر وہ اپنی فطرت کے مطابق ہی عمل کرے گا......دوسری بات سوچ کا تعلق انسان کے دماغ سے ہے جو کچھ بھی نہیں مگر ایک سیال مادہ ہے،

دماغ سے سوچ کو منسوب کرنا اس کی شان ہے...... انسان کے تمام اعضاء یعنی دل، دماغ، آنکھوں اور پیٹ میں موجود اعضاء کی باطنی خصوصیات کا تعلق اللہ سے ہے۔ گوشت پوست، خون اور ہڈیوں سے بنا انسان کچھ بھی نہیں...... اصل انسان تو اس کے اندر ہے...... اس کا باطن...... اور باطن کا تعلق روح سے ہے اور روح کا اللہ سے...... انسان ظاہری اور باطنی طور پر اللہ سے منسلک ہے...... انسان اپنے باطن میں موجود ذرا سی اچھائی بھی محسوس کرے گا...... تو اللہ سے اس راستے کی توفیق ضرور دے گا......"

"اور جن کے دلوں...... آنکھوں اور کانوں پر وہ مہر لگا دیتا ہے...... جو شر پھیلاتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے......؟"

"پوری دنیا میں مٹی، کہیں ایک سی نہیں ہوتی، کہیں بنجر...... تو...... کہیں زرخیز...... یہ قدرت کی شان ہے۔ بنجر میں ہزار بیج بوؤ...... پانی دو...... کھاد ڈالو...... مگر وہ کبھی بھی پھل پھول نہیں اُگائے گی...... اور زرخیز کو تو ایک پھوار ہی کافی ہوتی ہے۔ نیک فطرت لوگ نیک ماحول کا اثر جلد قبول کر لیتے ہیں اور بدفطرت لوگ نیکی کے سائے میں رہ کر بھی اس کا اثر قبول نہیں کرتے ایسے لوگ نیکوکاروں کے لئے آزمائش بنتے ہیں...... وہ اپنی بداعمالیوں سے ان کی راہوں میں کانٹے بچھاتے ہیں...... اگر دنیا کے سارے انسان ہی نیک ہوتے تو ان کی آزمائش کیسے ہوتی...... ایسے لوگ اپنے لئے اور نیک لوگوں کے لئے آزمائش بن کر آتے ہیں۔ رہی بات ان کے قصور کی...... تو اللہ کسی بھی انسان پر ظلم نہیں کرتا اور نہ ہی کرے گا...... کبھی کبھی کسی ظالم انسان کا معمولی سا عمل اسے نیکوکاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی نیکوکاروں کی معمولی سی خطائیں انہیں گنہگار اور مجرم بنا دیتی ہیں...... ہر بات میں اس کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے...... اور انسان اس کی مصلحتوں کو کبھی نہیں سمجھ پاتا......"

"تو پھر اللہ انسان سے کیا چاہتا ہے......؟"

"مکمل فرمانبرداری......"

"کیسی فرمانبرداری......؟"

"وہ جو بھی کہے...... اس کو دل سے مان لے...... جہاں سے منع کرے...... اس راستے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ جب اس کی مصلحتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں تو انسان خود بخود فرمانبرداری میں سرشاری محسوس کرنے لگتا ہے۔"

"کیا یہ آسان ہے......؟"

"یہی تو انسان کا امتحان ہے۔"

"اور انسان اللہ سے کیا چاہتا ہے؟"

"قدردانی...... جب وہ انسان کی ذرا سی جدوجہد کو سراہتا ہے...... اور اس کے ایمان و عمل کی تعریف کرتا ہے تو وہ اس کی خاطر ہر خطرے میں کودنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان محبت کا تعلق مضبوط ہونے لگتا ہے۔"

"اللہ کو انسان کا کونسا عمل برا لگتا ہے؟"

"ناشکری...... بے قدری اور احسان فراموشی کا۔"

''کیا انسان کو بھی وہی بات خوش کرتی ہے جو اللہ کو......؟''

''انسان اللہ کی ذات کا پرتو ہے......اس نے اپنی ذات کی خوبیاں انسان کو عطا کی ہیں۔ ان خوبیوں سے اللہ کی ذات کا اظہار ہوتا ہے......جب انسان رحمٰن......رحیم......کریم......غفور......غفار......اور ستار جیسی خوبیوں کا مظہر بنتا ہے تو دنیا انسانِ کامل ﷺ جیسی ہستی کی برکات سے لطف اندوز ہوتی ہے اور جب انسان قہار و جبار جیسی صفات کو اپنے اوپر حاوی کر لیتا ہے تو انسان فرعونیت اور نمرودیت کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔''

''کیا انسان کے اندر اتنا سب کچھ ہے......؟''

''ہاں......مٹی اپنے سینے پر سنگلاخ چٹانوں کے بلند و بالا پہاڑوں...... برف پوش چوٹیوں......وسیع و عریض سمندروں، سبز و شاداب میدانوں اور بے آب و گیا، ویرانوں اور خوفناک تاریک جنگلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور یہ سب کچھ انسان کے اندر بھی ہے...... پہاڑوں جیسی ہمت......برف پوش چوٹیوں جیسی اونچائی اور سرد مہری......سمندروں جیسی روانی اور گہرائی......شاداب میدانوں جیسی زرخیزی و یران میدانوں کا سا بنجر پن......اداسی......ویرانی اور جنگلوں کی سی تاریکی سب اس کے اندر موجود ہے۔''

اتنی صلاحیتوں کا مالک انسان......لمحوں میں مایوس اور ناامید کیوں ہو جاتا ہے؟''

''انسان صلصال (کھنکتے گارے) اور طین لازب (چپکتی ہوئی مٹی) سے بنا ہے۔ کھنکتا ہوا گارا ذرا سی حرکت پر بجنے لگتا ہے۔ انسان بھی ایک لمحے میں خوش ہو جاتا ہے اور طین لازب (چپکتی ہوئی مٹی) سے بنا انسان فوراً پُرنم ہو جاتا ہے۔ یہ مٹی کی سرشت ہے۔ ہوا سے اڑنے لگتی ہے اور ذرا سی پھوار سے پرنم ہو جاتی ہے......انسان بھی ذرا سی بات سے خوش ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات پر دکھی اور پرنم......آنسو بہانے لگتا ہے......کھنکتا گارا......بات کی حقیقت اور مصلحت جانے بغیر واویلا کرنے لگتا ہے......''اللہ نے انسان کو ہی اپنا نائب کیوں بنایا؟ کسی نوری یا ناری کو کیوں نہیں؟''

''اللہ بہت وسعت والا ہے......اور مٹی میں جو وسعت ہے وہ نور یا نار میں نہیں......نور میں بہت نورانیت اور تابانی ہوتی ہے مگر ویسی وسعت نہیں جیسی مٹی میں ہوتی ہے۔ نار بھی (آگ) لمحوں میں بھڑک کر جلا کر راکھ کر دیتی ہے، جبکہ مٹی کو جتنا کھودتے جاؤ......تہہ در تہہ اس کے اندر سے خزانے ملتے جائیں گے......نور اور نار میں مٹی اور اس کی صلاحیتوں کا جذب ہونا ناممکن تھا، جبکہ مٹی اپنے اندر نور اور نار کی صلاحیتیں سمو سکتی ہے......مٹی ظاہراً عام مگر بہت پراسرار ہوتی ہے۔ اپنے اندر عجائبات کے خزانے پوشیدہ رکھتی ہے مگر کچھ ظاہر نہیں کرتی......انسان بھی اپنے اندر وہ کچھ رکھتا ہے جس کو اسے خود ساری زندگی خبر نہیں ہو پاتی۔''

''کیوں......؟''

''وہ باہر دیکھتا ہے اور اپنے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ ایسا کیوں نہیں کرتا......؟''

''اپنے اندر جھانکنے کے لئے دیدۂ بینا چاہئے......ایسی آنکھ جس میں جستجو، شوق، لگن اور محبت ہو......مگر انسان فطرتاً جلد باز ہے......وہ ہر بات کا فوری نتیجہ چاہتا ہے......مگر اللہ کی مصلحتیں انسان سے صبر اور ثابت قدمی کا تقاضا کرتی ہیں......انسان فوری نتیجہ نہ پا کر گھبرا جاتا ہے۔ واویلا

کرنے لگتا ہے اور سرکشی پر اتر آتا ہے اور اسی جلد بازی میں اپنے کام خود ہی بگاڑ لیتا ہے...... اسی لئے اللہ نے انسان کی قسمت خود لکھی ہے اگر اس کا بھی اختیار انسان کو دے دیا جاتا تو وہ نہ تو کبھی خدا کی طرف رجوع کرتا اور نہ ہی کسی اور کو اپنے سے آگے بڑھنے دیتا...... روئے زمین پر صرف تباہی و بربادی اور غارت گری نظر آتی...... کیونکہ انسان کو اپنی ذات، اپنا وجود، اپنا نفس، اپنی خوشیاں اور اپنے غم بہت عزیز ہیں...... وہ کسی شے کو کھونا نہیں چاہتا، اسے دوسروں کی تکلیف اور رنج کا اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب وہ اپنی کسی عزیز شے کو کھو کر ان مراحل میں سے گزرتا ہے...... اس لئے قدرت نے یہ فیصلہ اور اختیار اپنے پاس رکھا ہے کہ کسی کو کیا ملنا ہے...... اور کس کو کس شے سے محروم رکھنا ہے...... جبکہ حقیقت میں دونوں ہی آزمائش میں سے گزر رہے ہوتے ہیں...... مگر انسان سمجھتے نہیں۔"

"انسان اتنا پیچیدہ کیوں ہے؟"

"اللہ کو ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی۔ سیدھا، سادھا بے وقوف انسان اللہ تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔"

"کیا مطلب......؟"

"یہ پوری کائنات اللہ کا کینوس ہے اور انسان اس کینوس پر اس کا شاہکار ہے۔"

"شاہکار......؟"

"ہاں......"

"سب انسان یا صرف چند......؟"

"انسان کا جسم...... اس کے اعضاء...... ان کی بناوٹ...... ان کے افعال...... اس کے اندر انسان کا نفس...... اس کا باطن...... اس کی روح...... اس کے اندر خیر و شر، خوبیاں و خامیاں اضطراب، بے قراری...... سکون...... اور پھر ان کے اندر پوشیدہ 'عرفان'...... جس میں یہ سب ہو وہی اس کا 'شاہکار' ہے۔"

"کس کا عرفان......؟"

"اللہ کا...... جس کے لئے اس نے اسے پیدا کیا ہے۔"

"انسان کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"اللہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ اس کی بے شمار صلاحیتوں، کرامات، معجزات کا اظہار انسان کے ذریعے ہوتا ہے...... اگر انسان نہ ہوتا تو اللہ کو کون جان پاتا۔"

"اللہ اور انسان کا تعلق کیا ہے؟"

"جو 'اللہ اور انسان' کے آغاز میں 'الف' کا ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

''الف سے مراد 'اسرار' اور 'امید' ہے۔''

''اللہ اسرار تھا اور انسان بھی اسرار ہے۔ 'اسرار' نے 'اسرار' کو تخلیق کیا ہے۔''

''کیسا اسرار......؟''

''اللہ کی حقیقت کوئی نہیں جان سکتا مگر انسان کے ذریعے اس اسرار سے واقفیت ہوتی ہے۔''

''کیسے......؟''

''انسان کا نفس بہت بڑا اسرار ہے، جب انسان اپنے نفس کے اسراروں سے آشنا ہو کر اپنے بہت اندر چلا جاتا ہے تو وہاں اسے اللہ کے اسراروں سے آشنائی ہوتی ہے۔''

''کیسی آشنائی......؟''

''اللہ کی ذات سے آشنائی...... انسان جب اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اور نفس کے تقاضوں کو جھٹلا کر اور اسے پاک کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو اسے اپنے سینے کے اندر 'اللہ' مل جاتا ہے اور جب وہ مل جاتا ہے تو انسان اس دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے...... اسے کسی شے کی نہ ہوس رہتی ہے نہ لالچ...... اس کا دل دنیا کی ہر شے سے بھر جاتا ہے اور کوئی خوشی اسے مطمئن اور خوش نہیں کر پاتی...... سوائے اس خوشی کے...... کہ وہ اس کے راستے پر...... اس تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ دنیا سمٹ کر ذرۂ خاک بن جاتی ہے، اس کی نظر افلاک پر نہیں اپنے دل کے نہاں خانوں میں، اس ہستی کو پانے کی جستجو میں لگی رہتی ہے...... دنیا کی ہر شے اس کے سامنے بے وقعت اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ اسی آشنائی تک پہنچ کر وہ 'اللہ' کے اسرار کو پاتا ہے۔ اسرار تک رسائی اسے...... اس دیئے تک لے جاتی ہے جو روشن تو عرش پر ہے مگر جس کی روشنی انسان کے سینے کو ہر دم منور کرتی رہتی ہے اور الف سے شروع ہونے والے اسرار کا یہ سفر امید پر ختم ہوتا ہے۔''

''کیسی امید؟''

''جب انسان بہت مایوس اور دکھی ہوتا ہے...... تو اگلے ہی لمحے وہ پرامید ہو جاتا ہے...... کیونکہ اللہ انسان کے اندر ہمیشہ ایک 'امید' کی صورت میں موجود رہتا ہے، جو انسان کو نہ کسی آزمائش میں تنہا چھوڑتا ہے نہ کسی دکھ میں...... نہ تنہائی میں...... نہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں...... نہ طوفانوں میں...... نہ ویرانوں میں...... نہ آگ کے الاؤ میں اور نہ سولی کے تختہ داروں پر...... انسان اٹھ اٹھ کر گرتا ہے...... پھر اٹھتا ہے...... مات کھاتا ہے...... پھر حوصلہ پاتا ہے...... پھر جدوجہد کرتا ہے...... اور ساری زندگی جدوجہد کا یہ سفر جاری رہتا ہے...... کیونکہ اس جدوجہد کے پیچھے اللہ ایک 'امید' کی صورت میں اندر ہی اندر انسان کو حوصلہ دیتا رہتا ہے۔''

''جب انسان تنہائی میں آنسو بہاتا ہے...... تو وہ اندر سے اسے حوصلہ دیتا ہے...... دیکھو...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... مجھ پر یقین رکھو...... اگر تم مجھ پر ایمان رکھو گے تو...... میں تمہیں کبھی ٹوٹنے...... اور جھکنے نہیں دوں گا...... اگر مجھ پر توکل اور بھروسہ رکھو گے...... تو ہر خطرے اور ہر آزمائش سے میں تمہیں بچاؤں گا...... اگر تم مجھ سے محبت کرو گے...... تو اپنی ایسی محبت سے نوازوں گا کہ دنیا کی ساری محبتوں کو بھول جاؤ گے...... اگر

اپنی چاہتوں کو میری چاہتوں کے سپرد کرو گے تو میں ایسی چاہتوں سے نوازوں گا کہ کسی شے کی تمنا نہیں رہے گی......" صوفی صاحب رکے اور ان کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے اور وہ ہچکیاں لینے لگے......سسکیاں بھرنے لگے......اسجد کی بھی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ نوری مخلوق پر ہیبت سی طاری ہونے لگی......بڑی سرکار تک ایسی رسائی......اور ایسے قرب......کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے......یہ بندۂ خاکی کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا......ایسی محبت......ایسا عشق......ایسا عرفان......اور اس پر یہ اشکباری......؟ وہ اپنے آپ کو بے بس پانے لگے......انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہ سکے جو انتہائی فاتحانہ انداز میں چمک رہی تھی۔ آپ پاک ہیں، ہمارا علم اور عقلیں محدود ہیں......ہم آپ تک ایسی رسائی کبھی بھی نہیں پا سکتے تھے......انسان واقعی ہی آپ کا شاہکار ہے۔" انہوں نے سر جھکا لئے۔

سفید روشنی چمکی......یوں جیسے مسکرا رہی ہو۔

صوفی صاحب کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہونے لگی مگر ان کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

"وہ ہم انسانوں سے بہت محبت کرتا ہے......مگر ہم نہ تو اس کی محبت کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اس سے ویسی محبت کر پاتے ہیں......جیسی وہ ہم سے کرتا ہے......کہتا ہے......میری طرف ایک قدم بڑھاؤ گے میں تمہاری طرف دوڑ کر آؤں گا۔ جب تم اپنے نفس کو میری خواہشات رضا کے تابع کرو گے......تو میں تم پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دوں گا......تم کو وہ کچھ عطا کروں گا......جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکو گے......مگر ہم گنہگار اس سے ویسی محبت کر ہی نہیں پاتے......"

"کیوں......؟"

"ہم سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مانتے بھی ہیں......اور پھر عمل کرتے ہوئے رک جاتے ہیں۔ وجہ ہماری جہالت ہے۔"

"کیا......انسان کو اللہ کی محبت پر یقین نہیں ہوتا......؟"

"یقین تو ہوتا ہے......مگر اس کی محبت کی راہ بہت کٹھن ہے......انسان گھبرا جاتا ہے......اندر ہی اندر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے......سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے......پھر بکھر جاتا ہے......کھڑا ہوتا ہے، پھر گر جاتا ہے......اور اس قدر ٹوٹنے اور گرنے سے وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے......اس کی محبت کی راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں جو انسان کو لہولہان کر دیتے ہیں......اس کی محبت کا دم بھرنے والے بھی اس سے شکوے کرنے لگتے ہیں......شور مچانے لگتے ہیں......اسے پکارتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کیوں نہیں کر رہا، کھلے دعوے کرنے والے......وہیں سے پلٹ جاتے ہیں......مگر جو اس سے سچی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں، وہ اس سے شکوے نہیں کرتے......واویلا نہیں کرتے......اور اسے پکارتے بھی نہیں......اس سے مدد بھی طلب نہیں کرتے......اور نہ ہی کوئی سوال کرتے ہیں......"

"کیوں......؟"

"وہ کہتے ہیں......ہمارا سب کچھ تیرا ہے......ہم تیری رضا پر راضی......اور......شاکر ہیں......تو ہمیں......ہم سے بڑھ کر چاہنے والا ہے......اور اللہ اپنے ایسے بندوں سے بہت خوش ہوتا ہے اور ان پر سلام بھیجتا ہے:

"سَلَامٌ عَلٰی عِبَادَ اللّٰہ الصَّالِحِین"

(اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو)

"اوران کے مرنے کے بعدان کی روحوں کا یوں استقبال کرتا ہے۔"

"اے اطمینان پانے والی روح...... اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا...... تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی...... تو میرے ممتاز بندوں میں شامل ہو جا...... اور...... میری بہشت میں داخل ہو جا۔" (البلد 27-28)

اتنا بڑا مقام...... اتنا عظیم الشان رتبہ...... اتنی قدر و منزلت اتنی توقیر و عزت...... اتنا کرم...... اور اتنی سربلندی وہ اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے...... کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا......" صوفی صاحب پھر سسکیاں بھرنے لگے اور ان کی آنکھیں شدت سے آنسو بہانے لگیں۔

"کیا...... محبت...... عبادت اور اطاعت سے یہ مقام ملتا ہے؟"

"کیا یہ مقام ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتا ہے......؟"

"نہیں...... اس کے حضور شدتِ محبت اور خلوص کے ساتھ...... پُرامید ہو کر...... نیازمندانہ سجدہ کرنے سے اور یہی وہ چاہتا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق-19)

(اور اسے سجدہ کرو اور اس کے قریب ہو جاؤ)"

صوفی صاحب نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بلند آواز میں "اللہ اکبر" کہا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ اسجد بھی بے تاب ہو کر سجدے میں گر گیا۔ دونوں زاروقطار رو رہے تھے...... ان کے لب خاموش تھے مگر ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے جیسے کسی کے قرب اور وصال کی تمنا کے لئے بے تاب ہو رہے ہوں۔

"یا اللہ! ہمیں معاف فرما...... ہم سے تمام برائیوں کو دور کر دے اور ہمیں نیکوکاروں کے ساتھ اٹھانا۔"

وہ فریاد کر رہے تھے، رو رہے تھے گڑگڑا رہے تھے۔ اسجد کے آنسو اس کے دل کی ساری کثافتوں کو دھو رہے تھے۔ جیسے جیسے اس کے آنسوؤں میں شدت آ رہی تھی۔ اس کے دل سے بوجھ کم ہو رہا تھا۔ نجانے اس 'سجدے' میں کیا لطف تھا کہ اس سے سر اٹھانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

تمام نوری مخلوق حیران ہو رہی تھی...... انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ صوفی صاحب کے "اللہ اکبر" کی صدائیں پوری کائنات میں ہر جگہ گونج رہی ہوں...... اور ہر ہر شے نیازمندی سے خدا کے حضور سرنگوں ہو رہی ہو...... چاند...... ستارے...... زمین و آسمان پہاڑ و دریا...... درخت چرند و پرند...... جانور درندے...... جس تک یہ صدا پہنچ رہی تھی...... سب سر تسلیم خم کر رہے تھے۔

"انسان کا سجدہ کس قدر انمول اور قیمتی تھا...... شاید اس کا علم اسے خود بھی نہیں تھا...... تقرب کا یہ سجدہ...... آنسوؤں سے لبریز...... انسان کو رفعت اور قدر و منزلت عطا کر رہا تھا...... جس کا اسے خود بھی اتنا شعور نہیں تھا مگر کائنات کا ذرہ ذرہ اور تمام مخلوقات اس پر رشک کر رہی تھی۔"

نوری مخلوق بھی انسان کی اس صدا پر بے تاب ہو گئی...... انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھا...... جس سے ست رنگی شعاعیں پھوٹ

رہی تھیں......اور یوں چمک رہی تھی...... جیسے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی ہو۔"

وہ سب بھی بے تاب ہو کر بڑی سرکار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے......

ان کے اندر کا اضطراب بھی ختم ہو گیا تھا......

"انسان کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا...... جو اپنی نیازمندی اور اطاعت گزاری سے رازِ ہستی کے اسرار سے پوری کائنات کو آشنا کر رہا تھا اور تمام مخلوقات انسان کے ساتھ مل کر اپنے خالق کی تعریف و تسبیح کر رہی تھی۔"

"ساتوں آسمان، زمین اور جو لوگ ان میں ہیں، سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔" (بنی اسرائیل-44)

"ہم انسان کو آپ کا 'شاہکار' مانتے ہیں اور آپ کے حضور نیازمندی سے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔" تمام نوری مخلوق نے نیازمندی سے گڑگڑا کر کہا۔

سفید روشنی ایک دم تیزی سے چمکی...... یوں جیسے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی ہو...... اس روشنی سے نورانیت اور محبت کی ایسی شعاعیں نکل رہیں تھیں، جو کائنات کی تمام مخلوقات اور ذرے ذرے کو اپنے حصار میں لے رہی تھی اور سب اس محبت سے محظوظ اور پُر امید ہو رہے تھے۔ پوری کائنات اور تمام مخلوقات مل کر نیازمندی سے اس کی تسبیح کر رہی تھی۔ تمام مخلوق سلام بھیج رہی تھی اور خالق سلام قبول کر رہا تھا ہر طرف نور ہی نور پھیلنے لگا اور نور کی نورانیت 'ہر شے' اور 'قلب' کو منور کرنے لگی۔

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيم"

"اللہ پاک ہے اور اسی کی تعریف ہے اور اللہ بزرگ و برتر بہت ہی پاک ہے۔"

ختم شد